بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی نظریاتی کونسل

گلدستۂ مضامین

حضرت مولانا ابوعمار
زاہد الراشدی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان	:	اسلامی نظریاتی کونسل: گلدستۂ مضامین
تالیف	:	مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مرتبین	:	ہلال خان ناصر
	:	ناصر الدین خان عامر
مجموعہ	:	اگست ۲۰۲۴ء
ناشر	:	
اشاعت	:	

﴿فہرست﴾

عرضِ مرتب........8
پیش لفظ........9
مقدمہ........10
عدالتِ شرعیہ کا کنونشن........12
عائلی قوانین کا مسئلہ اور اسلامی نظریاتی کونسل........16
پرائیویٹ شریعت بِل ترامیم کے بعد........17
شریعت بِل جائز اجتہاد کی ضمانت دیتا ہے........19
وزیرِاعظم جناب محمد خاں جونیجو کے نام کھلا خط........26
شریعت بِل پر اتفاق رائے۔ وزیرِاعظم محمد خان جونیجو کے نام کھلا خط........28
اسلام کی تشریح اور پیپلز پارٹی۔ علماء کرام توجہ فرمائیں!........32
صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا نفاذِ شریعت آرڈیننس........34
اسلامی نظریاتی کونسل کی رجعتِ قہقری........36
شریعت بِل اور شریعت کورٹ۔ قومی اسمبلی کی نازک ترین ذمہ داری........38
شریعت بِل، پارلیمنٹ کی خود مختاری اور اجتہاد........41
ماہنامہ ”نوائے قانون“ (سود نمبر)........50
صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان کے نام کھلا خط........51
پارلیمنٹ کے لیے اجتہاد کی اہلیت کا معیار........54
پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے وفاقی وزارت مذہبی امور کی سفارشات........55
قرآن کریم سے شادی: ایک مذموم جاگیردانہ رسم........60

اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کا مقصد اور کارکردگی......62
بنگلہ دیش کا غیر سودی اسلامی بینک......63
شریعت بل: جمعیت علماء اسلام کا نقطۂ نظر......65
پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتابیں اور اسلامی نظریاتی کونسل......75
مساجد و مکاتب کے نظام کی اصلاح کے لیے سفارشات کی ضرورت......77
جسٹس محمد رفیق تارڑ کا جرأتمندانہ فیصلہ......78
دستورِ پاکستان، قراردادِ مقاصد اور قرآن و سنت کی بالادستی......79
قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا حکومتی اختیار......81
مروجہ قوانین کی اسلامائزیشن کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ......84
حق مہر اور عورت کی مظلومیت......87
سودی نظام کے خاتمہ کی جدوجہد......91
شرعی احکام اور ہماری عدالتوں کے فیصلے......93
سودی نظام اور سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ......95
جمعہ کی چھٹی اور اسلامی نظریاتی کونسل......96
مشرف حکومت کے عبوری دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت......97
دینی مدارس کو درپیش چیلنجز کے موضوع پر ایک اہم سیمینار......99
فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے وزیر داخلہ کی سفارشات اور حقیقتِ حال......105
کیا اسلامی نظام صرف مولویوں کا مسئلہ ہے؟......109
خسر اور خوشدامن کی وراثت میں حصہ داری کی سفارش......113
مولانا قاضی عبد اللطیف کے دورۂ قندھار کے تاثرات......114
اسلامی نظریاتی کونسل اور ایک مسیحی شاعر......116
سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کا تسلسل......119
نفاذِ شریعت اور مسلم ممالک کا المیہ......121

حدود آرڈیننس ختم کرنے کی مہم؟...123
''دہشت گردی'' کے حوالے سے چند معروضات...125
صوبہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت...137
سرحد اسمبلی کا شریعت بل، حکومتی کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو...............................139
سرحد اسمبلی کا شریعت ایکٹ...143
طالبان والا اسلام!...146
ملکی قوانین کی تعبیر و تشریح اور نئے سانچے..147
زائد از ضرورت مکانات اور اسلامی نظریاتی کونسل...149
زائد از ضرورت مکانات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش..............................153
''حدود آرڈیننس''ختم کرنے کا مطالبہ...154
''حدود آرڈیننس'' اور خواتین کے حقوق...158
کارفنانسنگ اور اسلامی نظریاتی کونسل...163
غیرت کے نام پر قتل اور اسلامی نظریاتی کونسل...165
حسبہ ایکٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل..169
چودھری شجاعت حسین کا شکریہ...171
حدود شرعیہ کے قوانین اور نیا حکومتی مسودہ قانون...172
اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات..174
اجتہاد کے حوالہ سے نوجوان نسل کے ساتھ ایک مذاکرہ کی روئیداد..........................176
''نوجوان کیا سوچ رہے ہیں؟ جدید مسائل اور اجتہاد''...181
قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان...186
حدود آرڈیننس کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ پر چند گزارشات............187
تحفظِ حقوقِ نسواں بل اور خصوصی علماء کمیٹی..192
تحفظ حقوق نسواں بل اور اسلامی نظریاتی کونسل...198

مجلسِ تحفظِ حدود اللہ کا قیام اور متحدہ مجلسِ عمل کی ریلی........202
آل پاکستان مینارٹیز الائنس کی ریلی اور چارٹر آف ڈیمانڈ........205
اسلامی نظریاتی کونسل کی علمی اشاعتیں........207
حدود و تعزیرات سے متعلق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات........210
کیا اسلام مکمل ضابطۂ حیات نہیں ؟........217
شریعت بل پر ایک نظر........219
اسلامی شریعت کی تعبیر و تشریح: علمی و فکری سوالات........220
وفاقی وزیر مذہبی امور کی وضاحت کا خیر مقدم........226
طلاق کا حق ۔ دین اسلام کیا کہتا ہے ؟........228
پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کی کوششوں کا پس منظر........242
نفاذِ شریعت: کیا، کیوں اور کیسے ؟........248
مسئلہ سود پر دو اہم باتیں........252
امتِ مسلمہ کے مسائل و مشکلات اور علماء کا کردار........254
انٹرنیشنل کرائسس گروپ کا پاکستان میں شرعی قوانین ختم کرنے کا مطالبہ........259
اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات........261
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل کی پریس کانفرنس........263
اسلامی نظریاتی کونسل کے خلاف افسوسناک مہم........265
سودی نظام کے خلاف دینی حلقوں کی مشترکہ مہم........267
دستور کی بالادستی اور قومی خود مختاری کا مسئلہ........272
اسلام اور مغرب، باہمی افہام و تفہیم کی ضرورت اور تقاضے........276
تین طلاقوں کو تعزیری جرم قرار دینے کی سفارش........279
دستورِ پاکستان کی اسلامی بنیادیں........282
ناموسِ رسالتؐ کے قانون پر نظر ثانی ؟........302

اسلامی نظریاتی کونسل اور جہاد سے متعلق عصری سوالات..................................305
قرآن کریم کی تعلیم لازم کرنے کا مستحسن حکومتی فیصلہ......................................308
کیا پاکستان میں نفاذِ اسلام کا کوئی ہوم ورک موجود ہے؟..................................311
اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کا مقصد.....................................315
اسلامی قوانین کے تحفظ پر قومی سیمینار..318
مسئلہ رؤیت ہلال پر دو تجاویز..323
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ڈاکٹر قبلہ ایاز کے نام مکتوب..................................327
اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور سرکاری طرز عمل....................................328
دینی مدارس اور قربانی کی کھالیں: مولانا محمد فیاض خان سواتی کی تجاویز.........................332
نفاذ اسلام میں دستوری اداروں کے کردار کا جائزہ...337
نفاذ اسلام کے دستوری اداروں کو درپیش خطرہ!...342
پاکستان میں نیب کے قوانین پر اسلامی نظریاتی کونسل کا تبصرہ...............................345
آنجہانی رانا بھگوان داس کی یاد میں تقریب..346
چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ڈاکٹر قبلہ ایاز کے نام مکتوب..................................349
اسلامی نظریاتی کونسل اور جمعہ کے خطبات..350
سری لنکا کے ہائی کمشنر سے علماء کرام کی ملاقات...353
”مدرز ملک بینک“ اور رشتوں کا شرعی دائرہ...356
مادۂ تولید کی خرید و فروخت کا مسئلہ..357

عرضِ مرتب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اس سال اپنے کالج کے امتحانات سے فارغ ہوکر اگست میں لاہور سے گوجرانوالہ آنا ہوا۔ چھٹیوں میں مجھے فارغ دیکھ کر چچا نے پوچھا کہ ایک نیا کام سیکھنا چاہتے ہو، اس سے میرا کام بھی آسان ہوجائے گا؟ میں نے کہا کیوں نہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دادا جی کی ویب سائٹ سے کچھ مضامین لے کر ان کی ایک کتاب بنائیں گے۔ اس کے لیے ہم نے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کا عنوان چنا۔ چنانچہ طریقہ سیکھ کر میں نے ان مضامین کی کتاب تیار کی تو چچا نے کہا کہ اب یہ دادا جی کو دکھا دو۔ ان کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور نقد انعام کے ساتھ دعائیں بھی دیں۔ اگلے دن دادا جی نے اس کا پیش لفظ بھی لکھ کر دیا اور ہم نے یہ کتاب فائنل کر دی۔

اس کے بعد ستمبر میں دادا جی کا لاہور آنا ہوا تو ان سے پتہ چلا کہ وہ کتاب انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیج دی تھی جس پر کونسل کے محترم سیکرٹری صاحب نے مقدمہ لکھ کر بھیجا ہے۔ اور کونسل کی طرف سے کتاب کا پرنٹ بھی واپس آیا ہے جس میں انہوں نے چند غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور کتاب کے عنوان کے متعلق کچھ تجاویز دی ہیں۔ چنانچہ ان کی روشنی میں کتاب کا نام تبدیل کیا گیا ہے اور غلطیاں ٹھیک کی گئی ہیں۔ اس طرح کتاب کی یہ نئی شکل سامنے آئی جو پیش خدمت ہے۔

ہلال خان ناصر
۲۹ ستمبر ۲۰۲۳ء

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک دستوری ادارہ ہے جس کا کام ملک میں رائج قوانین کی شرعی حیثیت کا جائزہ لینا، مختلف اداروں اور حلقوں کی طرف سے استفسارات کا جواب دینا، تجاویز و سفارشات پیش کرنا، اور نظام و قوانین کے حوالے سے شرعی اصولوں کی روشنی میں قوم کی راہنمائی کرنا ہے۔ قیام سے لے کر اب تک اس ادارہ نے اپنے دائرہ کار میں خاصا وقیع کام کیا ہے جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام، ماہرینِ قانون اور ممتاز علمی شخصیات شریک کار رہی ہیں۔ جبکہ ہمارے خیال میں اگر اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات، تجاویز اور اس کے مرتب کردہ مسودات قانون کو متعلقہ اسمبلیوں میں زیر بحث لا کر ان پر قانون سازی کا دستوری تقاضہ سنجیدگی کے ساتھ پورا کیا جائے تو نفاذ اسلام اور قرآن و سنت کی عملداری کا کام بہت حد تک انجام پا سکتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی سرگرمیاں، سفارشات اور تجاویز کم و بیش ہر دور میں راقم الحروف کی تحریر و تقریر کا موضوع رہی ہیں اور مختلف اخبارات و جرائد میں اس حوالہ سے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ میرے عزیز پوتے ہلال خان ناصر نے اپنے چچا ناصر الدین خان عامر کی راہنمائی میں ان مضامین کا زیر نظر مجموعہ مرتب کیا ہے جو اس کے حسنِ ذوق اور میری مستقبل کی امیدوں کا آئینہ دار ہے، میں اس ذوق کے چوتھی نسل میں منتقل ہونے پر بے حد خوش اور اللہ پاک کی بارگاہ میں سراپا تشکر ہوں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی بعض سفارشات و تجاویز کے حوالے سے کچھ حلقوں کے تحفظات بھی موجود ہیں جو ایسی ہر کاوش کا لازمی حصہ ہوتے ہیں، مگر مجموعی طور پر ہم اسے ملک میں نفاذِ اسلام کی مساعی کا ایک اہم حصہ سمجھتے ہیں اور ان میں شریک رہنے والوں کے لیے دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ برخوردار ہلال خان کی اس کاوش کو قبولیت سے نوازیں اور اسے اپنے والد، دادا اور پردادا محترمؒ کی اس روایت پر زندگی بھر گامزن رہنے کی توفیق دیں، آمین یا رب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی

ڈائریکٹر الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ

۲۰ اگست ۲۰۲۳ء

مقدمہ

مولانا زاہد الراشدی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ملک و ملت کی خدمت کے کمال جذبے سے نوازا ہے۔ ان کی انتھک کاوشیں قابل رشک ہیں۔ دینی، سماجی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے ملک و ملت سے متعلقہ شاید ہی کوئی مسئلہ ہوگا جس پر مولانا نے اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعے رہنمائی نہ فرمائی ہو۔ ملک کے ایک عظیم دینی جامعہ میں شیخ الحدیث ہونے کی اہمیت اور اس کی مصروفیات کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا کبھی مدارس کے ساتھ واسطہ رہا ہو۔ اگر ہم اس کو ایک جملے بیان کرنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک شیخ الحدیث کو فنا فی الحدیث ہی ہو جانا پڑتا ہے۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے اس منصب بھی نوازا ہے، جمعہ کی باقاعدہ خطابت بھی ان کی توفیقات میں کئی دہائیوں سے شامل ہے، اخبارات میں کالم بھی چلتے ہی رہتے ہیں، تالیف شدہ کتب بھی تسلسل سے جاری ہیں اور سوشل میڈیا میں تبادلہ خیالات اور رہنمائی کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔

زیر نظر کتاب اسلامی نظریاتی کونسل کے متعلق مختلف موضوعات پر حضرت مولانا زاہد الراشدی کی مختصر تحریرات کا مجموعہ ہے، جسے ان کے لائق پوتے ہلال خان ناصر نے جمع کر کے کتابی شکل دے دی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ اصطلاحاً میں کوئی منظم و مربوط کتاب نہیں مگر اس کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کونسل سے متعلقہ چہار پہلو موضوعات کو جس طریقے سے اس مجموعے میں سمویا گیا ہے شاید یہ تنوع باقاعدہ تالیف شدہ کتب میں ناپید نظر آئے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل پر تحقیقی کام ایک تسلسل سے جاری ہے۔ ہمارے لائق دوست اور نوجوان محقق مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن بن نور حبیب نے اسلامی علوم کے بارے میں یونیورسٹی سطح کی تحقیقات کو جمع کرنا اپنا مبارک مشن بنا لیا ہے۔ وہ ادارہ تحقیقات اسلامیات کے نام سے ایک بہت بڑا مجموعہ بھی شائع کر چکے ہیں۔ ان کی طرف سے موصول شدہ ایک فہرست کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے مختلف پہلوؤں پر چالیس کے لگ بھگ مقالے، پی ایچ ڈی، ایم فل، ایم ایس اور بی ایس کی سطح پر مکمل ہو چکے ہیں اور مقالہ نگاروں کو ڈگریاں ایوارڈ ہو چکی ہیں۔ کونسل کے اپنے

ریکارڈ کے مطابق اس موضوع پر پی ایچ ڈی کے کئی مقالے بین الاقوامی سطح پر بھی لکھے جا چکے ہیں جن میں جرمنی کی محترمہ سارہ ہولز کا مقالہ بعنوان An Institutional Study of the Council of Islamic Ideology اور فرانس کے ایک محقق کا پی ایچ ڈی کا مقالہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

کونسل کے تعارف پر مشتمل کتب کی بات کی جائے تو غالباً سب سے پہلے کونسل کے سابق رکن جناب جسٹس (ر) سید افضل حیدر صاحب نے 974 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مرتب کی جس میں کونسل کی معلوم تاریخ، چیئرمین صاحبان، ارکان، اجلاسات اور کارکردگی کا قابل قدر ریکارڈ جمع کر دیا۔ راقم جب کونسل کی خدمت پر مامور ہوا تو اس کی ابتدائی تاریخ ریکارڈ پر نہ ہونے کے سلسلے میں ایک قلق پایا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ادارے کے بنیادی تصور سے لے کر قیام پاکستان کے فورا بعد 1947ء سے اب تک مختلف ناموں سے قائم ہونے والے سرکاری مماثل اداروں کی مستند تاریخ کے ساتھ کونسل کا مکمل تعارف اور کارکردگی بعنوان "اسلامی نظریاتی کونسل: ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی" دو جلدوں میں مرتب ہو کر شائع ہو گئی ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل ایک کتاب بعنوان "اسلامی نظریاتی کونسل کے فکری رجحانات کا ارتقاء، حکومتی خطابات کی روشنی میں" بھی مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ایک اور کتاب بعنوان "حکومتی استفسارات" بھی شائع ہو چکی ہے۔ کونسل کی سابق رکن محترمہ ڈاکٹر سمیحہ راحیل قاضی صاحبہ نے بھی کونسل کے تعارف پر مشتمل ایک مختصر رسالہ مرتب فرما کر شائع کیا ہے۔

امید ہے ہمارے محبوب و محترم مولانا ابو عمار زاہد الراشدی صاحب کی یہ کاوش ان کی کاوشوں میں ایک بہت خوبصورت اضافہ ہو گی۔ اللہ کریم ان کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کو ان کی حسنات میں شامل فرمائے۔

اکرام الحق
سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل
۲۵ ستمبر ۲۰۲۳ء

عدالتِ شرعیہ کا کنونشن

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۱۹ اپریل ۱۹۷۶ء)

عدالت شرعیہ کا کنونشن اور مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس

گزشتہ ہفتہ لاہور کے دینی و سیاسی حلقوں میں خاصی گہماگہمی رہی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم دیوبند کی تشریف آوری اور ماہنامہ الرشید کے ''دارالعلوم دیوبند نمبر'' کی افتتاحی تقریب سے اس گہماگہمی کا آغاز ہوا۔ اور جمعیۃ علماء اسلام کی مجلس شوریٰ کے دو روزہ اجلاس اور شرعی عدالتوں کے دو روزہ کنونشن کے بعد قائد جمعیۃ مولانا مفتی محمود کی پریس کانفرنس تک یہ سرگرمیاں جاری رہیں۔

جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام شرعی عدالتوں کے قاضیوں کا دو روزہ کنونشن گزشتہ روز مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں منعقد ہوا جس میں مرکزی قاضی القضاۃ مولانا مفتی محمود، قاضی مولانا عبد الکریم بیر شریف، قاضی مولانا محمد سرفراز خان صفدر گوجرانوالہ، صوبہ پنجاب کے قاضی القضاۃ مولانا مفتی محمد عبد اللہ ملتان، قاضی مولانا عبد القیوم گوجرانوالہ، قاضی مولانا عبد القدیر لائلپور، صوبہ سندھ کے قاضی القضاۃ مولانا احمد الرحمٰن کراچی، قاضی مولانا قطب الدین صاحب ہالیجی شریف، صوبہ سرحد کے قاضی القضاۃ مولانا سید محمد ایوب جان بنوری پشاور، صوبہ بلوچستان کے قاضی القضاۃ مولانا عبد الغفور کوئٹہ اور قاضی مولانا ابوبکر خضدار کے علاوہ چاروں صوبوں سے ضلعی قضاۃ نے شرکت کی۔ اور عدالت عالیہ شرعیہ پنجاب کی خصوصی دعوت پر آزاد کشمیر کے ممتاز عالم دین مولانا مفتی عبد المتین سابق قاضی ضلع پونچھ، پنجاب ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری جناب سید ریاض الحسن گیلانی، جناب قاضی محمد سلیم ایڈووکیٹ، جناب چوہدری قادر بخش ایڈووکیٹ اور جناب رشید مرتضیٰ ایڈووکیٹ بھی کنونشن میں شریک ہوئے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت مرکزی قاضی مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے اور باقی نشستوں کی صدارت قاضی القضاۃ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے فرمائی۔

مولانا مفتی محمود کا خطاب

کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے مولانا مفتی محمود نے فرمایا کہ جمعیۃ علماء اسلام نے شرعی عدالتوں کے قیام کا فیصلہ مجبوراً کیا ہے۔ کیونکہ اٹھائیس سال سے ہم انتظار کر رہے تھے کہ قیامِ پاکستان کے مقصد کو پورا کرتے ہوئے یہاں شرعی قوانین عمل میں لائے جائیں گے لیکن یہاں عوام، علماء اور تمام طبقوں کی دلی خواہش کے باوجود ایک اقلیتی گروہ ملک میں فرنگی نظام کو نافذ رکھے ہوئے ہے۔ اور وہ گروہ اسلام کے عادلانہ نظام و قوانین میں صرف اس لیے رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے کہ اسلامی قوانین کے اجراء سے خود اس طبقہ کے مفادات خطرہ میں پڑ جائیں گے۔ لیکن ہم اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک مروجہ عدالتوں میں شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں نہیں آتا ہم اپنے طور پر شرعی عدالتوں کا نظام قائم کریں گے اور جہاں تک ہمارے بس میں ہوا شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں لائیں گے۔

مفتی صاحب نے کہا کہ حکومت مسلسل ٹال مٹول سے کام لے کر اسلامی قوانین پر عملدرآمد کو مؤخر کر رہی ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل نے سود کے بارے میں جو سوالنامہ جاری کیا ہے وہ ٹال مٹول اس پالیسی کا حصہ ہے۔ ورنہ ہم نے دیکھا ہے کہ جب حکومت کو اپنی ضرورت ہوتی ہے اور وہ کوئی بل منظور کرانا چاہتی ہے تو اپوزیشن کے جائز اعتراضات کی بھی پروا نہیں کرتی بلکہ اپوزیشن کے ارکان کو جبراً باہر دھکیل کر تیئیں منٹ میں آئین میں ترمیم کا بل منظور کروا لیتی ہے لیکن اسلام کے معاملات میں ٹال مٹول اور سوالناموں کا سہارا لیتی ہے۔

مفتی صاحب نے کہا کہ دراصل بعض ملحد عناصر سود کی تجارتی و غیر تجارتی تقسیم کر کے بینکوں کے سود کو جائز قرار دینے کی کوشش کر رہے ہیں اور ممکن ہے بعض فتویٰ فروش قسم کے لوگ حکومت کی اس خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کریں لیکن علماء حق اس قسم کی کسی سازش کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔

مفتی صاحب نے تمام قضاۃ کو تلقین کی ہے کہ وہ بزرگانِ دین اور اسلاف کرام کے مقدس طرزِ عمل کو سامنے رکھیں اور منصب قضاء کی ذمہ داریوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ نبھانے کی کوشش کریں تاکہ ان کا کردار اور قوت فیصلہ ملک میں اسلامی قوانین کی ترویج اور علماء کی نیک نامی کا باعث بنے۔

سید ریاض الحسن گیلانی کا خطاب

پنجاب ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری جناب سید ریاض الحسن گیلانی نے کنونشن میں خطاب کرتے ہوئے شرعی عدالتوں کے قیام کے فیصلہ کو سراہااور کہاکہ علماء کرام نے یہ تاریخی فیصلہ کر کے ایک اہم ملی فریضہ کی تکمیل کی طرف قدم اٹھایاہے اور ہم سب اس فرض کی ادائیگی میں آپ کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے۔ انہوں نے کہاکہ فرنگی زدہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی قوانین پر آج عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ ترقی کا دور ہے، آج ہوائی جہاز اور ایٹم بم کا زمانہ ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ جب ہندوستان میں فتاویٰ عالمگیری کو منسوخ کر کے فرنگی قوانین کو نافذ کیا گیا تھا کیا اس وقت ترقی کی موجودہ شکل تھی؟ کیا اس لحاظ سے موجودہ قوانین بھی غیر ترقی یافتہ دور کی علامت نہیں جو ترقی یافتہ دور میں چل رہے ہیں؟ اگر فرنگی قوانین ترقی کے باوجود اب تک چل رہے ہیں تو اسلامی قوانین پر عملدرآمد میں کیا رکاوٹ ہے؟

گیلانی صاحب نے کہاکہ اسلامی قوانین ہی دنیا میں سب سے برتر قوانین ہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر نہ کوئی دانشمند ہے نہ مدبر، نہ کوئی انسانی مسائل کو جاننے والا ہے اور نہ حل کرنے والا۔ اس لیے خدائی قوانین کے مقابلے میں دنیا کے سارے قوانین ہیچ ہیں اور اسلامی قوانین کا نظام ہی ملک میں اصلاح و فلاح کا ضامن ہو سکتا ہے۔

گیلانی صاحب نے کہاکہ آج اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی ہے تاکہ فرنگی قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے، میں پوچھتا ہوں کہ جب انگریز نے فتاویٰ عالمگیری کی جگہ اپنے قوانین نافذ کیے تھے تو کونسی نظریاتی کونسل قائم کی تھی؟ اس نے تو فتاویٰ عالمگیری کو یکسر منسوخ کر کے اپنے پورے قانونی نظام کو لاگو کر دیا تھا۔ اسلام کو کفر کے سانچے میں یا کفر کو اسلام کے سانچے میں نہیں ڈھالا جا سکتا کیونکہ اسلام اور کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان میں کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔

گیلانی صاحب نے کہاکہ ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اسلامی قوانین کی ترتیب و تدوین میں وقت لگے گا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات بھی غلط ہے، ہمارے پاس عظیم الشان فقہی ذخیرہ کی صورت میں اسلامی قوانین مرتب و مدون موجود ہیں، ہمارے پاس ہدایہ ہے، مبسوط ہے، عالمگیری ہے اور دوسری کتابیں ہیں جن میں اسلامی قوانین پوری طرح مدون ہیں۔ انہوں نے کہاکہ اسلامی قوانین پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے اور اس کے لیے کسی کے حکم کی ضرورت نہیں۔ جس طرح نماز پڑھنے کے

لیے کسی کا حکم در کار نہیں اسی طرح اسلامی قوانین کے لیے بھی کسی کا حکم در کار نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اتارے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ ظالم ہیں، اس لیے ہم اسلامی قوانین پر عمل کے پابند ہیں اور ہمیں اس فرض کی ادائیگی کی کوشش کرنی چاہیے۔

گیلانی صاحب نے کہا کہ اس سے قبل بھی مسلمان علاقوں پر غیر مسلموں نے قبضہ کیا تھا لیکن مسلمانوں کے فیصلے کبھی کافر قوم کے قوانین کے مطابق نہیں ہوتے تھے بلکہ مسلمانوں نے ہر دور میں، خواہ غلبے کا ہو یا غلامی کا، قرآن و سنت کے قوانین کے مطابق ہی اپنے فیصلے کیے ہیں۔ صرف انگریز کے دور میں مسلمانوں کو اس قدر پابند کر دیا گیا کہ ان کے فیصلے قرآن و سنت کے بجائے فرنگی قوانین کے تحت ہونے لگے اور آج فرنگی کے چلے جانے کے باوجود فرنگی زدہ افراد کی وجہ سے یہ کافرانہ قوانین ہم پر مسلط ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ آپ نے وقت کی اس ضرورت کا احساس کیا ہے اور شرعی قوانین کے نفاذ کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ آپ کا فیصلہ بہت پیارا، بروقت اور قابلِ تحسین ہے اور اس سلسلے میں آپ کو ہمارا مکمل تعاون حاصل رہے گا۔

کنونشن سے مولانا محمد ایوب جان بنوری، مولانا مفتی احمد الرحمٰن، مولانا مفتی محمد عبداللہ، مولانا عبد الحئی، قاضی محمد سلیم ایڈووکیٹ، چوہدری خدا بخش ایڈووکیٹ اور جناب رشید مرتضیٰ ایڈووکیٹ نے بھی خطاب کیا۔

عدالتِ شرعیہ کا طریق کار

کنونشن میں مولانا محمد ایوب جان بنوری، مولانا مفتی محمد عبداللہ، مولانا احمد الرحمٰن، مولانا مفتی عبد المتین، مولانا محمد انور شاہ، سید ریاض الحسن گیلانی، جناب قاضی محمد سلیم ایڈووکیٹ اور جناب قادر بخش ایڈووکیٹ پر مشتمل کمیٹی قائم کی گئی جس نے طریق کار کا خاکہ تجویز کر کے دوسری نشست میں پیش کیا جو بعض ترمیمات کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔

کنونشن میں اسلامی نظریاتی کونسل کے سوالنامہ کا جواب لکھنے کے لیے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا مفتی احمد الرحمٰن، اور مولانا مفتی ولی حسن پر مشتمل کمیٹی تجویز کی گئی اور رات ساڑھے گیارہ بجے دعا پر کنونشن بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

عائلی قوانین کا مسئلہ اور اسلامی نظریاتی کونسل

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۹ جنوری ۱۹۸۲ء)

بعض اخباری خبروں کے مطابق وفاقی مجلس شوریٰ کی بعض خواتین ارکان نے صدر جنرل محمد ضیاء الحق سے مطالبہ کیا ہے کہ عائلی قوانین کے سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قبول نہ کیا جائے اور صدر نے خواتین کے اس مطالبہ کو پذیرائی بھی بخشی ہے۔

ہم اس ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ عائلی قوانین کی بیشتر دفعات کے قطعی غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ صرف اسلامی نظریاتی کونسل نے نہیں کیا بلکہ اس پر ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء متفق ہیں اور اس نکتہ پر اس قدر بحث ہو چکی ہے کہ مزید کچھ عرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے جب تمام غیر اسلامی قوانین کو اسلام کے مطابق بنانے کی بات ہو رہی ہے تو چند ایسی خواتین کے کہنے پر جو ملک کی ۹۰ فیصد پردہ نشین خواتین کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتیں، عائلی قوانین کو خصوصی تحفظ دینے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ حکومت اس سلسلہ میں دینی حلقوں کی متفقہ رائے کو نظر انداز نہیں کرے گی۔

پرائیویٹ شریعت بِل ترامیم کے بعد

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۶ء)

سینٹ میں زیر بحث پرائیویٹ شریعت بِل میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور مختلف مکاتبِ فکر کے اعتراضات کی روشنی میں ضروری ترامیم کے بعد اسے نئی شکل دے دی گئی ہے۔ گزشتہ دنوں لاہور میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ رہنماؤں کی ایک مشترکہ کمیٹی نے شریعت بِل کے متن پر نظر ثانی کی۔ اس کمیٹی میں جمعیۃ علماء اسلام کے مولانا محمد اجمل خان، تنظیم المدارس پاکستان کے ناظمِ اعلیٰ مولانا مفتی عبد القیوم ہزاروی، ممتاز اہلِ حدیث رہنما مولانا حافظ عبد الرحمٰن مدنی اور جماعتِ اسلامی کے رہنما محمد اسلم سلیمی کے علاوہ ممتاز قانون دان میاں شیر عالم ایڈووکیٹ شامل ہیں۔

کمیٹی نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات سے مکمل اتفاق کیا ہے اور مختلف مذہبی مکاتبِ فکر کے اعتراضات کے پیش نظر شریعت بِل کی شق نمبر ۲ اور شق نمبر ۱۲ میں ترمیم کر کے اسے از سرنو مرتب کر دیا ہے جس کے بعد شریعت بِل کو تمام دینی مکاتبِ فکر کی متفقہ حمایت حاصل ہو گئی ہے۔ شریعت بِل کے نئے مسودہ سے دیوبندی مکتبِ فکر کے تمام سرکردہ علماء کے علاوہ بریلوی مکتبِ فکر کے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا مفتی محمد ظفر علی نعمانی، مولانا عبد المصطفیٰ الازہری، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا ابوداؤد محمد صادق، مولانا مفتی عبد القیوم ہزاروی اور اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے مولانا عطاء اللہ حنیف، مولانا حافظ عبد القادر روپڑی، مولانا معین الدین لکھوی اور مولانا عبد الرحمان سلفی نے مکمل اتفاق کیا ہے اور شریعت بِل کے محرکین سینیٹر مولانا سمیع الحق اور سینیٹر مولانا قاضی عبد اللطیف نے بھی نئے مسودہ کو قبول کر لیا ہے۔

شریعت بِل کے حق میں عوامی جدوجہد کو منظم کرنے کے لیے ۲۶ اکتوبر کو جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور میں تمام مکاتبِ فکر کا مشترکہ قومی کنونشن منعقد ہو رہا ہے جس کے انتظامات کے لیے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی کی سربراہی میں مجلس استقبالیہ نے کام شروع کر دیا ہے۔ اس کنونشن میں ملک کے چاروں صوبوں سے ۵ ہزار سے زائد علماء کرام شریک ہوں گے اور اس موقع پر شریعت بِل کی منظوری کے لیے متحدہ شریعت محاذ کی جدوجہد کے آئندہ لائحہ عمل کا اعلان کیا جائے گا۔

مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کی طرف سے شریعت بِل کا الگ مسودہ پیش کرنے کا اعلان نفاذِ شریعت کے معاملہ کو کھٹائی میں ڈالنے کی کوشش ہے تاہم ہمارے نزدیک یہ کریڈٹ کا مسئلہ نہیں اس لیے اگر شریعت بِل کے سرکاری مسودہ میں ملک کے قانونی نظام کو شریعت بِل کے مطابق تبدیل کرنے کا مقصد پورا کر دیا جائے تو ہمیں اس کی حمایت سے بھی کوئی انکار نہیں ہو گا۔ لیکن کسی برائے نام بل کے ذریعے مسئلہ کو ٹالنے کی کوشش کی گئی تو اس کی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کی جائے گی۔

شریعت بِل جائز اجتہاد کی ضمانت دیتا ہے

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۸ نومبر ۱۹۸۶ء)

(متحدہ شریعت محاذ کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات
مولانا زاہد الراشدی سے انٹرویو)

سوال: سینٹ میں مولانا سمیع الحق اور قاضی عبد اللطیف کے پیش کردہ پرائیویٹ شریعت بِل کے بارے میں اس وقت قومی حلقوں میں جو بحث جاری ہے اس کی روشنی میں شریعت بِل کی افادیت اور ضرورت پر کیا آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جواب: جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے وہ تو واضح ہے کہ تحریکِ آزادی اور تحریکِ پاکستان میں دی جانے والی مسلسل قربانیوں کا مقصد محض چہروں اور ناموں کی تبدیلی نہیں تھا۔ بلکہ تحریکِ آزادی، تحریکِ پاکستان اور تحریک نظامِ مصطفیٰؐ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ملک کا نظام تبدیل ہو اور فرنگی استعمار نے اپنے دورِ اقتدار میں جو نظام زندگی کے مختلف شعبوں میں مسلط کیا ہے اس کی جگہ مسلمانوں کے عقائد اور جذبات کے مطابق اسلامی نظام ملک میں نافذ ہو۔ شریعت بِل اسی مقصد کو پورا کرنے کی ایک عملی کوشش ہے اور اس کے ذریعے ملک میں پہلی بار ایک ایسے اقدام کی بات کی گئی ہے جو صرف ناموں یا چہروں کی بجائے نظام کی تبدیلی کا آئینہ دار ہے۔

باقی رہی بات افادیت کی تو اس میں بحث ہو سکتی ہے اور شریعت بِل کو نظام کی تبدیلی کے لیے زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی کسی بھی تجویز کو قبول کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ ترمیم اس کی افادیت میں اضافہ کے لیے ہو، اس میں کمی یا اسے غیر مؤثر بنانے کے لیے نہ ہو۔

سوال: کیا شریعت بِل کے بارے میں حکومت کے رویہ سے آپ مطمئن ہیں؟

جواب: قطعاً نہیں، کیونکہ حکمران پارٹی کا رویہ شریعت بِل کو سینٹ میں بحث کے لیے منظور کرنے کی مخالفت سے لے کر اس کے متبادل سرکاری مسودہ پیش کرنے تک کا ایک ایک مرحلہ حکومت کی ٹال مٹول اور پیچھا چھڑانے کی پالیسی کا مظہر ہے۔ حالانکہ حکمران گروہ کے لیے اس میں تاخیر کا کوئی جواز نہیں ہے۔

۱. اول اس لیے کہ صدر مملکت اپنی صدارت کا جواز ہی اسلام کے نام پر کرائے جانے والے ریفرنڈم کو پیش کرتے ہیں اور وزیر اعظم نے اپنی ترجیحات میں نفاذِ اسلام کو پہلے نمبر پر رکھا ہوا ہے۔

۲. دوم اس لیے کہ سینٹ کی طرف سے شریعت بِل کو حکمران پارٹی کے کہنے پر عوامی رائے کے لیے مشتہر کیا گیا جو اگرچہ اصولی طور پر غلط فیصلہ تھا لیکن اس کے باوجود شریعت بِل کے حق میں ملک کے طول و عرض سے عوام نے اس قدر خطوط لکھے کہ خود وزیر قانون نے سینٹ میں اسے پاکستان کی پوری پارلیمانی تاریخ کا ایک ریکارڈ واقعہ قرار دیا اور کہا کہ اس سے قبل کسی بل کو اتنی زبردست عوامی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔

۳. سوم اس لیے کہ حکومت نے خود شریعت بِل کو اسلامی نظریاتی کونسل کے سپرد کیا جو حکومت ہی کا قائم کردہ ادارہ ہے، اور اسلامی نظریاتی کونسل نے شریعت بِل کے مقاصد اور بنیادی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے اسے از سر نو مرتب کر دیا جسے متحدہ شریعت محاذ نے قبول کر لیا ہے لیکن حکومت نے اسے مسترد کر دیا ہے۔

ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد حکومت کے لیے کوئی اصولی اور اخلاقی جواز نہیں رہا کہ وہ شریعت بِل کی منظوری میں رکاوٹ ڈالے۔

سوال: حکومت کے ساتھ متحدہ شریعت محاذ کے مذاکرات اب کس مرحلہ میں ہیں؟

جواب: مذاکرات تعطل کا شکار ہو چکے ہیں کیونکہ حکومت ہٹ دھرمی اور ضد سے کام لے رہی ہے۔ متحدہ شریعت محاذ کا موقف یہ ہے کہ شریعت بِل میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ کی جائے، اور اگر کوئی ترمیم ناگزیر ہو تو اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ترمیم کر لی جائے۔ جبکہ حکومت نے شریعت بِل اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات دونوں کو مسترد کرتے ہوئے اپنی طرف سے ایک متبادل مسودہ دے دیا ہے جو متحدہ شریعت محاذ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔

سوال: پرائیویٹ شریعت بِل اور سرکاری مسودہ میں فرق کیا ہے؟

جواب: پرائیویٹ شریعت بِل اور سرکاری مسودہ میں چار اہم فرق ہیں:

پہلا فرق یہ ہے کہ شریعت بِل میں شریعت کی تعبیر و تشریح کے لیے دفعہ ۲ اور دفعہ ۱۲ میں جو الگ الگ تفصیلات دی گئی ہیں انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کی روشنی میں دفعہ ۲ کی شق ب میں سمو

کر اسے زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اور اسلامی نظریاتی کونسل کی یہی ایک سفارش ہے جسے سرکاری مسودہ میں قبول کیا گیا ہے۔ اب شریعت کی تعبیر یوں کی گئی ہے:

> ''شریعت سے مراد قرآن و سنت میں مذکور احکامِ اسلام ہیں۔ توضیح: احکامِ اسلام کی تعبیر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل مآخذ سے راہنمائی حاصل کی جائے گی: (۱) اجماعِ امت (۲) سنت خلفاء راشدین (۳) تعاملِ صحابہؓ (۴) مسلم فقہاء اسلام کی تشریحات۔''

اس تعبیر سے متحدہ شریعت محاذ نے بھی اتفاق کیا ہے اور اب یہ متفقہ تشریح قرار پائی ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ سرکاری مسودہ میں شریعت بِل کی دفعہ ۶، ۱۳ اور ۱۶ تینوں حذف کر دی گئی ہیں جو بالترتیب یہ ہیں:

دفعہ ۶: انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدرِ مملکت اور وزیرِاعظم شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔

دفعہ ۱۳: انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے ہر فرد کے لیے فرائضِ شریعت کی پابندی اور محرماتِ شریعت سے اجتناب کرنا لازم ہو گا۔

دفعہ ۱۶: شریعت نے جو بنیادی حقوق باشندگانِ ملک کو دیے ہیں ان کے خلاف کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔

ہمارے نزدیک ان دفعات کو حذف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حکمران گروہ اسلامی احکام کی پابندی کے سلسلہ میں اپنے اوپر کوئی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ شریعت بِل کی دفعہ ۷ میں کہا گیا ہے کہ

> ''حکومت کے تمام عمال بشمول صدرِ مملکت اسلامی قانونِ عدل کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہوں گے۔''

جسے سرکاری مسودہ میں یوں تبدیل کیا گیا ہے

> ''حکومت کے تمام عہدہ دار اسلامی عدل اور جواب دہی کے نظام کے تابع ہوں گے۔''

اب ''عدالتی احتساب سے بالاتر نہ ہونے'' اور ''جواب دہی کے نظام کے تابع ہونے'' میں جو فرق ہے اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ظاہر بات ہے کہ لفظی ہیر پھیر کے ساتھ

سابقہ صورتحال کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چوتھا فرق جو سب سے زیادہ اہم ہے وہ دفعہ ۴ کی تبدیلی ہے۔ شریعت بل کی دفعہ ۴ یہ ہے کہ

"ملک کی تمام عدالتیں تمام امور و مقدمات میں شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی پابند ہوں گی۔"

اسے سرکاری مسودہ میں یوں بدل دیا گیا ہے کہ

"کوئی عدالت کسی ایسے قانون کی بنیاد پر کسی مقدمہ کا فیصلہ نہیں کرے گی جو شریعت کے منافی ہو۔ اور اگر یہ سوال پیدا ہو کہ ایسا کوئی قانون شریعت کے منافی ہے تو یہ معاملہ وفاقی شرعی عدالت کو فیصلے کے لیے سپرد کر دیا جائے گا، سوائے اس کے کہ اس سوال کا اس عدالت نے یا عدالتِ عظمیٰ کے شریعت ایپلٹ بینچ نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہو۔"

دونوں کا فرق واضح ہے کہ شریعت بل کی دفعہ ۴ کا تقاضہ ملک میں مروجہ قوانین کی مکمل تبدیلی ہے کیونکہ اس کے نفاذ کے ساتھ تمام عدالتوں کا قانونی نظام یکسر بدل جائے گا جو نفاذِ اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ مگر سرکاری مسودہ میں الفاظ کے ہیرپھیر کے ساتھ موجودہ قوانین کو برقرار رکھنے اور وفاقی شریعت کورٹ کے طویل تدریجی عمل کے ذریعے قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اسی لیے متحدہ شریعت محاذ نے متبادل سرکاری مسودہ مسترد کر دیا ہے۔

سوال: یہ بات کہاں تک درست ہے کہ شریعت بل کے ساتھ اجتہاد کا دروازہ بند ہو جائے گا؟

جواب: بالکل غلط بات ہے بلکہ شریعت بل تو جائز اجتہاد کی ضمانت دیتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اجتہاد کا مفہوم غلط سمجھ لیا گیا ہے، عام طور پر بعض حلقوں کی طرف سے اجتہاد کا یہ مطلب پیش کیا جاتا ہے کہ شریعت کے جس مسئلہ کو دورِ حاضر کے کسی تقاضے سے متصادم سمجھ لیا جائے تو اس میں شرعی مسئلہ کو ایسی لچک دے دی جائے کہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکے۔ حالانکہ یہ اجتہاد نہیں بلکہ سراسر تحریف ہے جو دین کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔ قرآن کریم سے پہلی آسمانی کتابوں تورات، انجیل، زبور اور ان کی شریعتوں کا حلیہ اسی قسم کے نام نہاد اجتہاد کے ذریعے بگاڑا گیا تھا۔ اور یہ دینی احکام و مسائل کو دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق ڈھالتے رہنے کا ہی نتیجہ ہے کہ ان شریعتوں اور آسمانی کتابوں کا اصلی وجود تک دنیا میں ناپید ہو گیا ہے۔ اجتہاد کے نام پر اس قسم کی شرعی تحریف کی

اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اجتہاد کا شرعی مفہوم یہ ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن و سنت کی واضح ہدایت موجود نہ ہو اس میں مجتہد درجہ کے علماء قرآن و سنت کے اصولوں کی روشنی میں کوئی فیصلہ دیں۔ یہ اجتہاد ہر دور میں موجود رہا ہے اور آج بھی ہے۔ شریعت بل نے بھی اس اجتہاد کی کوئی نفی نہیں کی بلکہ وفاقی شرعی عدالت کو قوانین کی شرعی حیثیت کے تعین کا اختیار دے کر اجتہاد کی ذمہ داری میں علماء کے ساتھ جسٹس صاحبان کو بھی شریک کر دیا ہے جو یقیناً ایک بہت بڑی وسعت پسندی کی بات ہے۔ ہاں منصوص مسائل میں ردوبدل کا اختیار ہم کسی کو نہیں دیتے، نہ کسی پارلیمنٹ کو، نہ رائے عامہ کو اور نہ ہی کسی اور تھارٹی کو۔ کیونکہ اس کے بارے میں قرآن کریم کا حکم سورۃ الاحزاب میں بالکل واضح اور دوٹوک ہے کہ

"اور کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کسی مسئلہ کا فیصلہ کر دیں تو وہ اس میں اپنی رائے اور اختیار کو استعمال کریں۔"

سوال: عام طور پر شریعت بل کو ۱۹۷۳ء کے دستور کے منافی قرار دیا جا رہا ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: یہ سوال وضاحت طلب ہے۔ اگر تو ۱۹۷۳ء کا دستور مکمل اسلامی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی اور شریعت بل کی ضرورت نہیں تو یہ کہنے والوں کو ۱۹۷۷ء کی تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے بارے میں وضاحت کرنی چاہیے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے نافذ ہوتے ہوئے اس تحریک کا کیا جواز تھا، کیونکہ اسلام تو ۱۹۷۳ء کے دستور کی صورت میں مکمل نافذ تھا۔ اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت بل کے مؤثر نفاذ کے لیے ۱۹۷۳ء کے دستور کی کچھ دفعات میں ترمیم ضروری ہے جیسا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے بھی یہی ہے تو ہم بلا تامل یہ کہیں گے کہ دستور کی ان دفعات میں ضرور ترمیم ہونی چاہیے۔ اگر ایم آر ڈی ۱۹۷۳ء کے دستور میں دی گئی صوبائی خود مختاری کی حدود کو مسترد کر کے نئی حدود متعیّن کر سکتی ہے تو نفاذِ شریعت کے لیے ۱۹۷۳ء کے دستور کی کچھ دفعات کے اِدھر اُدھر ہو جانے سے کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔

سوال: ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ غیر نمائندہ اسمبلیوں اور متنازعہ حکومت کے سامنے شریعت بل کو پیش کرنا غلط ہے۔

جواب: حیرت کی بات ہے کہ موجودہ اسمبلیوں اور حکومت کو غیر نمائندہ قرار دینے والے اپنے

مطالبات کے لیے تو اسی حکومت کو مخاطب کرتے ہیں اور الیکشن کی تاریخ کے اعلان کی صورت میں مذاکرات کی پیشکش بھی اسی حکومت کو کرتے ہیں لیکن شریعت بل کے بارے میں وہ موجودہ اسمبلیوں کے سامنے مطالبہ رکھنے پر معترض ہیں۔ یہ اعتراض برائے اعتراض ہے کیونکہ یہ کوئی اصول نہیں کہ حکومت کا جواز متنازعہ ہو تو اس کے سامنے مطالبات ہی نہ رکھے جائیں۔ ہمارے بزرگوں نے تو انگریز کے دور میں ''شریعت ایکٹ'' منظور کرانے اور صوبہ سرحد میں عورتوں کو وراثت کا شرعی حق دلانے کی جدوجہد کی تھی جبکہ وہ اسی حکومت کو قطعی ناجائز قرار دے کر اس سے صرف حکومت نہیں بلکہ ملک چھوڑ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

سوال: جب آپ خود بھی کہتے ہیں کہ موجودہ حکومت سے نفاذِ اسلام کے سلسلہ میں کوئی توقع نہیں ہے تو پھر جدوجہد کا فائدہ؟

جواب: یہ اصول کب سے طے ہوگیا ہے کہ حکومت سے جس کام کی توقع نہ ہو اس کا مطالبہ ہی چھوڑ دیا جائے اور اس کے لیے جدوجہد ترک کر دی جائے؟ کیا شریعت بل کے مخالفین کو اپنے مطالبات اور جدوجہد کے سلسلہ میں حکومت سے کوئی توقع ہے؟ اگر نہیں ہے تو کیا پھر وہ آرام سے بیٹھ جائیں گے؟ یہ بات اصولاً غلط ہے، حکومت سے توقع ہو یا نہ ہو ہمارا کام ملک میں بہتر تبدیلی کے لیے محنت کرنا ہے اور وہ ہم جاری رکھیں گے۔

سوال: شریعت بل کو مودودی ازم سے بھی تعبیر کیا جا رہا ہے، آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب: یہ شوشہ پیر صاحب آف پگارا نے چھوڑا ہے جنہیں شوشے چھوڑنے کی عادت ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ مولانا نورانی جیسے سنجیدہ شخص نے بھی اس شوشے کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے حالانکہ یہ قطعی خلافِ واقعہ بات ہے۔ شریعت بل مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبد اللطیف نے پیش کیا ہے اور ان دونوں کا تعلق جمعیۃ علماء اسلام سے ہے۔ پھر جماعتِ اسلامی کے ساتھ دینی حلقوں کے اختلافات معروف اور واضح ہیں اور ان اختلافات کے حوالے سے شریعت بل کی کسی ایک دفعہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی جسے ملک کے عام دینی حلقوں کے موقف کے خلاف اور جماعتِ اسلامی کے مخصوص نظریات پر مبنی قرار دیا جا سکتا ہو۔ اگر مولانا نورانی ایسی کسی ایک شق کی نشاندہی بھی کر دیں تو ہم اسے ان کی خواہش کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن کسی دلیل کے بغیر صرف ''مودودی ازم'' کی رٹ لگائے جانا محض الزام تراشی ہے۔

جماعتِ اسلامی شریعت بل کے مسئلہ پر ہمارے ساتھ ہے، متحدہ شریعت محاذ میں شریک ہے اور شریعت بل کی غیر مشروط حمایت کر رہی ہے۔ ہم اس کے شکر گزار ہیں لیکن شریعت بل مودودی ازم نہیں ہے بلکہ ملک کے قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے ایک ایسی دستاویز ہے جسے تمام مکاتبِ فکر کے سنجیدہ علماء اور راہنماؤں کی حمایت حاصل ہے۔

سوال: شریعت بل کے خلاف اسلام آباد میں خواتین کے مظاہرہ پر آپ کا ردعمل کیا ہے؟

جواب: ہم ان مٹھی بھر خواتین کو ملک کی کروڑوں دیندار خواتین کا نمائندہ نہیں سمجھتے جو پاکستان کے مشرقی اور اسلامی معاشرہ کو ایک ایسے وقت میں مغربی معاشرہ کی پیروی کی دعوت دے رہی ہیں جبکہ خود یورپ کے دانشور اپنے معاشرہ میں عریانی، بے راہ روی اور گھریلو بے سکونی سے عاجز آچکے ہیں۔ ملک کی کروڑوں خواتین قرآن و سنت پر پختہ ایمان رکھتی ہیں اور قرآن و سنت کی واضح ہدایات اور احکام کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔ پھر خواتین کے یہ مظاہرے ہمارے نزدیک خود حکومت کے ایماء پر ہو رہے ہیں کیونکہ حکومت کے بعض وزراء ایک عرصہ سے شریعت بل کے مخالف عناصر کو ابھارنے اور طبقاتی اختلافات کو ہوا دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان مظاہروں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ہماری جدوجہد ملک کے نظام کو اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے ہے اور یہ جدوجہد کسی مخالفت کی پروا کیے بغیر نتائج کے حصول تک ان شاءاللہ تعالیٰ جاری رہے گی۔

وزیراعظم جناب محمد خاں جونیجو کے نام کھلا خط

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۴ اپریل ۱۹۸۷ء)

باسمہ سبحانہ

بگرامی خدمت جناب محمد خاں جونیجو صاحب، وزیراعظم حکومت پاکستان اسلام آباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ قومی اخبارات کی ۱۳ اپریل ۱۹۸۷ء کی اشاعت کے مطابق آنجناب نے اپنے حالیہ دورۂ برطانیہ کے دوران بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے سینٹ آف پاکستان میں علماء کے پیش کردہ شریعت بل کے بارے میں یہ کہا ہے کہ

"میں شریعت بل کے خلاف ہوں کیونکہ اس سے ایک فرقہ کی بالادستی قائم ہونے کا خطرہ ہے۔"

آنجناب کے ان ریمارکس کے حوالہ سے میں آپ کو "شریعت بل" کے بارے میں چند ایسے حقائق کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جس کی موجودگی میں ان ریمارکس کا کوئی اصولی اور اخلاقی جواز نہیں ہے۔

سینٹ آف پاکستان نے علماء کے پیش کردہ شریعت بل کو مجلس قائمہ اور مجلس منتخبہ کے سپرد کیا جس نے بعض جزوی ترامیم کے ساتھ سینٹ سے اس بل کو منظور کرنے کی سفارش کر دی ہے۔

حکومت پاکستان کی طرف سے شریعت بل کا مسودہ اسلامی نظریاتی کونسل کے سپرد کیا گیا اور تمام مکاتبِ فکر کے ذمہ دار حضرات پر مشتمل اسلامی نظریاتی کونسل نے شریعت بل کے مسودہ کو منظور کرنے کی سفارش کرتے ہوئے اسے مزید مؤثر بنانے کے لیے ترامیم اور اضافے تجویز کیے ہیں۔

سینٹ آف پاکستان نے شریعت بل کے مسودہ کو رائے عامہ کے لیے مشتہر کیا اور اس کے حق میں ملک کے ہر حصہ سے اس کثرت کے ساتھ آراء سینٹ کے سیکرٹریٹ کو موصول ہوئیں کہ سینٹ کے چیئرمین اور وزیر قانون کے یہ ریمارکس سینٹ کی کارروائی کے ریکارڈ میں شامل ہیں کہ اس سے قبل کسی مسودۂ قانون کو اتنی زیادہ عوامی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔

ان حقائق کی موجودگی میں آنجناب کی طرف سے شریعت بل کی مخالفت کا اظہار سینٹ کی مجلس قائمہ و منتخبہ کی رپورٹ، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور ملک گیر رائے عامہ کو مسترد کرنے کا اعلان ہے۔ اس لیے آپ کی اصولی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ یا تو موجودہ سینٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل کو توڑنے کا اعلان کریں اور یا پھر خود اقتدار سے الگ ہو کر نئے انتخابات کی راہ ہموار کریں۔ کیونکہ سینٹ کی کارروائی اور رائے عامہ کو مسترد کرنے کے بعد موجودہ صورتحال کو برقرار رکھنے کا کوئی اصولی یا اخلاقی جواز باقی نہیں رہا۔

شریعت بل کی مخالفت میں آپ کے مذکورہ بالا ریمارکس کے اس پہلو کی طرف بھی آپ کو متوجہ کرنا ضروری ہے کہ آنجناب نے کسی ایک فرقہ کی بالادستی کے خطرہ کو عنوان بنا کر شریعت بل کی مخالفت کا اعلان کیا ہے لیکن نہ تو اس فرقہ کی نشاندہی کی ہے جس کی بالادستی کے خوف سے آپ اس اعلان پر مجبور ہوئے، اور نہ ہی آپ نے شریعت بل کی کسی ایسی دفعہ کا حوالہ دیا ہے جس کے ضمن میں آپ کو یہ خطرہ دکھائی دے رہا ہے۔ اس لیے ان دونوں امور کی واضح نشاندہی کے بغیر آپ کا موقف قطعی بلا دلیل اور اس میں کوئی وزن نہیں ہے۔ اور آپ کی ذمہ داری ہے کہ شریعت بل کی متعیّن دفعہ کا حوالہ دے کر اس فرقہ کی نشاندہی کریں جس کی بالادستی کے خطرہ کا آپ نے ذکر کیا ہے۔

امید ہے کہ آپ میری گزارشات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے ہوئے جلد از جلد جواب سے نوازیں گے۔

منجانب: ابوعمار زاہد الراشدی۔ ڈپٹی سیکرٹری جنرل جمعیۃ علماء اسلام پاکستان

شریعت بِل پر اتفاق رائے۔
وزیرِاعظم محمد خان جونیجو کے نام کھلا خط

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۳ جولائی ۱۹۸۷ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بگرامی خدمت جناب محترم محمد خان جونیجو صاحب، وزیرِاعظم حکومتِ پاکستان اسلام آباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ روزنامہ مشرق لاہور ۲۷ جون ۱۹۸۷ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی ہے جس کے مطابق وفاقی کابینہ نے ”شریعت بِل“ کے بارے میں عوامی رابطہ کے عنوان سے وزراء کے ملک گیر دوروں کا پروگرام طے کیا ہے اور اس پروگرام کی تکمیل تک سینٹ کے اجلاس کے انعقاد کو مؤخر کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ خبر کے مطابق وزراء کے ان دوروں کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ شریعت بِل کو تمام طبقات کے لیے قابلِ قبول بنایا جائے۔

اس خبر کے حوالہ سے آنجناب کی خدمت میں چند ضروری گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

۱. سینٹ میں زیرِ بحث شریعت بِل کے حق میں خود سینٹ کی قائم کردہ سلیکٹ کمیٹی واضح رائے دے چکی ہے اور سلیکٹ کمیٹی میں سینٹ کے تمام طبقات کی نمائندگی موجود ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل خود حکومت کے استفسار پر شریعت بِل کے حق میں سفارش کر چکی ہے اور کونسل میں ملک کے تمام دینی مکاتبِ فکر کی ذمہ دارانہ نمائندگی موجود ہے۔

۲. سینٹ کی طرف سے شریعت بِل کو رائے عامہ کے لیے مشتہر کرنے کے بعد اس کے بارے میں ملک کے ہر حصے سے جو آراء کثیر تعداد میں موصول ہوئی ہیں ان کی رپورٹ سینٹ کے ریکارڈ میں ان ریمارکس کے ساتھ موجود ہے کہ اس سے قبل کسی قانونی بل کو اس قدر عوامی حمایت حاصل نہیں ہوئی۔ ان حقائق کے بعد وزراء کو عوامی رابطہ کی ایک نئی مہم پر بھیجنا سینٹ

کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ، سلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات، اور رائے عامہ کے سینٹ میں پیش کردہ نتائج کو مسترد کرنے کے مترادف ہے جس کا آپ کے پاس کوئی فنی اور اخلاقی جواز نہیں ہے۔

۳. شریعت بِل کی منظوری کے لیے جدوجہد کرنے والے متحدہ شریعت محاذ پاکستان میں بریلوی، دیوبندی اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر کے سرکردہ اور سنجیدہ علماء شریک ہیں اور ان مکاتبِ فکر کے جو حضرات شریعت بِل کی مخالفت کر رہے ہیں، ان کے اختلاف کی بنیاد شریعت بِل کے مندرجات پر نہیں ہے بلکہ وہ آنجناب کی حکومت کو ایک جائز آئینی حکومت تسلیم نہ کرنے کی وجہ سے آپ سے شریعت بِل کے مطالبہ کی مخالفت کر رہے ہیں۔ جیسا کہ مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا فضل الرحمٰن اس کا برملا اظہار کر چکے ہیں اور علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم نے بھی اپنی المناک شہادت سے چند روز قبل جنگ فورم میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ شریعت بِل کے نہیں بلکہ موجودہ حکومت کے خلاف ہیں۔ اس لیے اگر حکومت کے خلاف متحدہ شریعت محاذ نے تحریک چلائی تو وہ اس میں سب سے آگے ہوں گے۔ چنانچہ شریعت بِل کی منظوری میں ان حضرات کی مخالفت کو رکاوٹ بنانا آپ کے لیے قطعی طور غیر اصولی بات ہوگی کیونکہ ان حضرات کے موقف کو قبول کرنے کا اولین منطقی تقاضہ یہ ہوگا کہ آپ ان کے بقول ایک غیر آئینی اور ناجائز حکومت سے دستبردار ہو کر دستوری حکومت کی راہ ہموار کریں۔

۴. ظاہر اور بدیہی بات ہے کہ ملک کے جو سیاسی عناصر دستور کی اسلامی بنیادوں کو تسلیم نہیں کرتے اور ملک کا نظام سیکولر بنیادوں پر چلانے کے داعی ہیں، ان کے لیے شریعت بِل یا کسی اور عنوان سے نفاذِ شریعت کا کوئی بھی قانون قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ اس لیے شریعت بِل کے بارے میں ان طبقات کے لیے قابلِ قبول ہونے کی شرط کا کوئی جواز نہیں ہے اور ایسی کسی بھی شرط کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ ان طبقات کی مخالفت کے بہانے حکومت نفاذِ شریعت کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں سے گریز اور فرار کا راستہ اختیار کر رہی ہے۔

۵. جہاں تک شریعت بِل کو تمام طبقات کے لیے قابلِ قبول بنانے کی بات ہے، بظاہر یہ بہت خوش آئند تصور ہے لیکن سنجیدگی سے غور کیا جائے تو یہ قطعی غیر منطقی اور ناقابلِ عمل ہے۔

کیونکہ اگر تمام طبقات کے لیے قابلِ قبول ہونے کو ہی اصول قرار دے دیا جائے تو آنجناب کو سب سے پہلے دستورِ پاکستان کی اسلامی بنیادوں سے دستبرداری اختیار کرنا ہوگی کیونکہ سیکولرازم، سوشلزم اور مغربی جمہوریت کے داعی طبقات دستور اور مذہب کے باہمی تعلق کو ہی سرے سے تسلیم نہیں کرتے اور اس کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

۶. آپ تمام طبقات کے لیے "قابلِ قبول" ہونے کے اس اصول کو خود اپنی حکومت پر ہی منطبق کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کی حکومت ملک کے تمام طبقات کے لیے کس حد تک قابلِ قبول ہے اور اگر اس اصول پر آپ کو شریعت بل کے بارے میں اصرار ہے تو آپ کو اس کے منطقی تقاضہ کی تکمیل کرتے ہوئے سب سے پہلے خود اقتدار سے دستبردار ہو کر "تمام طبقات کے لیے قابلِ قبول" حکومت کے قیام کا راستہ صاف کرنا ہوگا۔

۷. ہمیں شریعت بل کے لیے زیادہ سے زیادہ طبقات کی حمایت اور ہم آہنگی کی ضرورت سے انکار نہیں ہے لیکن یہ ہم آہنگی دستورِ پاکستان کے اسلامی تقاضوں، اسلامی نظام کے بنیادی اصولوں اور سنجیدگی و متانت کے دائرہ میں ہونی چاہیے۔ اس سے قبل بعض وفاقی وزراء نے ملک کے مختلف حصوں کے دورے کیے ہیں لیکن ان کی مساعی کا ہدف اتفاق رائے کے حصول کی بجائے شریعت بل کی مخالفت میں مختلف الخیال عناصر کو ابھارنا رہا ہے۔ اور اب بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ وزراء کے ذمہ یہی کام لگایا گیا ہے کہ ملک کے مختلف شہروں میں گھوم پھر کر شریعت بل کی مخالفت کے لیے متضاد نظریات کے حامل افراد و طبقات کو اکسایا جائے اور اس طرح نفاذِ شریعت کی ذمہ داریوں سے فرار اور گریز کی راہ ہموار کی جائے۔

اس پس منظر میں آنجناب سے یہ گزارش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس افسوسناک پالیسی پر نظر ثانی کی جائے اور وزراء کی فوج ظفر موج کو قوم میں انتشار پھیلانے اور علماء کے مختلف طبقات کے درمیان اختلافات کو ہوا دینے کے کام پر لگانے کی بجائے شریعت بل کے بارے میں

- سینٹ کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ،
- اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات،
- اور رائے عامہ کے سینٹ میں پیش کردہ نتائج

کے منطقی تقاضوں کی تکمیل کرتے ہوئے سینٹ اور قومی اسمبلی سے شریعت بل کو جلد از جلد منظور

کرانے کا اہتمام کیا جائے۔ تاکہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ بالخصوص عدالتی نظام کی اسلامی تقاضوں کے مطابق تبدیلی کے عمل کا آغاز ہو سکے۔ امید ہے کہ آپ ان گزارشات پر سنجیدگی سے توجہ فرمائیں گے۔

والسلام، ابو عمار زاہد الراشدی

اسلام کی تشریح اور پیپلز پارٹی۔علماء کرام توجہ فرمائیں!

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔۲۶ فروری ۱۹۸۸ء)

پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو نے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترامیم کے خلاف سپریم کورٹ میں جو آئینی پٹیشن دائر کر رکھی ہے اس پر سپریم کورٹ کے گیارہ رکنی فل بینچ نے گیارہ روز بحث کے بعد فیصلہ محفوظ کر لیا ہے۔ رٹ پٹیشن کے دوران بے نظیر بھٹو کے وکیل اور پیپلز پارٹی کے راہنما جناب یحییٰ بختیار نے دیگر متعلقہ امور کے علاوہ نظریۂ پاکستان کے حوالہ سے اسلام کی تعبیر و تشریح کے بارے میں اپنی پارٹی کا نقطۂ نظر بھی عدالت کے سامنے پیش کیا ہے جو بلاشبہ اس اہم اور نازک مسئلہ پر پیپلز پارٹی کے باضابطہ اور ذمہ دارانہ موقف کی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب یحییٰ بختیار نے اس ضمن میں جو کچھ کہا اس کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

- جہاں تک نظریۂ اسلام اور نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے تو ہم ان دونوں پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی فکر کے مطابق اسلام اور نظریۂ اسلام کی تشریح کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔
- اسلام مکمل دین ہے اس لیے ہر مسلمان کو قرآن کریم کی تشریح کرنے کا حق حاصل ہے۔ کوئی مولوی، شوریٰ، اسلامی نظریاتی کونسل یا شرعی عدالت اس بات کی پابندی نہیں لگا سکتی کہ قرآن و سنت کے بارے میں اسی کی تشریح کو قبول کیا جائے۔
- قرآن و سنت کی تشریح کا اسلامی طریقہ اجماع ہے جو عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔
- شریعت کی تشریح صرف منتخب نمائندوں کا حق ہے۔
- ہم اسلام کے خلاف نہیں تھیوکریسی اور ملائیت کے خلاف ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے واضح طور پر کہا تھا کہ آج کے دور میں اجتہاد صرف منتخب نمائندوں کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

(بحوالہ روزنامہ جنگ، لاہور۔۱۸ فروری ۱۹۸۸ء)

یہ نقطۂ نظر نیا نہیں بلکہ اس سے پہلے ’’شریعت بل‘‘ کی بحث کے دوران حکمران حلقوں کی طرف

سے بھی کم وبیش یہی موقف پیش کیا جاچکا ہے اور سپریم کورٹ کے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور ان کے رفقاء کی طرف سے اس موقف پر مسلسل اصرار کیا جارہا ہے۔ لیکن ملک کی سیاسی جماعتوں میں پاکستان پیپلز پارٹی وہ پہلی جماعت ہے جس نے اس نقطۂ نظر کو باضابطہ پارٹی موقف کی حیثیت دے کر ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں پیش کر دیا ہے۔

دورِ حاضر میں قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے حق اور دائرہ کار کی بحث جو سنجیدہ اور عملی رخ اختیار کرتی جارہی ہے وہ تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کی گہری اور بھرپور توجہ کی مستحق ہے۔ اگر علماء کرام نے اس کی اہمیت و نزاکت کا بروقت ادراک و احساس نہ کیا تو اس کے فکری و عملی نتائج کی ذمہ داری سے وہ خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکیں گے۔

صدر جنرل محمد ضیاء الحق کا نفاذِ شریعت آرڈیننس

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ جون ۱۹۸۸ء۔ جلد ۳۱ شمارہ ۲۵)

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ۱۴ جون کو ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے بالآخر "نفاذِ شریعت آرڈیننس" کے نفاذ کا اعلان کر دیا ہے جس پر ملک بھر میں مثبت اور منفی ردعمل کا اظہار ہو رہا ہے۔ صدر مملکت نے اپنے نافذ کردہ اس نفاذِ شریعت آرڈیننس کو سینٹ میں علماء کے پیش کردہ شریعت بِل اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر ہونے والی جدوجہد کے تسلسل کا ایک حصہ قرار دینے کی کوشش کی ہے اور نشری تقریر میں یہ تاثر دیا ہے کہ نفاذِ شریعت آرڈیننس کے ذریعہ دینی و قومی حلقوں کے اس دیرینہ مطالبہ کو پورا کر دیا گیا ہے جو ملک میں اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے لیے قیامِ پاکستان کے بعد سے کیا جا رہا ہے۔

ہم ان سطور میں اس سے قبل بھی عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے لیے اس سے زیادہ مسرت کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ پاکستان میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور بالادستی کے لیے ایسی مؤثر پیشرفت ہو جس سے ملک کے قانونی، عدالتی اور معاشی نظام میں کوئی عملی تبدیلی بھی نظر آئے۔ بدقسمتی سے گزشتہ گیارہ سال سے اس ضمن میں ہونے والے اسلامی اقدامات اس معیار پر پورے نہیں اترتے اور انہی تجربات کے باعث ملک کے سنجیدہ حلقے اس نئے اور بظاہر بہت اہم اقدام کے ساتھ بھی اعتماد کا رشتہ قائم کرنے کے لیے خود کو تیار نہیں پا رہے۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا موقف ہمیشہ متوازن اور معتدل رہا ہے کیونکہ علماء حق کو نہ تو کریڈٹ سے کوئی دلچسپی رہی ہے اور نہ ہی وہ مخالفت برائے مخالفت کی سیاست پر یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے جمعیۃ کے قائدین شریعت بِل کے متن اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی بنیاد پر نفاذِ شریعت آرڈیننس کا تفصیلی جائزہ لے رہے ہیں۔ ۲۶ جون کو مرکزی مجلس عمومی کے اجلاس میں اس سلسلہ میں جماعتی موقف کو حتمی شکل دی جائے گی۔ اگر اس آرڈیننس سے شریعت اسلامیہ کے مطابق ملک کے نظام میں عملی تبدیلی کی کوئی صورت نظر آئی تو اس کی تائید و حمایت میں بخل سے کام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اسلام کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے اور شریعت کے نام پر منافقت کی حوصلہ افزائی نہ

اس سے قبل جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے کی ہے اور نہ ہی علماء حق کے اس اصول پرست گروہ سے کسی کو ایسی توقع رکھنی چاہیے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی رجعتِ قہقری

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اپریل ۱۹۹۰ء)

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان ایک آئینی ادارہ ہے جس کے قیام کی گنجائش ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس مقصد کے لیے رکھی گئی تھی کہ پاکستان میں مروجہ قوانین کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر خلافِ اسلام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے اور قانون سازی کے اسلامی تقاضوں کے سلسلہ میں قانون ساز اداروں کی راہنمائی کی جائے۔ ۱۹۷۳ء میں دستور کے نفاذ کے موقع پر اس مقصد کے لیے سات سال کی مدت طے کی گئی تھی لیکن ۱۹۷۷ء تک کونسل نے اس سمت کوئی پیشرفت نہ کی تو جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ نو کر کے اسے نہ صرف متحرک بنایا بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل ہی کی سفارشات کی بنیاد پر حدود آرڈیننس اور دیگر اسلامی قوانین کے نفاذ کا آغاز کیا۔

اس دور میں نافذ ہونے والے اسلامی قوانین کے نامکمل ہونے اور عملدرآمد کا پہلو خاصا کمزور ہونے کے بارے میں دینی حلقے مسلسل آواز اٹھاتے رہے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ چند اسلامی قوانین جس حد تک بھی نافذ ہوئے وہ تمام مکاتبِ فکر کے سربرآوردہ علماء کرام کی مشاورت اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی بنیاد پر تھے اور اصولی اور شرعی لحاظ سے درست تھے۔ ہماری معلومات کے مطابق اس دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اسلامی قانون سازی کے حوالے سے ۸۰ فیصد کام مکمل کر کے قوانین کے مسودات مرتب کر دیے تھے جو نفاذ و عملدرآمد کے لیے حکمرانوں کی میز پر تیار پڑے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے موجودہ حکمرانوں کو اسلام کے نفاذ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ ان کی پالیسیوں کا رخ یہ نظر آ رہا ہے کہ اسلام کی جدید تعبیر و تشریح اور نام نہاد اجتہاد کے نام پر مغربی افکار و نظریات کو اسلام کے لیبل کے ساتھ مسلط کر دیا جائے، لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کا ٹھوس علمی و فکری کام ان کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔

چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ نو کر کے اس میں درباری قسم کے نام نہاد علماء اور ملحدین کو شامل کر دیا گیا ہے اور نئی کونسل کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے حکمران پارٹی کی سربراہ بیگم

بے نظیر بھٹو نے اسلامی نظریاتی کونسل کو ہدایت کی ہے کہ وہ حدود آرڈیننس اور دیگر اسلامی قوانین پر نظر ثانی کرے اور انہیں اجتہاد کے نام پر حکمران پارٹی کے مزعومہ رجحانات اور تقاضوں کے مطابق ڈھالے۔

ہمارے نزدیک اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ رجعت قہقری نہ صرف قانون سازی کے اسلامی تقاضوں سے متصادم ہے بلکہ اجتہاد اور تعبیر جدید کے نام پر ملک کو الحاد کی آماجگاہ بنانے کی بھی ایک کوشش ہے جس کا علمی و دینی حلقوں کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔

شریعت بِل اور شریعت کورٹ۔ قومی اسمبلی کی نازک ترین ذمہ داری

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جون ۱۹۹۰ء)

سینٹ آف پاکستان نے مولانا سمیع الحق اور مولانا قاضی عبداللطیف کا پیش کردہ ''شریعت بِل'' کم و بیش پانچ سال کی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر متفقہ طور پر منظور کر لیا ہے۔ شریعت بِل ۱۹۸۵ء میں پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا کے سامنے رکھا گیا تھا، اسے عوامی رائے کے لیے مشتہر کرنے کے علاوہ سینٹ کی مختلف کمیٹیوں نے اس پر طویل غور و خوض کیا اور اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس بھی اسے بھجوایا گیا۔ شریعت بِل کی حمایت اور مخالفت میں عوامی حلقوں میں گرما گرم بحث ہوئی، متعدّد حلقوں کی طرف سے اس میں ترامیم پیش کی گئیں اور بالآخر ترامیم کے ساتھ شریعت بِل کو متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کے حوالہ سے ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد کی منظوری اور ۱۹۷۳ء میں اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیے جانے کے بعد یہ تیسرا اہم ترین واقعہ ہے۔ اول الذکر دو اقدامات کے ذریعے ملک کی نظریاتی اور اسلامی حیثیت کے تعین کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات و احکامات کو قومی پالیسیوں کا سرچشمہ قرار دیا گیا تھا جبکہ شریعت بِل ملک کے اجتماعی نظام میں اسلامی تعلیمات کے مطابق انقلابی عملی تبدیلیوں کا نقطۂ آغاز ہے۔

شریعت بِل سینٹ سے منظور ہونے کے بعد اب قومی اسمبلی کے فلور پر آنے والا ہے اور اسے منظور کرنے کی ذمہ داری قومی اسمبلی کے ارکان کے لیے ایک کڑی آزمائش بن گئی ہے۔ ملک کے بعض حلقے اپنے گروہی مفادات اور مصلحتوں کی خاطر یقیناً شریعت بِل کی منظوری میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کریں گے بلکہ ان کوششوں کا آغاز بھی ہو گیا ہے۔ لیکن قومی اسمبلی کے ارکان سے ہم یہ گزارش کریں گے کہ وہ گروہی، جماعتی اور طبقاتی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر شریعت بِل کے منظور شدہ مسودہ کا مطالعہ کریں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے ضمیر کے مطابق اس کے بارے میں فیصلہ کریں کیونکہ شریعت

اسلامیہ کی بالادستی ایک مسلمان کے ایمان و عقیدہ کا مسئلہ ہے اور اس کے لیے میدانِ حشر میں بارگاہِ ایزدی اور دربارِ مصطفویؐ میں جواب دہی کے مرحلہ سے بھی گزرنا ہوگا۔

نفاذ اسلام کے حوالہ سے شریعت بل کے علاوہ ایک اور اہم اور نازک مسئلہ بھی اس وقت قومی اسمبلی کے ارکان کے ضمیر کو دستک دے رہا ہے اور وہ ہے وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مالیاتی امور کو مستثنیٰ رکھنے کا مسئلہ جو اس وقت قومی حلقوں میں سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث ہے۔ وفاقی شرعی عدالت کم و بیش دس سال قبل تشکیل دی گئی تھی اور اس کی ذمہ داریوں میں ملک میں رائج غیر اسلامی قوانین پر نظر ثانی کا کام شامل تھا لیکن بعض دیگر قوانین کی طرح مالیاتی قوانین کو دس سال کے لیے وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔ اور اس استثنا کی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ اس دوران متبادل مالیاتی نظام ترتیب پا جائے تاکہ موجودہ غیر اسلامی سودی مالیاتی نظام کو یکلخت ختم کرنے کی صورت میں کوئی خلا پیدا نہ ہو اور مالیاتی نظام افراتفری اور ابتری کا شکار نہ ہو جائے۔ دس سال کی یہ میعاد جون ۱۹۹۰ء کے دوران ختم ہو رہی ہے جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل ملکی اور بیرونی علماء اور ماہرین معیشت کی مشاورت اور راہنمائی سے سود سے پاک معاشی نظام کا مکمل خاکہ مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر چکی ہے۔ لیکن حکومتی حلقوں کا یہ رجحان سامنے آ رہا ہے کہ وہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مالیاتی امور کو مستثنیٰ رکھنے کی مدت میں مزید اضافہ کر کے موجودہ سودی نظام کو برقرار رکھنے کی فکر میں ہیں، اس مقصد کے لیے ارکانِ اسمبلی کو ہموار کرنے کی مہم جاری ہے اور یہ مسئلہ بھی قومی اسمبلی کے سامنے آنے والا ہے۔

قومی اسمبلی کے ارکان کے سامنے اس مسئلہ کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سود کو قرآن کریم نے صراحتاً حرام قرار دیا ہے بلکہ سود کے لین دین کو خدا اور رسولؐ کے خلاف جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ جبکہ موجودہ معاشی نظام کی بنیاد ہی سود پر ہے اور اسلام کے عملی نفاذ کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے معاشی نظام کو سود اور اس جیسی خرابیوں سے یکسر پاک کر دیا جائے۔ اس لیے ہم قومی اسمبلی کے محترم ارکان سے گزارش کریں گے کہ وہ سود پر مبنی غیر اسلامی معیشت کو باقی رکھنے کی مہم کا ساتھ نہ دیں بلکہ اس بات پر زور دیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی بنیاد پر سود سے پاک معاشی نظام کو ملک میں بلا تاخیر رائج کیا جائے۔

بہرحال شریعت بل اور شریعت کورٹ کے اختیارات کا مسئلہ ارکانِ اسمبلی کے ضمیر اور ایمان کے

لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اگر انہوں نے ان دو مسائل کے سلسلہ میں دین و ایمان کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے کردار کا تعین کیا تو ان کا یہ عمل دنیا و آخرت میں ان کی نیک نامی اور سرخروئی کا باعث ہوگا، اور اگر وہ جماعتی مصلحتوں اور گروہی و طبقاتی مفادات کے حصار سے خود کو نہ نکال سکے تو سود پر اصرار اور شریعت کی بالادستی سے انحراف کے اس بدترین قومی جرم پر خدا تعالیٰ کی طرف سے دنیاوی اور اخروی عذاب (العیاذ باللہ) کا سب سے پہلا اور بڑا ہدف وہی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اس رسوائی اور ذلت سے پوری قوم کو پناہ میں رکھیں، آمین یا الٰہ العالمین۔

شریعت بِل، پارلیمنٹ کی خود مختاری اور اجتہاد

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۱۹۹۰ء)

صدر مملکت کی طرف سے قومی اسمبلی توڑے جانے کے بعد عوامی سطح پر شریعت بِل کے بارے میں بحث وتمحیص کا سلسلہ اگرچہ وقتی طور پر رک گیا ہے اور شریعت بِل کی منظوری اور نفاذ کے بارے میں لوگ ۲۴ اکتوبر کو معرض وجود میں آنے والی قومی اسمبلی کا انتظار کر رہے ہیں، لیکن اہل دانش کے ہاں شریعت بِل پر بحث وتمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ ملک کے دو معروف قانون دانوں ریٹائرڈ جسٹس جناب جاوید اقبال اور جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے مضامین گزشتہ دنوں روزنامہ جنگ کے ادارتی صفحات کی زینت بنے ہیں جن میں شریعت بِل کے حوالہ سے چند نکات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان مضامین کے اہم نکات کا مختصر جائزہ لے لیا جائے تاکہ تصویر کے دونوں رخ قارئین کے سامنے رہیں اور انہیں کسی نتیجہ تک پہنچنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

جناب ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے مضمون میں جن نکات پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، وہ یہ ہیں:

- تحریکِ پاکستان میں عوام نے علماء کی سوچ کو مسترد کر کے علامہ محمد اقبال اور قائداعظم کی سوچ کو اپنایا تھا، اس لیے پاکستان میں اسلام کا نفاذ علماء کی بجائے علامہ اقبال اور قائداعظم کی سوچ اور فکر کے مطابق ہونا چاہیے۔
- عصرِ حاضر کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق اسلامی احکام میں وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے اور علماء مختلف وجوہ کی بنا پر اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں رہے، اس لیے دین کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کے تمام تر اختیارات منتخب پارلیمنٹ کے حوالہ کر دینے چاہئیں۔
- پارلیمنٹ کی بالادستی سے شریعت کی توہین ہوتی ہے اور شریعت کی بالادستی سے پارلیمنٹ کی خود مختاری مجروح ہوتی ہے، اس لیے قانون نفاذِ شریعت میں "قطع و برید" کر کے کوئی درمیانی راہ نکالنی چاہیے۔

جب کہ جناب ملک امجد حسین ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے زیادہ نکات درج ذیل ہیں:

- قراردادِ مقاصد میں کسی جگہ بھی شریعت کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، اس لیے شریعت بِل کا

قراردادِ مقاصد کے ساتھ تعلق جوڑ کر علمائے کرام قراردادِ مقاصد کی غلط تشریح کر رہے ہیں۔

- جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے قراردادِ مقاصد کو آئین کا واجب العمل حصہ بنا کر غلطی کی ہے کیونکہ سیاسی حالات کے مدّ و جزر میں آئین کے ٹوٹنے اور معطل ہونے کا خطرہ رہتا ہے، اس لیے قراردادِ مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر اسے بھی معرض خطر میں ڈال دیا گیا ہے۔

جہاں تک تحریکِ پاکستان میں علماء کی سوچ کو عوام کی طرف سے مسترد کیے جانے کا تعلق ہے، ہمیں افسوس ہے کہ تاریخی حقائق اس دعوے میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال کا ساتھ نہیں دے رہے، کیونکہ علماء کے ایک طبقہ نے تحریکِ پاکستان کی ضرور مخالفت کی تھی اور وہ اپنی اس مخالفت پر کسی قسم کا نقاب ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، لیکن علماء ہی کا ایک بہت بڑا طبقہ تحریکِ پاکستان کے ہراول دستہ کے طور پر قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں شریک تھا۔ آخر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تحریکِ پاکستان میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ اور ان کے ہزاروں رفقاء کے وجود کو کس طرح نظر انداز کر جاتے ہیں جو نہ صرف تحریکِ پاکستان کی صفِ اول میں شامل تھے بلکہ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں پاکستان کے حق میں ریفرنڈم جیتنے میں انہی علماء کا رول بنیادی اور فیصلہ کن رہا ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو حقائق کی بالکل صحیح ترجمانی ہوگی کہ تحریکِ پاکستان کے نظریاتی اور اسلامی تشخص پر عوام کا اعتماد انہی علماء و مشائخ کی بدولت قائم ہوا تھا۔ پھر یہ کہنا کہ علامہ محمد اقبالؒ اور قائداعظمؒ اسلام کی تعبیر و تشریح کے بارے میں جمہور مسلمانوں سے ہٹ کر کسی نئے فکر کے داعی تھے، ان دونوں شخصیات کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ علامہ محمد اقبالؒ نے دین کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کی عمومی ضرورت کے حوالہ سے اپنے خیالات و افکار پیش کیے ہیں جو عام علماء کے موقف سے مختلف ہیں، لیکن انہوں نے ان افکار و خیالات کو فقہی مذہب اور نئے فکر کے طور پر کبھی پیش نہیں کیا اور نہ ہی اس پر اصرار کیا ہے کہ ان کے خیالات کو من وعن قبول کر لیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس ضمن میں علامہ محمد اقبالؒ کے افکار کی حیثیت تجاویز کی ہے جو انہوں نے علمی حلقوں کے سامنے پیش کیں اور علمی حلقوں کا اجتماعی طرزِ عمل شاہد ہے کہ انہوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے تمام تر احترام کے باوجود ان تجاویز کو قبول نہیں کیا، لیکن اس توازن کے ساتھ کہ نہ تو ان شاذ افکار کی بنیاد پر علامہ محمد اقبالؒ کو اپنے روایتی طرزِ تنقید کا ہدف بنایا ہے

اور نہ ہی ان کے افکار کو من وعن قبول کیا ہے۔

جمہور اہلِ علم کے اس حق سے ڈاکٹر جاوید اقبال بھی انکار نہیں کریں گے کہ وہ کسی بھی سوچ اور فکر کو، خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت کی طرف سے آئی ہو، دین وعلم کے مسلّمہ اصول وضوابط سے ہٹا ہوا دیکھیں تو اسے قبول کرنے میں احتیاط سے کام لیں۔ کیونکہ جب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب علامہ محمد اقبالؒ کے حوالہ سے اپنے لیے یہ حق مانگتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متفقہ اور اجماعی فیصلوں کو مصلحت وقت کے موافق نہ پائیں تو قبول نہ کریں، تو علامہ محمد اقبالؒ کی کسی سوچ اور رائے کی حیثیت صحابہ کرامؓ کے اجماع سے زیادہ تو نہیں ہے کہ اسے ہر صورت قبول کرنے پر اصرار کیا جائے اور کسی کو اس سے اختلاف کا حق نہ دیا جائے۔ پھر جب بات جمہوریت کی ہے تو یہ اصول اہلِ علم کے لیے کیوں نہیں ہے اور ملک کے جمہور اہلِ علم اور اہل دین کے مقابلہ میں ایک شخصی رائے پر اصرار کیوں کیا جارہا ہے؟

بہرحال ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ محمد اقبالؒ دین میں تعبیر وتشریح کے حوالہ سے کسی نئے فقہی مذہب اور مکتبِ فکر کے بانی اور داعی نہیں تھے، نہ انہوں نے اس کا دعویٰ کیا، نہ اس کے لیے حلقہ بنایا اور نہ ہی عامۃ الناس کو دعوت دی کہ وہ علماء کی بیان کردہ تشریح دین کو مسترد کرکے ان کے اس مبینہ مکتبِ فکر کو قبول کریں۔ بات صرف اتنی تھی کہ علامہ محمد اقبالؒ نے ایک مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ اپنے افکار وخیالات کو تجاویز کی صورت میں اہلِ علم کے سامنے پیش کیا لیکن جمہور اہلِ علم نے مرحوم کے خلوص، جذبہ خیر خواہی اور احترام کے باعث انہیں خاموشی کے ساتھ نظر انداز کر دیا جس سے بات ختم ہوگئی۔ لیکن اب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب تاریخ کے حوالے ہو جانے والے اس مسئلہ کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے ہیں اور اپنے قابلِ صد احترام مرحوم والد کے کندھے پر رکھ کر ایک نئے مکتبِ فکر کے قیام کی بندوق داغنے کے درپے ہیں یہ تو خود علامہ محمد اقبالؒ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

باقی رہی بات تحریکِ پاکستان کی تو یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تحریکِ پاکستان کا اسلامی اور نظریاتی تشخص مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبد الحامد بدایونیؒ، پیر صاحب مانکی شریفؒ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ اور ان کے اہلِ علم رفقاء سے وابستہ ہے، اس لیے پاکستان میں اسلام کی تعبیر وتشریح انہی اصول وضوابط کے مطابق ہوگی جن کے یہ مذکورہ بالا اہلِ علم داعی ہیں اور وہ اصول وضوابط ان حضرات کے طے کردہ نہیں ہیں، بلکہ چودہ سو سال سے امت کا اجماعی تعامل انہی

اصولوں پر ہے اور آج بھی پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام کے جمہور اہلِ علم ان اصول وضوابط کو تسلیم کرتے ہیں۔

اب آئیے اجتہاد کی عمومی ضرورت اور پارلیمنٹ کو اس کا حق دینے کے سوال کی طرف۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ آج کے دور میں بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر وسیع تر اجتہاد کی ضرورت ہے، علماء بھی اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، بلکہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اجتہاد کر بھی رہے ہیں۔ ملک کے ہر بڑے جامعہ اور دارالعلوم میں دارالافتاء موجود ہے اور مفتیان کرام روزمرہ پیش آمدہ مسائل وامور پر فتوے جاری کر رہے ہیں۔ ان فتاویٰ میں جمود نہیں ہے بلکہ اجتہاد وتحرک پوری طرح کارفرما ہے۔ مفتیان کرام عمومی ضروریات اور مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے پیش رو فقہائے کرام کے فیصلوں سے اختلاف بھی کر رہے ہیں اور بوقت ضرورت دوسرے فقہی مذاہب کے فیصلوں کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نئی آرا بھی قائم کر رہے ہیں۔ دینی اداروں کے شعبہ ہائے فتاویٰ سے ہٹ کر قومی سطح پر اسلامی نظریاتی کونسل کے پلیٹ فارم پر نفاذ اسلام کے لیے جو علمی کام گزشتہ دس سال کے دوران ہوا ہے، اس میں تمام مکاتبِ فکر کے علمائے کرام نے مل بیٹھ کر پیش آمدہ مسائل کا حل نکالا ہے، مسودات قانون ترتیب دیے ہیں اور متعدّد نئے فقہی نکات اٹھائے ہیں۔

اجتہاد اسی کا نام ہے اور اجتہاد کا یہ عمل انفرادی اور اجتماعی سطح پر جاری وساری ہے، جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت میں علمائے کرام نے اجتہاد اور تعبیر دین کے اس عمل میں جدید قانون دان حضرات کے ساتھ اشتراک کو فراخ دلی کے ساتھ قبول کیا ہے اور مل جل کر اجتہاد کے اس عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ''شریعت بل'' کے ذریعے قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کے تمام تر اختیارات وفاقی شرعی عدالت کے حوالے کر دیے ہیں جس میں عصری قانونی ماہرین کو علماء پر عددی برتری حاصل ہے۔ یہ متواتر پیشرفت اس امر کی شاہد ہے کہ علماء نہ تو فقہی جمود کے قائل ہیں، نہ اجتہاد کی راہ میں رکاوٹ ہیں، اور نہ ہی اجتہاد اور تعبیر دین پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے درپے ہیں۔ البتہ وہ یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ اجتہاد کے عمل کو صحیح طور پر آگے بڑھانے کے لیے دو امور کی پابندی بہرحال ضروری ہے: ایک اجتہاد کا دائرہ کار اور دوسرا اجتہاد کی اہلیت۔ کیونکہ ان دو باتوں کا لحاظ رکھے بغیر اجتہاد کے نام پر کیا جانے والا کوئی بھی عمل اجتہاد نہیں ہوگا، بلکہ الحاد اور زندقہ کی حدود میں داخل ہو جائے گا۔

اجتہاد کا دائرہ کار خود جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ والی حدیث میں متعیّن فرمادیا ہے کہ جس مسئلہ میں قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی واضح حکم نہ ہو اس میں مجتہد کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن وسنت کے صریح احکام دائرہ اجتہاد سے خارج ہیں اور ان میں اجتہاد کے نام پر کسی قسم کے ردوبدل کی گنجائش نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص یا ادارہ قرآن وسنت کے کسی صریح حکم کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اور اسے ''اجتہاد'' کا نام دیتا ہے تو علماء اسے تسلیم نہیں کرتے اور اسے الحاد قرار دیتے ہیں، لیکن ہمارے مہربانوں کو شکوہ ہے کہ علماء جمود کے قائل ہیں اور اجتہاد سے انکار کر رہے ہیں۔

اجتہاد کے ضمن میں دوسرا بنیادی پہلو ''اہلیت'' کا ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت ضروری ہے۔ ایک شخص جو قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیث رسول کا کوئی جملہ پڑھ کر براہ راست اس کا مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہے، اسے قرآن وسنت کا شارح تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جس پر کسی دلیل اور بحث کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ امام ولی اللہ دہلویؒ نے تو اجتہاد کے لیے قرآن وسنت سے واقفیت کا بہت بلند معیار بیان کیا ہے اور ''ازالۃ الخفاء'' میں اجتہاد کی اہلیت کے لیے ایک درجن سے زائد علوم کی مہارت کو شرط قرار دیا ہے۔ ان کی یہ بات بالکل منطقی اور معقول ہے جس کی تفصیل میں جائے بغیر صرف ایک مثال سے ہم اپنے موقف کو واضح کریں گے۔

امام ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیگر ضروری علوم کی مکمل مہارت کے ساتھ ساتھ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور حالات زندگی پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ کیونکہ بسا اوقات اس کے سامنے کسی مسئلہ میں جناب نبی اکرمؐ کے دو یا تین متفاوت ارشادات یا عمل آئیں گے، اس نے ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ان میں سے آخری عمل کو ناسخ قرار دے کر قبول کرے گا اور باقی کو منسوخ سمجھے گا۔ اب وہ آخری عمل کا فیصلہ کیسے کرے گا؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے جناب رسالت مآبؐ کے ارشادات اور احوال سے اس قدر واقفیت حاصل ہو کہ وہ آپ کے اعمال میں واقعاتی ترتیب قائم کر سکے اور یہ فیصلہ کر سکے کہ پہلا عمل کون سا ہے اور آخری عمل کون سا ہے، اس کے بغیر یہ فیصلہ کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ صرف ایک مثال ہے جو بات سمجھانے کے لیے عرض کی گئی، ورنہ جن چودہ علوم کو حضرت شاہ

ولی اللہ دہلویؒ نے اجتہاد کی اہلیت کے لیے شرط قرار دیا ہے، ان میں سے ہر علم مجتہد کے لیے منطقی اور بدیہی طور پر اسی طرح ضروری ہے۔ اس پس منظر میں جب پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کی بات کی جاتی ہے تو علماء کو اس میں تامل ہوتا ہے اور وہ تامل بلاوجہ نہیں ہے کیونکہ ہمارے ہاں پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے ضروری علوم کی مہارت تو کجا، قرآن کریم کو سادہ ترجمہ کے ساتھ سمجھنا بھی شرط نہیں ہے۔ آخر ایک ایسے ادارہ کے لیے، جس کے ارکان کی غالب اکثریت قرآن و سنت سے ناواقف ہے اور جس کی رکنیت کے لیے قرآن کریم کا سادہ ترجمہ جاننا بھی شرط نہیں، قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کا حق علماء آخر کیسے تسلیم کر لیں؟

پھر اہلیت کا یہ صرف ایک پہلو ہے کہ اجتہاد کا حق صرف اسے ہے جسے ضروری علوم پر مہارت حاصل ہو۔ اس کا دوسرا پہلو خدا خوفی اور تقویٰ کا بھی ہے جو علمی اہلیت کے ساتھ اسی سطح پر ضروری ہے۔ ہمارے فقہاء کے ہاں تو خدا خوفی اور تقویٰ کا یہ معیار رہا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ اپنے قرض خواہ کے مکان کی دیوار کے سائے میں کھڑا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے کہ اس طرح قرض کے ساتھ سایہ دیوار میں کھڑا ہونے کا نفع شامل ہو جائے گا جو سود بن سکتا ہے۔ ان مجتہدین کے اجتہاد کا حق ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب اس پارلیمنٹ کے حوالہ کرنا چاہتے ہیں جس کی ''ہارس ٹریڈنگ'' کے قصے دنیا بھر میں ہماری قومی رسوائی کا باعث بن رہے ہیں۔ لیکن علماء کو اس سے بھی انکار نہیں ہے، اگر وہ وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کے لیے اجتہاد کا حق تسلیم کر سکتے ہیں تو پارلیمنٹ کے سامنے سپر انداز ہونے میں بھی انہیں کوئی حجاب نہیں ہے۔ البتہ اجتہاد کے دائرہ کار اور اہلیت کے اصولوں سے دستبردار ہونے کے لیے وہ کسی صورت میں تیار نہیں ہیں اور اس کے لیے دو امور کو آئینی طور پر قطعیت کے ساتھ طے کرنا ہوگا۔ ایک یہ کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے صریح احکام میں ردوبدل کی مجاز نہیں ہوگی اور دوسرا یہ کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن و سنت کی ضروری واقفیت شرط ہوگی۔

محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ان دو امور کو تسلیم کر لیں تو پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے کے بارے میں ان کے موقف کو قبول کرنے کے لیے ہم تیار ہیں، بلکہ اجتہاد کی اہلیت کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی بیان کردہ سخت شرائط پر بھی ہمیں زیادہ اصرار نہیں ہوگا۔ اور اس ضمن میں بھی ہم اسلامی نظریاتی کونسل یا وفاقی شرعی عدالت کا یہ استحقاق تسلیم کرتے ہیں کہ وہ پارلیمنٹ کو قرآن و

سنت کی تعبیر وتشریح اور اجتہاد کا حق دینے کا مقصد سامنے رکھ کر پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن و سنت سے واقفیت کا معیار طے کر دیں۔ لیکن ان بنیادی امور کو ملحوظ رکھے بغیر اگر پارلیمنٹ کو قرآن و سنت کی تعبیر وتشریح کا حق دیا جاتا ہے اور پارلیمنٹ اسے استعمال کرتی ہے تو ہمارے نزدیک پاپائے روم کی بائبل میں ردوبدل کا حق رکھنے والی کونسلوں کے فیصلوں، اکبر بادشاہ کے درباری اجتہاد کے ذریعے وجود میں آنے والے دین الٰہی، اور اجتہاد کے غیر مشروط حق سے بہرہ ور منتخب پارلیمنٹ کے فیصلوں میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔

اب ہم تیسرے نکتے کی طرف آتے ہیں جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے پارلیمنٹ اور شریعت میں سے کسی ایک کی بالادستی کی صورت میں دوسرے کی حیثیت مجروح ہونے کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس طرح علماء کے اس موقف کو پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پارلیمنٹ کی مکمل بالادستی کی صورت میں شریعت کی بالادستی نہیں رہتی اور یہ نہ صرف شریعت کی توہین ہے بلکہ ایک عام مسلمان کے بنیادی عقیدہ کے بھی منافی ہے۔ لیکن اس کا حل ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے قانون نفاذِ شریعت پر پارلیمنٹ کی بالادستی بہرحال قائم رکھنے کی صورت میں تجویز کیا ہے اور اس میں کسی قسم کی لچک کے روادار نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے اس موقف سے اختلاف ہے کیونکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا بنیادی عقیدہ ہے کہ قرآن و سنت کو دنیا کے ہر ادارے پر بالادستی حاصل ہے اور کوئی منتخب یا غیر منتخب ادارہ ایسا نہیں ہے جسے قرآن و سنت کے احکام پر بالادستی دی جا سکے۔

اب ہم ملک امجد حسین صاحب ایڈووکیٹ کے اٹھائے ہوئے دو نکات کی طرف آتے ہیں۔ ان کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ قراردادِ مقاصد میں ''شریعت'' کا لفظ تک نہیں ہے تو شریعت بل کے لیے اس کا حوالہ کیوں دیا جا رہا ہے؟ مگر یہ بات انتہائی سطحی ہے جس کی اتنے بڑے قانون دان سے کم از کم ہمیں توقع نہیں تھی۔ ''شریعت'' کی اصطلاح خود قرآن کریم کی ارشاد فرمودہ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> ثم جعلناک علٰی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون۔ (الجاثیہ ۱۸)
>
> ''پھر ہم نے آپ کو دین کے بارے میں شریعت پر قائم کیا ہے، پس آپ اس کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔''

اور قراردادِ مقاصد کے دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

۱. مملکت جملہ حقوق و اختیارات حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے جس میں اصول جمہوریت و حریت و مساوات و رواداری اور عدل عمرانی کو، جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے، پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

۲. مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ انفرادی و اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق، جو قرآن مجید اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں متعیّن ہیں، ترتیب دے سکیں۔

اب آپ خیال فرمائیے کہ قراردادِ مقاصد نے دستوری طور پر اسلام کی تشریحات اور قرآن وسنت کی تعلیمات کی پابندی کو ضروری قرار دیا ہے اور قرآن کریم نے "شریعت" کی پیروی کا حکم دیا ہے تو شریعت کے قرآنی حکم کو اختیار کرنا قراردادِ مقاصد ہی کی تکمیل نہیں تو اور کیا ہے؟

قراردادِ مقاصد ایک اصولی دستاویز ہے۔ ملک میں اسلامائزیشن کے لیے جتنے اقدامات بھی ہوں گے، اس قراردادِ مقاصد پر عملدرآمد میں پیشرفت شمار ہوں گے۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ قراردادِ مقاصد میں ان سب کا تفصیلاً ذکر بھی ہو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سپریم کورٹ نے قصاص و دیت آرڈیننس جاری کرنے کا حکومت کو پابند کیا ہے اور حکومت چند روز تک آرڈیننس لا رہی ہے۔ اب کوئی شخص یہ کہے کہ قراردادِ مقاصد میں تو "حدود و قصاص" کا لفظ نہیں ہے اس لیے اس آرڈیننس کے سلسلے میں قراردادِ مقاصد کا حوالہ نہ دیا جائے، تو یہ بالکل غلط بات ہوگی۔ کیونکہ حدود و قصاص کے قانون کا نفاذ بلاشبہ قراردادِ مقاصد کی اس شق پر عملدرآمد ہوگا جس میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اسلامی تعلیمات کی پابندی کی ضمانت دی گئی ہے۔

رہا دوسرا نکتہ کہ قراردادِ مقاصد کو آئین کا عملی حصہ بنا کر معرضِ خطر میں ڈال دیا گیا ہے تو یہ خدشہ سابقہ تجربات کی بنیاد پر بے بنیاد ہے، کیونکہ پاکستان میں آئین ٹوٹنے اور نئے دستور ترتیب پانے کا افسوسناک عمل اگرچہ متعدّد بار دہرایا گیا ہے، لیکن قراردادِ مقاصد کو کوئی دستور بھی نظر انداز نہیں کر سکا اور ہر آئین میں اسے شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح ۱۹۴۹ء میں پہلی دستور ساز اسمبلی میں منظور ہونے والی قراردادِ مقاصد کو ملک کی ایک بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جسے کسی بھی دور میں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

قراردادِ مقاصد میں پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کو ہمیشہ کے لیے طے کر دینے کے علاوہ خدا کی حاکمیت، قرآن و سنت کی بالادستی، اور اسلامی احکام کی عملداری کی ضمانت دی گئی ہے، اور اسلامائزیشن کی ایک مستحکم اور مضبوط آئینی بنیاد فراہم کر دی گئی ہے۔ جنرل محمد ضیاءالحق مرحوم کی طرف سے قراردادِ مقاصد کو دستور کا باضابطہ حصہ قرار دیے جانے سے قبل قراردادِ مقاصد کو ۱۹۷۳ء سمیت تمام دساتیر میں محض دیباچہ کی حیثیت سے بطور تبرک شامل کیا جاتا رہا ہے، جس پر عملدرآمد آئینی لحاظ سے ضروری نہیں تھا، مگر جنرل محمد ضیاءالحق مرحوم نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے تحت حاصل شدہ اختیارات کی رو سے قراردادِ مقاصد کو آئین کا باضابطہ اور قابلِ عمل حصہ بنادیا جو قراردادِ مقاصد کا اصل دستوری مقام ہے اور بلاشبہ یہ جنرل محمد ضیاءالحق مرحوم کا ایک اہم کارنامہ ہے۔

ماہنامہ ”نوائے قانون“ (سود نمبر)

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - ادسمبر ۱۹۹۱ء)

اسلامی قوانین اور ان سے متعلقہ مسائل و امور پر اسلام آباد سے ”نوائے قانون“ کے نام سے ایک ماہوار جریدہ گزشتہ دو سال سے شائع ہو رہا ہے جس کی ادارت کی ذمہ داریاں جناب ڈاکٹر عبد المالک عرفانی کے سپرد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی قانون اور اس کے اسلامی تقاضوں پر گہری نظر ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل میں قوانین اسلامی کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں ان کی خدمات وقیع ہیں۔

زیر نظر شمارہ میں انہوں نے بڑی کاوش کے ساتھ سود اور اس سے متعلقہ امور پر ممتاز اصحاب قلم کی نگارشات اور اسلامی نظریاتی کونسل کی بعض اہم رپورٹیں یکجا شائع کر دی ہیں، جن سے اس شمارہ کو ایک اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ شمارہ ایک سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے جس کی قیمت تیس روپے ہے۔ جبکہ نوائے قانون کا سالانہ زر خریداری ڈیڑھ سو روپے ہے اور اسے دفتر ماہنامہ نوائے قانون، کمرہ ۶، پہلی منزل، ہاشم پلازا، ایف ۸ مرکز، اسلام آباد سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

صدر پاکستان جناب غلام اسحاق خان کے نام کھلا خط

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور۔ ۲۰ مارچ ۱۹۹۲ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بگرامی خدمت عزت مآب جناب غلام اسحاق خان صاحب، صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

گزارش ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا قیام اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور قرآن وسنت کے احکام کے عملی نفاذ کے لیے عمل میں لایا گیا تھا اور دستورِ پاکستان میں غیر اسلامی قوانین کے خاتمہ اور اسلامی احکام کی عملداری کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن ملک کے معاشی ڈھانچے کو سود کی لعنت سے ابھی تک نجات نہیں دلائی جا سکی جسے قرآن وسنت میں واضح طور پر حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے، جو ایک آئینی ادارہ ہے، ۱۹۸۰ء میں سودی نظام کے خاتمہ اور بلاسود بینکاری کے عملی ڈھانچہ پر مشتمل ایک تفصیلی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی تھی جس کی پیشانی پر ”صرف سرکاری استعمال کے لیے“ کا لیبل چسپاں ہے اس وجہ سے وہ منظر عام پر نہیں آسکی۔

اسی طرح وفاقی شرعی عدالت نے ملک میں رائج تمام سودی قوانین کو قرآن وسنت کے منافی قرار دیتے ہوئے حکومت پاکستان کو ۳۰ جون ۱۹۹۲ء تک متبادل اسلامی قوانین نافذ کرنے کی ہدایت کی ہے لیکن حکومت اس ہدایت پر عمل کرنے میں سنجیدہ نظر نہیں آتی اور اس کے وزراء مسلسل بیانات میں یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ سود کا کوئی متبادل نظام موجود نہیں ہے۔ حالانکہ اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے میں متبادل بلاسود معاشی وبینکاری نظام کے بارے میں تمام تفصیلات موجود ہیں۔

اس موقع پر آنجناب کے ایک تاریخی خطاب کا حوالہ دینا ضروری خیال کرتا ہوں جو آپ نے ۱۹۸۴ء میں وفاقی وزیر خزانہ کی حیثیت سے بجٹ پیش کرتے ہوئے کیا تھا اور فرمایا تھا کہ

> ”بینکاری نظام سے ربا کے خاتمہ کے لیے ٹھوس اور جامع پروگرام اسٹیٹ بینک اور قومی کمرشل بینکوں کے مشورہ سے وضع کیا گیا ہے اور اس پروگرام کا اطلاق تمام

بینکوں اور مالیاتی اداروں بشمول غیر ملکی بینکوں کے ہو گا۔

یکم جنوری ۱۹۸۵ء سے بینکاری نظام حکومت کو اور سرکاری کارپوریشنوں اور سرکاری و نجی جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کو جو سرمایہ فراہم کرے گا یہ تمویل کے اسلامی اصولوں کے عین مطابق ہو گا۔ جولائی ۱۹۸۴ء سے یکم جنوری ۱۹۸۵ء تک کے عبوری دور میں بینکوں کو بامر مجبوری اسلامی ذرائع تمویل کے ساتھ ساتھ سود پر مبنی ذرائع کو بھی جاری رکھنا پڑے گا تاہم انہیں اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ سود کی بنیاد پر کوئی تمویل چھ ماہ سے زیادہ عرصے کے لیے جاری کر سکیں یا موجودہ تمویل کی چھ ماہ سے زیادہ عرصہ کے لیے تجدید کر سکیں۔ چھ ماہ یہ عبوری دور اس لیے ضروری ہے کہ متعلقہ قوانین میں ضروری ترامیم کی جا سکیں، حساب کتاب رکھنے کے لیے مناسب طریق کار وضع کیا جائے اور بینک اپنے عملہ کی تربیت کے ساتھ ساتھ تیاریاں مکمل کر لیں۔

اس کے تین ماہ بعد یکم اپریل ۱۹۸۵ء سے کسی فرم اور فرد واحد کے لیے مہیا کیے جانے والے سرمایہ کو بھی اسلامی ذرائع تمویل کے تحت کر دیا جائے گا۔ اس طرح یکم اپریل ۱۹۸۵ء تک قرضہ اور تمویل کے تمام لین دین کے حساب اسلامی اصولوں کے مطابق ہو جائیں گے اور ماسوائے ان قرضوں کے جو ماضی میں دیے گئے ہوں، یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے بینک سود کی بنیاد پر امانتیں قبول نہیں کریں گے۔ بچت کی اور میعادی امانتیں نفع اور نقصان میں شراکت کی بنیاد پر ہوں گی، کرنٹ اکاؤنٹ کی رقومات بدستور امانت تصور کی جائیں گی اور ان پر کوئی نفع نقصان نہیں ہو گا۔ اسلامی ذرائع تمویل کا اطلاق زرعی شعبے پر بھی ہو گا جس میں امداد باہمی کے قرضوں کا نظام بھی شامل ہے۔

یکم جولائی ۱۹۸۵ء سے اسٹیٹ بینک کا کمرشل بینکوں اور حکومت کے ساتھ لین دین بھی تمویل کے نئے اسلامی ذرائع کے مطابق ہو گا۔ اسٹیٹ بینک کو یہ اختیار بھی دیا جائے گا کہ بینک اور مالیاتی ادارے جو تجارتی اور سرمایہ کاری لین دین کریں گے اس کے لیے ان پر کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ منافع کی شرح بشرط ضرورت مقرر کرے۔ بینک اپنے کاروبار میں جو مختلف قسم کے لین دین کریں گے ان کے لیے اسلامی طریقہ

کار اور ذرائع کی نشاندہی کر لی گئی ہے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۱۵ جون ۱۹۸۴ء)

آنجناب کی ۱۹۸۴ء میں بحیثیت وزیر خزانہ بجٹ تقریر کا طویل اقتباس صرف اس لیے اس عریضہ میں شامل کیا گیا ہے کہ وہ تمام مراحل ایک بار پھر آپ کے سامنے آجائیں جن سے حکومت پاکستان آپ ہی کی سعی و نگرانی کے ساتھ بلاسود معاشی نظام کی تشکیل کے مرحلہ تک ۱۹۸۴ء میں پہنچ چکی تھی لیکن بدقسمتی سے آج ۱۹۹۲ء میں بھی وہ تشکیل شدہ نظام اسلامی جمہوریہ پاکستان کو عملاً نصیب نہیں ہو سکا۔ اور موجودہ وزیر خزانہ اور دیگر وفاقی وزراء علماء کرام کو غیر سودی معاشی نظام پیش نہ کر سکنے کا ملزم ٹھہرا کر سودی نظام کو جاری رکھنے پر مسلسل زور دے رہے ہیں۔

ان حالات میں آنجناب سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے ۱۹۸۴ء کے وعدہ کا پاس کرتے ہوئے قوم کو سودی نظام کی لعنت سے نجات دلانے میں موثر رول ادا کریں، اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کی اشاعت کی ہدایت فرمائیں اور سود کی حمایت میں علماء کرام کے خلاف بیان بازی کرنے والے وفاقی وزراء کے منفی بیانات کا نوٹس لیں۔ امید ہے کہ آپ اس درخواست پر سنجیدگی کے ساتھ غور فرماتے ہوئے جواب سے بھی نوازیں گے۔

شکریہ، والسلام۔ ابوعمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

پارلیمنٹ کے لیے اجتہاد کی اہلیت کا معیار

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جون و جولائی ۱۹۹۲ء)

......گزشتہ دنوں محترم جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دیا جائے اور قوم کے منتخب نمائندے مل بیٹھ کر اجتہادی امور پر فیصلہ دیں۔ ہم نے اس تجویز سے اتفاق کیا تھا اور عرض کیا تھا کہ صرف ایک شرط کے ساتھ ہم اس تجویز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں کہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی مطلوبہ اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ جس پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا بھی شرط نہیں ہے، اسے قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح اور اجتہاد کی ذمہ داری سونپ دینا قرآن و سنت کے ساتھ تو مذاق ہو گا ہی، خود اس پارلیمنٹ کے ارکان پر صریح ظلم ہو گا۔ ہاں اگر الیکشن رولز میں ترمیم کر کے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کو شرط قرار دے دیا جائے تو ہمیں پارلیمنٹ کو اجتہاد کا حق دینے اور اسے بخوشی تسلیم کرنے میں کوئی حجاب نہیں ہو گا۔ جبکہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے اجتہاد کی اہلیت کا معیار بھی ہم تجویز نہیں کرتے، سپریم کورٹ، وفاقی شرعی عدالت، اور اسلامی نظریاتی کونسل، تینوں باوقار آئینی ادارے ہیں، ان میں سے کسی ایک ادارے سے استصواب کر لیا جائے وہ اجتہاد کی اہلیت کے لیے جو معیار مقرر کرے اسے پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے شرط بنا دیا جائے۔ اس اصولی اور ناگزیر منطقی تقاضے کو نظر انداز کر کے اجتہاد کے نام پر جو عمل کیا جائے گا وہ بنی اسرائیل کے عمل تحریف سے مختلف نہیں ہو گا۔......

پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے
وفاقی وزارت مذہبی امور کی سفارشات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ جولائی ۱۹۹۴ء)

ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے حکومت کی ہدایت پر وزارت مذہبی امور نے سفارشات پر مبنی تفصیلی رپورٹ مرتب کی ہے جس میں نفاذِ شریعت کے لیے دستوری تقاضوں، عدل وانصاف، تعلیم، معیشت، ذرائع ابلاغ، اصلاح جیل خانہ جات، معاشرتی اور دفتری اصلاحات کے حوالے سے تفصیلی سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ وزارت نے یہ رپورٹ ملک کی مذہبی تنظیموں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی مدد سے تیار کی ہے۔ اس رپورٹ کو کابینہ اپنے آئندہ اجلاس میں غور کرنے کے بعد پارلیمنٹ میں پیش کرے گی اور ملکی آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے دستور میں ترمیم کرنے کی تجویز پارلیمنٹ میں پیش کرے گی۔ جو سفارشات کی گئی ہیں ان کی تفصیلات یہ ہیں۔

دستوری سفارشات میں آئین کے آرٹیکل ۲ میں ترمیم کرنے کا کہا گیا ہے۔ اس میں ترمیم کر کے آرٹیکل ۲ کو ۲ (ا) لکھا جائے گا۔ آرٹیکل ۲ (۲) اسلام کے احکام جو قرآن کریم اور سنت رسول میں منضبط ہیں، پاکستان کا سپریم لاء قرار پائیں گے۔ آرٹیکل ۲ (۳) آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کی دفعہ ۲ (۳۰) اور ۲۲۷ (۲) میں شامل کسی امر کے باوجود کوئی قانون بشمول دستور کے یا کوئی رسم ورواج جو قانون کا حکم رکھتا ہو، تناقض کی اس حد تک کالعدم ہوگا جس حد تک وہ قرآن وسنت میں منضبط احکام اسلام کا مناقض ہو۔ آرٹیکل (۴) مملکت کوئی ایسا قانون وضع نہیں کرے گی جو کہ قرآن کریم اور سنت رسول میں منضبط احکام اسلام سے متصادم، متناقض یا ان کے منافی ہو۔ یا کوئی قانون جو اس شق کی خلاف ورزی میں وضع کیا گیا ہو، وہ خلاف ورزی کی حد تک کالعدم ہوگا۔ دستوری سفارشات کے مطابق آئین کی دفعہ ۲۰۳ (بی) کی شق (سی) کو حذف کر کے اس شق کا اضافہ کیا جائے کہ قانون میں دستور یا ہر وہ رسم ورواج شامل ہے جو قانون کا اثر رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ دفعہ ۲۰۳ (سی) کی شق (۹) کو حذف کر کے اس میں اس شق کا اضافہ کیا جائے کہ چیف جسٹس یا کوئی جج اس وقت تک اپنے عہدے پر فائز

رہے گا جب تک اس کی عمر ۷۰ سال کو نہ پہنچ جائے، سوائے اس کے کہ وہ یا تو خود اپنے عہدے سے استعفیٰ دے یا دستور کے مطابق اس کو اپنے عہدے سے ہٹا دیا جائے۔

عدل و انصاف کے متعلق رپورٹ نے اپنی سفارشات میں کہا ہے کہ عدالتی نظام میں تبدیلی وقت کی اہم اور فوری ضرورت ہے۔ معاشرے میں تبدیلی کے لیے مؤثر عدالتی نظام کو رائج کرنا ہو گا۔ پاکستان میں نفاذِ شریعت کا عمل عدل و انصاف کے نظام میں تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ضمن میں ۵ تجاویز دی گئی ہیں:

۱. صوبائی، ضلعی اور تھانے کی سطح پر قاضی اور مفتی مقرر کیے جائیں۔
۲. سستا اور فوری انصاف مہیا کیا جائے، کورٹ فیس ختم کی جائے، اپیل کے زیادہ چینل ہوں۔
۳. قاضی جلد فیصلہ کرے اور تمام عدالتی مراحل میں سے گزر کر مقدمات کے حتمی و قطعی فیصلے کے لیے زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال مقرر کی جائے۔
۴. اسلام کا نظام احتساب بغیر کسی استثنا کے نافذ کیا جائے جو مرکز اور صوبائی سطح سے لے کر تھانے اور دیہات کی سطح پر نافذ العمل ہو۔
۵. جرائم کی روک تھام کے لیے موقع پر انصاف مہیا کیا جائے۔ ضابطہ فوجداری میں طریقہ تفتیش کے بارے میں اور عدالتی نظام میں اہم ترمیمات کی اشد ضرورت ہے، اس ضمن میں قاضی کورٹس کے مسودہ بل سے استفادہ کیا جائے۔

تعلیم کے سلسلہ میں سفارشات پیش کی گئی ہیں کہ:

۱. تعلیمی اداروں میں بالخصوص اسکولوں میں کم از کم ایک نماز میں بچے باجماعت شریک ہوں۔
۲. طالبات کے لیے این سی سی ٹریننگ میں خاتون اساتذہ کا تقرر کیا جائے، بصورت مجبوری ریٹائرڈ معمر فوجیوں کو بھی مقرر کیا جا سکتا ہے۔
۳. علوم جدید اور علوم قدیم دونوں عمومی تعلیم اور دینی تعلیم کے حامل اداروں میں پڑھائے جائیں۔
۴. اسلامیات کی تعلیم کا معیار بلند کیا جائے اور اس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد کی ٹھوس تعلیمات اتنی مقدار میں پڑھائی جائیں کہ دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ہر طالب علم کے سامنے اسلام کی صحیح تصویر آجائے۔

۵. پانچویں جماعت تک ناظرہ تعلیم قرآن کریم کے لیے اسلامیات کے مضمون سے الگ مستقل وقت رکھا جائے اور اس مرحلے تک پورے قرآن کریم کی ناظرہ تدریس مکمل کرائی جائے۔
۶. عربی زبان کو اسلامیات کی تعلیم کا مستقل جزو بنایا جائے۔
۷. مخلوط تعلیم کو ختم کرنے کے لیے بلا تاخیر کم از کم مدت کا تعین کیا جائے جس میں ضروری انتظامی امور کی تکمیل کی جا سکے۔ اور طالبات کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو ان کی فطری ضروریات کے مطابق ہوں۔ دو خواتین یونیورسٹیوں کے قیام کے متعلق مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق کے اعلان کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔
۸. طلباء کو ایسی غیر نصابی سرگرمیوں کی اجازت نہ دی جائے جو اسلام کے خلاف ہوں مثلاً رقص و سرود اور مخلوط ڈرامے وغیرہ۔

معیشت کے بارے میں تجویز ہے کہ ملک کے نظام معیشت کو قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کیا جائے۔ نیز وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کی روشنی میں معیشت کے تمام شعبوں کو سود سے پاک کیا جائے اور متبادل اسلامی نظام معیشت قائم کیا جائے اور اس کے لیے ضروری قانونی ڈھانچہ فراہم کیا جائے۔ اس ضمن میں سفارشات میں کہا گیا ہے کہ:

۱. پاکستان میں بینکنگ اور مالیاتی ادارے مضاربہ اور مشارکہ کی بنیاد پر چلنے چاہئیں اور اس مقصد کے لیے ضروری قانونی ڈھانچہ فراہم کرنا ناگزیر ہے۔ لہٰذا مالی کاروبار کے ان طریقوں میں بنیادی اہمیت بلا سود شراکتی تعامل کو دی جائے۔
۲. موجودہ مارک اپ سسٹم دراصل سود کا دوسرا نام ہے، لہٰذا اسے ختم کیا جائے۔
۳. جدید معاشی نظام میں وینچر کیپٹل (زر مخطرہ) معیشت کی ترقی و فروغ کے لیے بنیادی محرک تسلیم کیا جاتا ہے۔ سرمایہ پیدا کرنے اور سرمایہ کاری کا اسلامی فلسفہ صرف وینچر کیپٹل کی اجازت دیتا ہے نہ کہ قرض پر دیے ہوئے پہلے سے طے کردہ سود کی سرمایہ کی۔ اسلام صرف قرض حسنہ دینے کی اجازت دیتا ہے۔
۴. مالی اداروں اور بینکوں میں مضاربت اور مشارکت کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت اپنے لین دین میں سود ختم کرنے کو یقینی بنائے۔
۵. بینکوں کا بااثر افراد کا قرضہ معاف کرنا شرعی لحاظ سے نہایت قابلِ اعتراض ہے کیونکہ یہ ان

لوگوں کی دولت ہے جو بینک میں پیسہ جمع کراتے ہیں۔ یہ اختیار بینکوں اور مالیاتی اداروں کی انتظامیہ سے لے کر صرف عدالتوں کو ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔

۶. فلسڈ ٹیکسیشن کا نظام رائج کیا جائے۔

۷. بیرونی سودی قرضوں کی ادائیگی کی خاطر پاکستانی پروجیکٹس کے حصص زرمبادلہ کے عوض بیچے جائیں اور اس طرح حاصل ہونے والے زر بیع سے غیر ملکی قرضے ادا کیے جائیں۔

۸. زکوٰۃ اور عشر کے موجودہ نظام میں اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔

۹. قرضِ حسنہ کو مجموعی طور پر اسلامی طریقہ کار کے مطابق رائج کیا جائے۔

۱۰. اسلام میں قرض معاف کرنے کی گنجائش سوائے قرضہ دینے والے کے کسی اور کو نہیں، اس لیے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک حکمرانوں کے کہنے پر جو قرضے معاف ہوئے ہیں وہ واجب الادا ہیں۔

ذرائع ابلاغ کے اغراض و مقاصد قوم کو تفریحی، تعلیمی، اخلاقی، قانونی، معاشرتی اور سیاسی شعور سے آگہی اور معلومات فراہم کرنا ہیں۔ قومی مقاصد اور اسلامی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے موعظہ حسنہ اور حکمت بالغہ سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔

۱. ذرائع ابلاغ کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ قوم کو نیکی، صداقت اور اچھائی کی طرف رہنمائی کریں۔

۲. ٹیلیویژن اور ریڈیو پر مخرب اخلاق ڈراموں، فلموں، گانوں اور خلاف اسلام پروگراموں کی نشر و اشاعت فی الفور بند کی جائے۔

۳. حکومت ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و رسائل کے متعلق ایسا اہتمام کرے جس کی رو سے جھوٹی خبر یا اطلاع دینا یا شائع کرنا قابلِ تعزیر ہو۔

۴. اخبارات و رسائل اور دیگر ذرائع ابلاغ عامہ کو ناشائستہ اور غیر اخلاقی اشتہارات اور مواد کی اشاعت سے روکا جائے۔

۵. مخرب اخلاق ویڈیو سنٹر بند کیے جائیں، ڈش انٹینا کے بنانے، لگانے، درآمد کرنے اور استعمال کرنے کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جائے۔

اصلاح جیل خانہ جات کے ضمن میں سفارشات کی گئی ہیں کہ:

۱. قیدیوں کے اخلاق اور دینی اصلاح کے لیے جیل میں مستند علمائے دین کا تقرر کیا جائے جو تبلیغ کا کام انجام دے سکیں۔

۲. جو مسلم قیدی صوم و صلوٰۃ اور اسلامی شعائر کے پابند ہوں اور قرآن مجید حفظ کریں تو ان کی قید کی مدت میں کمی کی جائے۔

۳. اسلام کے نظام حدود و تعزیرات کے مطابق سزائیں دی جائیں تاکہ جرائم کا خاتمہ ہو۔

معاشرتی اصلاحات کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

۱. ملک میں اسلام کے نظام حسبہ یعنی احتساب کو رائج کیا جائے۔

۲. لسانی اور علاقائی تنظیموں پر پابندی عائد کی جائے۔

۳. مساجد کو مسلمانوں کی اجتماعی تقریبات کا مرکز و محور بنایا جائے۔

۴. عورتوں کو شرعی ستر و حجاب کا پابند بنایا جائے۔

۵. حکومت یہ اہتمام کرے کہ میراث میں عورتوں کو شرعی حصہ ملے۔

۶. فرمان امتناع شراب میں جو منشیات رکھی گئی ہیں ان کو فی الفور ختم کیا جائے۔

دفتری اصلاحات کے لیے تجویز پیش کی گئی ہے کہ:

۱. دفاتر میں نظام صلوٰۃ کو مؤثر بنایا جائے۔

۲. تمام سرکاری و غیر سرکاری تقریبات میں رقص و سرود اور خلاف شرع امور کو ممنوع قرار دیا جائے۔

۳. بیوروکریسی اور بالخصوص پولیس کی اصلاح کی جائے۔

۴. دفاتر میں خواتین کی سروسز کی مخلوط شکل میں حوصلہ شکنی کی جائے۔

قرآن کریم سے شادی: ایک مذموم جاگیردانہ رسم

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جنوری ۱۹۹۶ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۴ دسمبر ۱۹۹۵ء کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت پاکستان سے تعزیراتِ پاکستان میں ایک دفعہ کے اضافہ کی سفارش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے تحت کسی دوشیزہ کی قرآن کریم، درگاہ، یا کسی اور مقدس چیز کے ساتھ شادی کو قانوناً قابلِ سزا جرم قرار دے دیا جائے گا۔

کسی خاتون کو مذہبی تقدس کی آڑ میں شادی کے حق سے محروم کر دینے اور ساری عمر شادی کے بغیر گزار دینے پر مجبور کرنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ عیسائی معاشرہ میں وہ خواتین ''نن'' کہلاتی ہیں جو ''کنواری مریم'' کے نام پر ساری زندگی کنواری رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ اور ہندوؤں کے ہاں انہیں ''دیوداسیاں'' کہا جاتا ہے جن کی شادی کسی دیوتا، بت، یا مندر کے ساتھ کر دی جاتی ہے اور پھر وہ ساری زندگی مندر میں بغیر شادی کے گزار دیتی ہیں۔ ان ننوں اور دیوداسیوں کا جو حشر مذہبی عبادت گاہوں میں مذہبی تقدس کی آڑ میں ہوتا ہے وہ ایک انتہائی دلخراش داستان ہے۔

اسلام نے اسی لیے تجرد کی زندگی کو عبادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور شادی کو مسنون بلکہ بعض حالات میں واجب قرار دیا ہے۔ لیکن یار لوگوں نے اپنے مفادات کی خاطر اس مکروہ رسم کو مسلمان معاشرہ میں بھی گھسیٹ لیا ہے اور بعض بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں میں یہ مذموم سلسلہ چلا آتا ہے کہ جوان بیٹی کو دلہن بنا کر قرآن کریم اس کی جھولی میں رکھ دیا جاتا ہے اور اسے کہا جاتا ہے کہ تمہاری شادی اللہ تعالیٰ کے پاک کلام کے ساتھ کر دی گئی ہے، پھر ساری زندگی وہ بدقسمت عورت تنہا رہنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس مکروہ دھندے کا اصل مقصد جاگیر اور زمین کا تحفظ ہوتا ہے کہ بیٹی کا دوسری جگہ بیاہ کر دیا تو اسے جاگیر یا زمین کا حصہ بھی دینا پڑے گا، اس لیے قرآن کریم کے نام پر اسے شادی کے حق سے ہی محروم کر دیا جاتا ہے، تاکہ زمین اور جاگیر کو تقسیم سے بچایا جا سکے۔ اسی طرح بعض خواتین کو درگاہوں اور دیگر مقدس اشیا کے نام منسوب کر کے بھی یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس پس منظر میں اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ اقدام مستحسن ہے اور حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ اس سفارش کو قانون کی شکل دے کر خواتین کے ساتھ قرآن کریم کے نام پر ہونے والے اس شرمناک ظلم کا عملاً خاتمہ کرنے کی راہ ہموار کرے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کا مقصد اور کارکردگی

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۔ فروری ۱۹۹۶ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۱۰ دسمبر ۱۹۹۵ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے دو سو قوانین پر اپنا کام مکمل کر لیا ہے جبکہ ایک ہزار قوانین پر کام ہونا ابھی باقی ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت عمل میں لایا گیا تھا جو ممتاز ماہرینِ قانون اور جید علماء کرام پر مشتمل ایک آئینی ادارہ ہے۔ اور دستور کی دفعہ ۲۳۰ کے تحت اس کی ذمہ داری یہ تھی کہ اپنی تشکیل کے بعد سات سال کے اندر ملک میں رائج قوانین کا جائزہ لے کر انہیں قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے سفارشات مرتب کرے۔ آئین کی رو سے ہر سال قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا پیش ہونا اور ان کے مطابق قانون سازی ضروری ہے۔

لیکن ۱۹۷۳ء میں تشکیل کے بعد سے اب تک کم و بیش تیئیس برس گزر جانے کے باوجود ابھی تک کونسل صرف دو سو قوانین کا جائزہ لے کر ان کے بارے میں سفارشات مرتب کر سکی ہے، اور ان میں سے بھی بیشتر سفارشات اسمبلیوں میں پیش ہونے کی بجائے وزارتِ قانون کے سرد خانے میں پڑی ہیں، اور قواعد کی رو سے ان کی اشاعت پر بھی پابندی ہے۔

تمام قوانین کو سات سال کے اندر اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی آئینی پابندی کا جو حشر ہوا ہے وہ بہرحال قابلِ توجہ مسئلہ ہے اور آئینی ماہرین کو اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ جن دو سو قوانین کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل نے سفارشات مرتب کر لی ہیں کم از کم انہیں ہی اشاعت کے لیے جاری کر دیا جائے تاکہ قوم کو یہ معلوم ہو سکے کہ ان سفارشات کو اسمبلیوں میں لا کر ان کے مطابق قانون سازی میں آخر رکاوٹ کیا ہے؟

بنگلہ دیش کا غیر سودی اسلامی بینک

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اپریل ۱۹۹۶ء)

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے آرگن پندرہ روزہ "تعمیرِ حیات" نے ۲۵ فروری ۱۹۹۶ء کی اشاعت میں خبر دی ہے کہ

> "بنگلہ دیش کے اسلامی بینک کے وائس چیئرمین نے کہا ہے کہ اسلامی بینک بنگلہ دیش نے بلا سود بینکاری کی بنیاد پر اپنی خدمات فراہم کر کے گزشتہ برس ۲۵ فیصد منافع کمایا ہے، اور حکومت نے اس کارکردگی کے پیش نظر بنگلہ دیش کے تیرہ بینکوں میں سے اسلامی بینک کو وی آئی پی بینک قرار دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ ہمارے کام کی بنیاد رضائے الٰہی، آخرت کی فکر اور خوفِ خدا کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ چنانچہ مسلسل تین سال کی جدوجہد کے بعد ۳۵ سرمایہ کاروں کے تعاون سے حکومت سے ۵۰ کروڑ ٹکا کے منظور شدہ سرمایہ سے کام شروع کیا۔ اس وقت تین شاخیں تھیں، اب ان کی تعداد ۸۳ تک پہنچ چکی ہے۔"

ہمارے ہاں ایک بات تسلسل کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ سود کے بغیر تجارت اور بینکاری کا نظام چلانا ممکن نہیں ہے، اور اسی بنا پر سودی قوانین کو غیر شرعی قرار دینے کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ پر عملدرآمد کے بجائے اسے سپریم کورٹ میں چیلنج کر کے "فریز" کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ قطعی طور پر خلافِ واقعہ بات ہے، خود پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بلا سود بینکاری پر ایک جامع رپورٹ مرتب کی تھی جس کی بنیاد پر سابق صدر جناب غلام اسحاق خان نے اس دور میں جبکہ وہ وزیر خزانہ تھے، اپنی بجٹ تقریر میں اعلان کیا تھا کہ ہمارے اگلے سال کا بجٹ غیر سودی ہوگا۔ لیکن عملاً ایسا نہ ہو سکا اور بجٹ کو غیر سودی کرنے کے بجائے بلا سود بینکاری کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی جامع رپورٹ کو "سرکاری استعمال کے لیے خاص" کر کے اس کی عمومی اشاعت روک دی گئی۔

اس کے علاوہ دنیا کے مختلف مسلم ممالک میں سود کے بجائے مضاربت کے شرعی اصولوں کے مطابق بینکاری کے تجربات جاری ہیں اور درجنوں بینک اس بنیاد پر کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ جن میں تازہ ترین شہادت آپ اسلامی بینک بنگلہ دیش کے حوالے سے سطور بالا میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ اس لیے اصل بات یہ نہیں کہ سود کے بغیر بینکاری ہو سکتی ہے یا نہیں؟ بلکہ یہ ہے کہ عالمی استعماری قوتوں کی معاشی اجارہ داری اور دنیا بھر کی تجارت پر ان کی بالادستی کی بنیاد سود پر ہے، جس کے بغیر وہ تجارت و معیشت پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے وہ کسی قیمت پر یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ دنیا کے کسی خطہ بالخصوص عالم اسلام کے کسی ملک میں سود کے شکنجے سے آزاد تجارتی اور بینکاری نظام وجود میں آئے۔

شریعت بل: جمعیت علماء اسلام کا نقطۂ نظر

(روزنامہ تجارت، گوجرانوالہ - ا مئی ۱۹۹۶ء)

قومی اسمبلی میں وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کی حکومت کی طرف سے پیش کردہ شریعت بل کا مسودہ اخبارات کے ذریعے سامنے آنے کے بعد متحدہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کے قائم مقام امیر مولانا محمد اجمل خان نے اس مسودہ کا جائزہ لینے کے لیے (۱) مولانا میاں محمد اجمل قادری (۲) سینیٹر حافظ حسین احمد (۳) جناب عبد المتین چودھری ایڈووکیٹ آف ساہیوال اور (۴) راقم الحروف ابو عمار زاہد الراشدی پر مشتمل ایک کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا اور راقم الحروف کو اس کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا۔ کمیٹی کے ارکان نے شریعت بل کے مذکورہ سرکاری مسودہ کا سینٹ کے منظور کردہ متفقہ شریعت بل اور اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور اس کے تجویز کردہ متبادل شریعت بل کے ساتھ تقابلی جائزہ لینے کے بعد ۲۴ اپریل ۱۹۹۱ء کو مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ لاہور میں منعقدہ اجلاس میں مندرجہ ذیل رپورٹ پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ رپورٹ کا پہلا حصہ شریعت بل کے سرکاری مسودہ کے تجزیہ پر اور دوسرا حصہ جمعیت علماء اسلام پاکستان کی مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۱۱، ۱۲ مئی ۱۹۹۱ء بمقام لاہور کے لیے کمیٹی کی طرف سے اس سلسلہ میں سفارشات پر مشتمل ہوگا۔

شریعت بل کے تجزیہ کے لیے کمیٹی نے مندرجہ ذیل مسودات کو بنیاد بنایا ہے:

۱. سینٹ آف پاکستان میں مولانا قاضی عبد اللطیف اور مولانا سمیع الحق کی طرف سے پیش کردہ شریعت بِل کا وہ مسودہ جسے سینٹ کی قائم کردہ خصوصی کمیٹی نے از سرِ نو مرتب کر کے ایوان میں پیش کیا اور چند ترامیم کے ساتھ متفقہ طور پر اسے منظور کر لیا گیا۔

۲. شریعت بِل کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ اور اس کا تجویز کردہ متبادل مسودہ جو روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی میں ۲۳ جولائی ۱۹۸۶ء کو شائع ہو چکا ہے۔

۳. شریعت بِل کے مسودہ میں پیپلز پارٹی کی وفاقی حکومت کے وزیر قانون سید افتخار گیلانی کی طرف سے پیش کردہ ترامیم جو بل کی منظوری کے موقع پر ایوان میں ان کی عدم موجودگی کے باعث مسترد ہو گئی تھیں، اور سینٹ میں شریعت بِل کے منظور ہونے کے بعد قومی اسمبلی میں

اسے پیش کیے جانے کے مرحلہ پر پی پی حکومت کے وفاقی وزیر پارلیمانی امور خواجہ طارق رحیم نے روزنامہ جنگ لاہور میں ۲۴ جولائی ۱۹۹۰ء کو شائع ہونے والے ایک انٹرویو میں ان ترمیمات کا اعادہ کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ ان ترامیم کے ساتھ پی پی حکومت قومی اسمبلی سے شریعت بل کو منظور کرانے کے لیے تیار ہے۔ مگر پھر قومی اسمبلی ٹوٹ جانے کے بعد بل ایوان میں پیش نہیں ہو سکا تھا۔

۴. قومی اسمبلی میں میاں محمد نواز شریف صاحب کی حکومت کی طرف سے پیش کردہ شریعت بل کا وہ مسودہ جس کا متن روزنامہ پاکستان لاہور نے ۱۳ اپریل ۱۹۹۱ء کو شائع کیا ہے۔

تمہید

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی تمہید میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کی منظور کردہ قرارداد پاکستان کو بنیاد بنا کر کہا گیا ہے کہ چونکہ خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو ملک کے اجتماعی نظام کی بنیاد قرار دینے والی قرارداد مقاصد دستور پاکستان کا مستقل حصہ ہے، اور اس کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے شریعت کے نفاذ کو فی الفور یقینی بنانا ضروری ہے، اس لیے شریعت بل نافذ کیا جا رہا ہے۔

یہ تمہید اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق ہے، جس میں پی پی حکومت کی طرف سے یہ اضافہ تجویز کیا گیا تھا کہ

> ''اور جبکہ قرارداد مقاصد دوسری باتوں کے علاوہ یہ کہتی ہے کہ ریاست اپنے اختیارات منتخب عوامی نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے گی۔''

مگر قومی اسمبلی میں پیش کیے جانے والے نئے مسودہ کی تمہید میں قرارداد مقاصد کا ذکر حذف کر دیا گیا ہے، اور ایک تفصیلی تمہید شائع کی گئی ہے جو اگرچہ ایک اچھی تمہید ہے، لیکن کمیٹی کی رائے میں شریعت بل کی تمہید میں قرارداد مقاصد کا ذکر ضروری ہے اور اس کی موجودگی میں کسی اور تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

دفعہ (۱)

شریعت بل کی پہلی دفعہ اس کے عنوان، دائرہ کار اور آغاز نفاذ پر مشتمل ہے۔ اور اس میں سب مسودات بالخصوص اس امر پر متفق ہیں کہ شریعت بل میں شامل کسی امر کا اطلاق غیر مسلموں کے شخصی

قوانین پر نہیں ہو گا۔

دفعہ (۲)

یہ دفعہ بل میں مذکور اصطلاحات کی تعریفات پر مشتمل ہے اور اس میں ''شریعت'' کی تعریف بطور خاص قابل ذکر ہے، جو سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل میں اس طرح کی گئی ہے کہ

''(ب)''شریعت'' سے مراد وہ احکام اسلام میں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں۔

تشریح: شریعت کی تشریح و تفسیر کرتے وقت قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر کے مسلمہ اصول و قواعد کی پابندی کی جائے گی اور راہنمائی کے لیے اسلام کے مسلمہ فقہاء کی تشریحات و آراء کا لحاظ رکھا جائے گا، جیسا کہ دستور کی دفعہ ۲۲۷ شق ۱ کی تشریح میں ذکر کیا گیا ہے۔''

اسلامی نظریاتی کونسل کے مسودہ میں ''قرآن و سنت سے ثابت ہیں'' کی بجائے ''قرآن و سنت میں مذکور ہیں'' کے الفاظ کے ساتھ شریعت کی تعریف کی گئی ہے۔ اور تشریح میں (۱) سنت خلفاء راشدین (۲) تعامل صحابہ (۳) اجماع امت اور (۴) مسلمہ فقہاء اسلام کی تشریحات کی صراحت کی گئی ہے۔

جبکہ پی پی حکومت کی طرف سے پیش کردہ ترامیم میں شریعت کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

''شریعت کے معنی قرآن و سنت میں درج احکامات ہیں جن کی تشریح و تفسیر قرآن و سنت کی تشریح کے مسلمہ قواعد کے مطابق کی گئی ہو۔''

اور موجودہ حکومت کے مسودہ میں اسے اس صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ:

''شریعت سے اسلام کے وہ احکام مراد ہیں جس طرح کہ قرآن پاک اور سنت میں ان کا تعین کیا گیا ہے۔

تشریح: جیسا کہ دستور کے آرٹیکل ۲۲۷ میں تصور کیا گیا ہے کہ مسلم فرقہ کے شخصی قانون کی نسبت شریعت کی تشریح اور تعبیر کرتے ہوئے قرآن پاک اور سنت کے الفاظ سے اس فرقہ کے مطابق قرآن پاک اور سنت کی تشریح اور تعبیر مراد ہو گی۔''

اس ضمن میں مندرجہ ذیل دو نکات قابل توجہ ہیں:

- شریعت کی تعریف میں ''وہ احکام جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں'' کی بجائے ''مذکور ہیں'' یا

"درج ہیں" کے الفاظ قطعی طور پر ناکافی ہیں، اور ان سے وہ تمام احکام اسلام شریعت کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں جو قرآن و سنت میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہیں مگر خلفاء راشدینؓ، صحابہ کرامؓ اور فقہاء اسلام نے قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کیے ہیں۔ اور وہ احکام اسلام بھی شریعت کے دائرہ میں شامل نہیں ہو سکیں گے جو اجتہاد کے شرعی حق کو استعمال کرتے ہوئے آج کے دور میں مسلم فقہاء قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کریں گے۔ اسی طرح "جن کا تعین قرآن و سنت میں کیا گیا ہے" کے الفاظ بھی مبہم ہیں اور ان سے قرآن و سنت سے مستنبط کیے گئے احکام اسلام کو شریعت کی تعریف میں شامل رکھنے کا مقصد کماحقہ پورا نہیں ہوتا۔ اس لیے سینٹ کے منظور کردہ "ثابت تھے" کے الفاظ زیادہ واضح، جامع اور ضروری ہیں۔

- قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے ضمن میں سینٹ کے منظور کردہ بل میں "قرآن و سنت کی تشریح و تفسیر کے مسلمہ اصول و قواعد کی پابندی کی جائے گی" کی ضمانت دی گئی ہے۔ جس سے اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے (۱) سنت خلفاء راشدین (۲) تعامل صحابہ (۳) اجماع امت (۴) اور مسلمہ فقہاء کی تشریحات کی صراحت کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ پی پی حکومت کی تجویز کردہ ترامیم میں بھی "قرآن و سنت کی تشریح کے مسلمہ قواعد کے مطابق" کا اصول تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر شریعت بل کے نئے مسودے میں اصول و قواعد کا ذکر حذف کر دیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے قانونی طور پر مجاز اداروں کے سامنے کوئی طے شدہ اصول و ضوابط نہیں ہوں گے اور وہ اپنی صوابدید پر جس طرح چاہیں گے قرآن و سنت کی تشریح کر سکیں گے، البتہ سرکاری مسودہ میں اس کی اگلی دفعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ

> "قانون موضوعہ کی تشریح و تعبیر کرتے وقت اگر ایک سے زیادہ تشریحات اور تعبیرات ممکن ہوں تو عدالت کی طرف سے اس تشریح و تعبیر کو اختیار کیا جائے گا جو اسلامی اصولوں اور اصول قانون کے مطابق ہو۔"

مگر یہ بات ناکافی اور مبہم ہے۔ ناکافی اس لیے کہ اس کا تعلق صرف عدالت سے ہے اور دیگر ادارے قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر میں مسلمہ قواعد کی پابندی سے آزاد رہ جاتے ہیں۔ اور مبہم اس لیے کہ "مسلمہ قواعد و اصول" کی بجائے "اسلامی اصولوں" کا ذکر کیا گیا ہے،

جس کی مراد واضح نہیں ہے اور ہر شخص یا ادارہ خود اپنے طے کردہ اصول کو اسلامی اصول قرار دے کر انہیں قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کی بنیاد بنا سکتا ہے۔ پھر اسلامی اصولوں کو ''اصول قانون'' کے ساتھ نتھی کر کے معاملہ کو اور زیادہ الجھن میں ڈال دیا گیا ہے۔ اس لیے کمیٹی کی رائے میں سینٹ کے منظور کردہ بل کے الفاظ انتہائی ضروری ہیں کیونکہ وہی اس سلسلہ میں ناگزیر تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

دفعہ (۳)

شریعت بل کی تیسری دفعہ میں قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دیا گیا ہے، جسے اسلامی نظریاتی کونسل کے مسودہ، سینٹ کے منظور کردہ بل اور موجودہ حکومت کی طرف سے قومی اسمبلی میں پیش کردہ مسودہ میں ''اعلیٰ ترین قانون'' اور ''بالاتر قانون'' کے الفاظ کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن پی پی حکومت کی طرف سے تجویز کردہ ترامیم میں اسے ''اعلیٰ وسیلہ قانون'' کے الفاظ میں بدل دیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن و سنت کو خود قانون کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی البتہ انہیں قانون سازی کے وسیلہ کے طور پر بنیاد بنایا جا سکے گا۔ کمیٹی کی رائے میں یہ بات درست نہیں ہے اور اس سے قرآن و سنت کو ''سپریم لاء'' قرار دینے کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ نیز کمیٹی اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رائے سے اتفاق کرتی ہے کہ قرآن و سنت کو اعلیٰ ترین قانون قرار دینے کی یہ شق شریعت بل کی دفعہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک آئینی ترمیم کے ذریعے دستور پاکستان کا حصہ بننی چاہیے، کیونکہ آئین کا حصہ بننے کی صورت میں ہی یہ بنیادی اصول ملک کے تمام معاملات پر اثرانداز ہو سکے گا، ورنہ اس کی حیثیت محض ایک نمائشی دفعہ کی رہے گی۔ اس ضمن میں یہ بات توجہ طلب ہے کہ:

- قومی اسمبلی ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو متفقہ قرارداد کے ذریعے ایک نیا آئینی ترمیمی بل منظور کرنے کا قوم سے وعدہ کر چکی ہے جس میں قرارداد کے مطابق یہ بات بھی شامل ہو گی کہ (الف) آرٹیکل ۲ میں ''اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے'' کے بعد اضافہ کیا جائے کہ ''قرآن و سنت ملک کا بالاترین (سپریم) قانون اور پالیسی بنانے اور قانون سازی کے لیے اصل منبع ہوں گے۔''
- اسی وعدہ کی بنیاد پر سینٹ آف پاکستان میں ''نواں آئینی ترمیمی بل'' منظور کیا گیا تھا جس میں قرآن و سنت کو دستوری طور پر سپریم لاء قرار دیا گیا ہے، لیکن سینٹ میں منظور ہو جانے کے

بعد اسے مقررہ دستوری مدت کے اندر قومی اسمبلی میں پیش نہ کیا گیا جس سے یہ ترمیمی بل غیر مؤثر ہو گیا۔

- وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے ۱۰ اپریل ۱۹۹۱ء کے پارلیمنٹ میں اپنے خطاب کے دوران قرآن و سنت کو سپریم لاء قرار دینے کے لیے آئینی ترمیم پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا (بحوالہ جنگ لاہور، ۱۱ اپریل ۱۹۹۱ء) لیکن اس واضح وعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آئینی ترمیم کی بجائے اس اہم اور بنیادی شق کو شریعت بِل کے قانونی مسودہ میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اس لیے کمیٹی کی رائے میں ''قرآن و سنت کو سپریم لاء'' کے عملی مقاصد صرف اس صورت میں پورے ہو سکتے ہیں جبکہ اسے دستوری ترمیم کے ذریعے آئین کے باضابطہ حصہ کے طور پر نافذ کیا جائے۔

دفعہ (۴)

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی چوتھی دفعہ کے ذریعے ملک کی تمام عدالتوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق کریں گی۔ یہ دفعہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق ہے اور عملی طور شریعت بل کی سب سے زیادہ عملی اور انقلابی دفعہ ہے، جس سے ملک کے عدالتی نظام میں قرآن و سنت کے عملی نفاذ کا مقصد حاصل ہوتا ہے، اور فرنگی استعمار کے نافذ کردہ قوانین سے قوم کو نجات ملتی ہے۔ لیکن انتہائی بدقسمتی کی بات ہے کہ پیپلز پارٹی اور آئی جے آئی (اسلامی جمہوری اتحاد) دونوں اس دفعہ کو شریعت بل میں شامل نہ رکھنے پر متفق ہیں۔ چنانچہ سابق وزیر قانون سید افتخار گیلانی کی پیش کردہ ترامیم میں بھی اسے حذف کرنے کی سفارش کی گئی ہے اور موجودہ حکومت کی طرف سے سامنے آنے والے مسودہ میں بھی یہ اہم دفعہ شامل نہیں ہے۔

دفعہ (۵)

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی پانچویں دفعہ میں کہا گیا ہے کہ

> ''انتظامیہ کا کوئی بھی فرد بشمول صدر مملکت، وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ شریعت کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکے گا۔ اور اگر ایسا کوئی حکم دے دیا گیا ہو تو اسے عدالت عالیہ

میں چیلنج کیا جاسکے گا۔"

اسلامی نظریاتی کونسل اس دفعہ کے ساتھ متفق ہے، لیکن دفعہ ۴ کی طرح پی پی حکومت کے وزیر قانون نے اسے بھی حذف کرنے کی سفارش کی ہے، اور موجودہ حکومت نے اپنے مسودہ میں اسے حذف کر دیا ہے۔

دفعہ (۶)

سینٹ کے منظور کردہ بل کی چھٹی دفعہ میں کہا گیا ہے کہ

"حکومت کے تمام عمال دستور کے تابع رہتے ہوئے اسلامی نظام انصاف کے پابند ہوں گے اور شریعت کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہوں گے۔"

اسلامی نظریاتی کونسل نے اس سے اتفاق کیا ہے کہ اور "اسے دستور کے تابع" رکھنے کی بجائے اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے دستوری ترمیم کی سفارش کی ہے۔ پی پی حکومت نے اسے جوں کا توں تسلیم کیا ہے، مگر موجودہ حکومت کے مسودہ میں اسے سرے سے حذف کر دیا گیا ہے۔

دفعہ (۷)

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی ساتویں دفعہ میں علماء اور دینی علوم کے ماہرین کو عدالتوں میں جج اور معاون جج کی حیثیت سے مقرر کرنے کا اصول طے کر کے اس کا طریق کار وضع کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے بارے میں کہا ہے کہ یہ قانون سازی کی بجائے ایک سفارش کی حیثیت رکھتی ہے البتہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کی سطح پر علماء کے بطور جج تقرر کے لیے آئین میں ترمیم ضروری ہے، پی پی پی کے سابق وزراء قانون نے اس دفعہ کو من وعن قبول کیا ہے، مگر موجودہ حکومت کے مسودہ میں یہ دفعہ بھی حذف کر دی گئی ہے۔

دفعہ (۸)

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی آٹھویں دفعہ میں صدر مملکت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ شرعی احکام میں اعلیٰ عدالتوں کی معاونت کے لیے مفتیوں کا تقرر کر سکے گا جن کی حیثیت ڈپٹی اٹارنی جنرل کے برابر ہوگی۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس کے بارے میں خاموش ہے، پی پی پی کے سابق وزیر قانون نے ایک جزوی ترمیم کے ساتھ اسے قبول کیا ہے، مگر موجودہ حکومت کے مسودہ میں یہ دفعہ شامل نہیں

ہے۔

دفعہ (۹)

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی نویں دفعہ میں قانون تعلیم کے موجودہ نظام میں تبدیلی کرنے اور نصاب تعلیم میں ردوبدل کر کے اسلامی قوانین و علوم کو شامل نصاب کرنے کا اصول طے کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اسے ایک سفارش قرار دے کر اصولی طور پر اس سے اتفاق کیا ہے، پی پی پی حکومت نے اسے من وعن قبول کیا ہے، اور موجودہ حکومت کے مسودہ میں بھی اسے ردوبدل کے ساتھ شامل کر لیا گیا ہے، مگر کمیٹی کی رائے میں سینٹ کی منظور کردہ دفعہ زیادہ جامع اور واضح ہے۔

دفعہ (۱۰)

سینٹ کے منظور کردہ بل کی دسویں دفعہ میں معیشت کو اسلامی بنانے اور اس کے لیے ایک مستقل کمیشن مقرر کر کے اس کی سفارشات کی روشنی میں معاشی نظام کو تبدیل کرنے کا طریق کار طے کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس کے بارے میں خاموش ہے، البتہ کونسل نے ایک اور دفعہ کے تحت ناجائز اور حرام ذرائع سے دولت کمانے کو قابل سزا جرم قرار دینے کی سفارش کی ہے، پی پی پی حکومت کی ترامیم میں اس دفعہ کو مکمل طور پر حذف کرنے کے لیے کہا گیا ہے، جبکہ موجودہ حکومت کے مسودہ میں معیشت کو اسلامی بنانے اور کمیشن قائم کرنے کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات بھی شامل کی گئی ہیں۔

لیکن اس ضمن میں ظلم یہ کیا گیا ہے کہ سود کے خاتمہ کے لیے حکومت کو تین سال کی مدت کی گنجائش دے کر اس میں توسیع کا دروازہ بھی کھلا رکھا گیا ہے، جبکہ سابقہ صورتحال یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے سود سمیت مالیاتی قوانین کو جس دس سالہ مدت کے لیے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا وہ ختم ہو چکی ہے، اور شہریوں کا یہ حق بحال ہو گیا ہے کہ وہ سود یا دیگر غیر اسلامی مالیاتی قوانین کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کر سکیں، مگر شریعت بل کے موجودہ سرکاری مسودہ کی یہ شق منظور ہو جانے کی صورت میں یہ حق دوبارہ تین سال یا اس سے زائد مدت کے لیے معطل ہو جائے گا اور شریعت بل کے حوالے سے یہ کارروائی انتہائی افسوسناک ہوگی۔

دفعہ (۱۱)

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی گیارہویں دفعہ میں ذرائع ابلاغ کو اسلامی تعلیمات کا پابند بنانے اور فحش پروگراموں کی اشاعت سے روکنے کا اصول طے کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس کی خلاف ورزی کو قابل سزا جرم قرار دینے کی سفارش کی ہے، پی پی پی حکومت نے اس دفعہ کو ختم کرنے کے لیے کہا ہے، اور موجودہ حکومت کے مسودہ میں اسے مختلف الفاظ کے ساتھ موجود رکھا گیا ہے۔

دفعہ (۱۲)

سینٹ کے پاس کردہ شریعت بل کی بارہویں دفعہ تعلیمی نظام کی اصلاح کے بارے میں ہے، اور اس سلسلہ میں ایک کمیشن کے قیام کو ضروری قرار دیا گیا ہے جس کی سفارشات پر نظام تعلیم کو مکمل طور پر اسلامی بنانے کے اقدامات کیے جائیں گے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس بارے میں خاموش ہے، پی پی حکومت اپنی ترامیم میں اس دفعہ کو حذف کرنے کے حق میں تھی، اور موجودہ حکومت کے مسودہ میں یہ دفعہ برقرار رکھی گئی ہے۔

دفعہ (۱۳)

سینٹ کے منظور کردہ بل میں اس دفعہ کے تحت کہا گیا ہے کہ

> ”انتظامیہ، عدلیہ اور مقننہ کے تمام مسلمان ارکان کے لیے فرائض شریعت کی پابندی اور کبائر سے اجتناب لازم ہوگا۔“

اسلامی نظریاتی کونسل نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے خلاف ورزی کی صورت میں سزا مقرر کرنے کی سفارش کی ہے، پی پی پی کی حکومت نے اس دفعہ کو سینٹ کی منظور شدہ شکل میں قبول کر لیا تھا، اور موجودہ حکومت کے مسودہ میں اسے حذف کر دیا گیا ہے۔

دفعہ (۱۴)

سینٹ کے منظور کردہ شریعت بل کی اس دفعہ میں قوانین کی تعبیر و تشریح شریعت کی روشنی میں کرنے کا طریق کار طے کیا گیا ہے اور مسلمہ مسلم فرقوں کے لیے شخصی قوانین میں قرآن و سنت کی تشریح

ان کی اپنی فقہ کے مطابق کیے جانے کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے نزدیک دفعہ 2 میں وضاحت آجانے کے بعد الگ دفعہ کے طور پر اس کی ضرورت نہیں رہی۔ پی پی پی حکومت نے اسے ختم کرنے کی سفارش کی تھی، اور موجودہ حکومت کے مسودہ میں اس کا مفہوم دفعہ 2 میں شامل کر کے الگ دفعہ کے طور پر اسے ختم کر دیا گیا ہے۔

دفعہ ۱۵، ۱۶

سینٹ کے منظور کردہ مسودہ میں یہ دو دفعات حکومت کی بین الاقوامی مالیاتی ذمہ داریوں کا تسلسل قائم رکھنے اور موجودہ ذمہ داریوں کی تکمیل کے حوالے سے شامل کی گئی ہیں۔ اور دفعہ 17 میں شریعت بل پر عملدرآمد کے لیے قواعد وضع کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس بارے میں خاموش ہے۔ پی پی پی حکومت کی طرف سے پیش کردہ ترامیم میں سابقہ اور موجودہ ذمہ داریوں کے تسلسل کو تحفظ دینے کے ساتھ ساتھ آئندہ کے لیے بھی گنجائش پیدا کی گئی ہے کہ حکومت جو مالیاتی اقدامات آئندہ بین الاقوامی سطح پر کرے گی شریعت بل ان پر بھی اثر انداز نہیں ہو گا، جبکہ موجودہ حکومت کے مسودہ میں ان دفعات کو سینٹ کی منظور کردہ صورت میں برقرار رکھا گیا ہے۔

شریعت بل کے مذکورہ بالا مسودات کے تقابلی جائزہ کے بعد جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کی خصوصی کمیٹی جمعیت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ سے سفارش کرتی ہے کہ چونکہ

- وزیراعظم میاں نواز شریف کے پارلیمنٹ میں واضح اعلان کے باوجود قرآن وسنت کو سپریم لاء قرار دینے کے بارے میں آئینی ترمیم پیش نہ کر کے قوم کے ساتھ کیے گئے وعدہ کی خلاف ورزی کی گئی ہے،
- سینٹ آف پاکستان کے متفقہ طور پر منظور کردہ ''شریعت بِل'' کی چھ اہم دفعات موجودہ حکومت کے تجویز کردہ ''شریعت بِل'' میں شامل نہیں کی گئیں اور
- شریعت بِل کے موجودہ سرکاری مسودہ کے ذریعہ سودی نظام کو مزید تین سال کے لیے تحفظ دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اس لیے قومی اسمبلی میں موجودہ حکومت کے پیش کردہ شریعت بل کو مکمل طور پر مسترد کر دیا جائے اور سینٹ آف پاکستان کے منظور کردہ ''نویں آئینی ترمیمی بل'' اور ''متفقہ شریعت بل'' دونوں کو پارلیمنٹ سے از سر نو منظور کرانے کے لیے منظم جدوجہد کا لائحہ عمل طے کیا جائے۔

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی نصابی کتابیں اور اسلامی نظریاتی کونسل

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ کتوبر ۱۹۹۶ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جناب اقبال احمد خان نے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین کو ایک نوٹس جاری کیا ہے جس میں بعض نصابی کتب میں تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی نشاندہی کی گئی ہے۔ روزنامہ جنگ لندن ۳۱ اگست ۱۹۹۶ء میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کو توجہ دلائی گئی ہے کہ

- پنجاب ٹیکسٹ بورڈ نے آٹھویں جماعت کی اردو کی کتاب سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اور محبت کے بارے میں مضمون، اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے بارے میں مضمون نکال دیا ہے۔
- اسی طرح لاہور بورڈ کی شائع کردہ ''تاریخ اسلام'' میں سلطان محمود غزنویؒ کو لٹیرا قرار دیا گیا ہے اور اکبر بادشاہ کے خود ساختہ ''دین الٰہی'' کو مذہب کی اصلاح کی ایک درست کوشش بتایا گیا ہے۔
- اس کے علاوہ بھی تحریکِ پاکستان اور تاریخ اسلام کے حوالہ سے مختلف منفی تبدیلیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

جناب اقبال احمد خان نے اس پر پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین کو شوکاز نوٹس جاری کرنے کے علاوہ حکومت کے ذمہ دار حضرات کو بھی اس طرف توجہ دلائی ہے۔

جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے اس بات کا نوٹس لیے جانے کا تعلق ہے یہ خوشی کی بات ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ کہیں تو ایسے لوگ موجود ہیں جو صورتحال پر نظر رکھے ہوئے ہیں اور خرابیوں کی نشاندہی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک تاریخ کو مسخ کرنے کا سوال ہے یہ کام تو قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل ہو رہا ہے اور خاص طور پر تحریک آزادی

کے مجاہدین کے کارناموں اور خدمات کو جس طرح نئی نسل کی آنکھوں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ بھی سنجیدہ لوگوں کی توجہ کی مستحق ہے- اور ہمارے ہاں ذہنی انتشار اور فکری انارکی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ نئی نسل کو اس کے حقیقی ماضی سے متعارف کرانے کی بجائے ادھورے اور نامکمل ماضی پر اس کے ذہن و فکر کی بنیاد رکھی جارہی ہے۔ کیا اسلامی نظریاتی کونسل یا کوئی اور ادارہ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت محسوس کرے گا؟

مساجد و مکاتب کے نظام کی اصلاح کے لیے سفارشات کی ضرورت

(روزنامہ پاکستان، اسلام آباد۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

...... ہمارے نزدیک اس کام کی اصل ذمہ داری تو اسلامی کانفرنس کے جدہ سیکرٹریٹ کی ہے کہ وہ غیر مسلم ممالک میں مساجد و مکاتب کے نظام کا جائزہ لینے اور ان کی مشکلات و مسائل کے حل کے لیے ایک مستقل شعبہ قائم کرے اور اس مقصد کے لیے ایک مؤثر نظام کار وضع کیا جائے۔ تاہم پاکستان کی حد تک ہماری تجویز یہ ہے کہ

- دینی مدارس کے وفاق اور بڑے دینی مدارس مغربی ممالک کی ضروریات کا جائزہ لے کر ان کے مطابق آئمہ اور اساتذہ کی تیاری اور تربیت کے الگ شعبے قائم کریں۔
- اسلامی نظریاتی کونسل اپنا وفد بھیج کر ان ممالک میں مقیم پاکستانیوں کی مساجد اور دینی مکاتب کے نظام کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کے لیے سفارشات مرتب کرنے کے علاوہ مساجد کمیٹیوں اور آئمہ و خطباء کے لیے ضابطۂ اخلاق طے کرے جس پر عملدرآمد کی پاکستانی سفارت خانوں کے ذریعے نگرانی کی جائے۔
- پاکستانی سفارت خانوں میں موجود تعلیمی شعبوں کا دائرہ کار دینی تعلیم تک بڑھایا جائے اور سفارت خانوں میں مذہبی امور کے شعبے بھی قائم کیے جائیں۔ اور وزارت تعلیم اور وزارت مذہبی امور کے یہ شعبے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں مساجد و مکاتب اور دینی تعلیم کے نظام میں پاکستانی کمیونٹی کی راہنمائی کریں۔
- پاکستان میں مختلف مکاتبِ فکر کے دینی مدارس کے وفاقوں کا مشترکہ بورڈ اپنا وفد بھیج کر مغربی ممالک میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مسائل کا جائزہ لے اور غیر سرکاری سطح پر سفارشات مرتب کر کے ان ممالک میں مقیم پاکستانیوں کی رہنمائی کی جائے۔

جسٹس محمد رفیق تارڑ کا جرأتمندانہ فیصلہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱مارچ ۱۹۹۷ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۴ فروری ۱۹۹۷ء کے مطابق سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق جج جسٹس (ر) محمد رفیق تارڑ نے یہ کہہ کر اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے کہ جس ادارے کا سربراہ اسلامی علوم سے بے بہرہ ہو اس کی رکنیت کو وہ قبول نہیں کر سکتے۔

اسلامی نظریاتی کونسل ملک کا ایک آئینی ادارہ ہے جس کا کام ملک میں رائج قوانین کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا اور خلاف اسلام قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھال کر حکومت کو سفارشات پیش کرنا ہے۔ آئین میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت کے لیے اہلیت اور تجربہ کا معیار مقرر ہے لیکن بدقسمتی سے اکثر و بیشتر اس کا خیال نہیں رکھا جاتا، اور حکومتیں اہلیت و استعداد کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے منظور نظر افراد کو خوش کرنے کے لیے سیاسی بنیادوں پر تقرریاں کرتی ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے موجودہ چیئرمین ہمارے محترم دوست ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس ادارے کے چیئرمین کی حیثیت سے ان کی تقرری کی بنیاد ان کا قانونی تجربہ نہیں بلکہ سیاسی ضرورت تھی، اور یہی وجہ ہے کہ سپریم کورٹ کے ایک قابلِ احترام سابق جج کو اس پر اپنے منفی تاثرات کا اظہار کرنا پڑا ہے۔

موجودہ حکومت نے سیاسی اور سفارشی تقرریوں کی نفی کرتے ہوئے میرٹ کی بنیاد پر ملازمتیں فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ میرٹ کے اس اصول کا اطلاق اسلامی نظریاتی کونسل پر بھی ہونا چاہیے، اور کونسل کے موجودہ ڈھانچے پر نظر ثانی کرتے ہوئے حکومت کو خالصتاً عملی بنیاد پر اس کی تشکیل نو کرنی چاہیے، تاکہ اہل اور باصلاحیت افراد کے ذریعے یہ ادارہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اپنا آئینی کردار صحیح اور مؤثر طور پر ادا کر سکے۔

دستورِ پاکستان، قراردادِ مقاصد اور قرآن و سنت کی بالادستی

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - نومبر ۱۹۹۷ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۷ء کی خبر کے مطابق پنجاب اسمبلی نے انجینئر ظفر اقبال ملک ایم پی اے کی پیش کردہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی ہے جس میں وفاقی حکومت سے سفارش کی گئی ہے کہ دستورِ پاکستان میں ترمیم کر کے قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاء قرار دیا جائے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور میں اسلام کو مملکت کا سرکاری مذہب قرار دے کر اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ملک میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کیا جائے گا اور موجودہ تمام قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھال دیا جائے گا۔ لیکن اس دستوری ضمانت کے باوجود ملک میں نہ صرف قرآن و سنت کے منافی قوانین موجود ہیں بلکہ نئے غیر اسلامی قوانین کے نفاذ کا راستہ بھی بدستور کھلا ہوا ہے۔ حالانکہ اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق چیئرمین جناب اقبال احمد خان کے اعلان کے مطابق کونسل ملک میں رائج تمام قوانین کے بارے میں ایک جامع اور مکمل رپورٹ حکومت کو پیش کر چکی ہے اور مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے ضروری مسودات بھی مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر چکی ہے مگر کونسل کی سفارشات اور مسودات وزارت قانون کی فائلوں میں دب کر رہ گئے ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک دستوری ادارہ ہے جسے اسلامی قوانین کی تشکیل و تدوین ہی کی غرض سے قائم کیا گیا ہے اور کونسل نے اسلامی قوانین کے نفاذ کو حقیقی بنانے کے لیے یہ سفارش پیش کر رکھی ہے کہ "قراردادِ مقاصد" کو ملک کے دستور میں بالاتر حیثیت دی جائے تاکہ اس کے منافی قوانین کے خاتمے کی راہ ہموار ہو۔ قراردادِ مقاصد پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے ۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی مساعی سے منظور کی تھی جس میں کہا گیا ہے:

> "اللہ تعالیٰ ہی کُل کائنات کا بلا شرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے، اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے۔"

جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنی سفارشات میں کہا ہے کہ دستور کے آرٹیکل ۲(الف) میں یہ اضافہ کیا جائے کہ:

> ''قراردادِ مقاصد میں مندرجہ احکام و اصول کو ملک کے جملہ قانونی اور دستوری احکام کی کسوٹی قرار دیا جاتا ہے، اور دستور میں موجود کسی بھی حکم کے علی الرغم ملک کے قوانین و دستوری احکام کے معانی و مفاہیم ''قرارداد مقاصد'' کی روشنی میں متعیّن کیے جائیں گے۔''

اس کے علاوہ قومی اسمبلی آف پاکستان نے ۱۶اکتوبر ۱۹۸۵ء کو ایک قرارداد کے ذریعے قوم سے وعدہ کیا تھا کہ قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لاقرار دینے کے لیے مستقل آئینی ترمیم لائی جائے گی۔ چنانچہ اس کے بعد جولائی ۱۹۸۶ء میں سینٹ آف پاکستان نے نویں آئینی ترمیمی بل کے عنوان سے قرآن و سنت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دینے کے لیے آئینی ترمیم منظور بھی کر لی تھی مگر وہ مقررہ وقت (۹۰دن) کے اندر قومی اسمبلی میں پیش نہ ہونے کی وجہ سے غیر مؤثر ہو گئی۔

اس پس منظر میں پنجاب اسمبلی کی مذکورہ قرارداد ایک اچھی یاددہانی ہے جس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم موجودہ حکومت سے گزارش کریں گے کہ اس کے پاس قومی اسمبلی میں مطلوبہ اکثریت موجود ہے، اس لیے پنجاب اسمبلی کی سفارش بلکہ خود قومی اسمبلی کے وعدے کو پورا کرتے ہوئے قرآن و سنت کو ملک کا غیر مشروط طور پر بالاتر قانون قرار دینے کے لیے جلد از جلد دستوری ترمیم لائی جائے تاکہ ملک میں اسلامی احکام و قوانین کے عملی نفاذ کی طرف پیشرفت ممکن ہو۔

قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا حکومتی اختیار

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - انومبر ۱۹۹۸ء)

قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینے کے لیے آئین میں پندرہویں ترمیم کا بل قومی اسمبلی نے منظور کر لیا ہے اور اب یہ بل سینٹ میں جا چکا ہے۔ جس کے بارے میں حکومتی حلقے اس توقع کا مسلسل اظہار کر رہے ہیں کہ ایوان بالا میں حکومت کو مطلوبہ اکثریت حاصل نہ ہونے کے باوجود وہ اسے سینٹ میں منظور کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے، اور قرآن و سنت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دینے کی شق دستورِ پاکستان کا باقاعدہ حصہ بن جائے گی۔

دستوری ترمیم کا یہ بل جب ایوان میں پیش کیا گیا تھا تو اس میں قرآن و سنت کو سپریم لا قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس مقصد کے لیے دستور میں آئندہ ترامیم کا طریقہ تبدیل کرنے، اور حکومت کو بعض ایسے اختیارات دینے کی شقیں بھی شامل تھیں۔ جو ملک کے سیاسی حلقوں میں متنازعہ حیثیت اختیار کر گئیں، اور نفاذِ شریعت کی مخالف قوتوں کو اس بہانے اس کے خلاف اپنی مہم آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ چنانچہ حکومت نے بہت سی متنازعہ شقیں بل سے نکال دی ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ حلقوں کے لیے قابلِ قبول بنانے کی کوشش کی ہے۔ جو ایک خوش آئند امر ہے اور قومی اسمبلی سے اس کی منظوری کے ساتھ ساتھ اس مفاہمانہ طرزِ عمل پر بھی حکومت بجا طور پر مبارکباد کی مستحق ہے۔ ہمیں امید ہے کہ سینٹ میں بھی یہ بل مطلوبہ اکثریت کے ساتھ منظور ہو جائے گا اور قرآن و سنت کو ملک کا بالاتر قانون قرار دینے کے بعد اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کی طرف عملی پیشرفت کی راہ ہموار ہو گی۔

اس کے ساتھ ہی یہ عرض کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حکومت نے بل سے بہت سی متنازعہ شقیں نکال دی ہیں لیکن اس باوجود اسلامی احکام و قوانین کی تشریح و تعبیر کے حوالے سے بل میں ابہام بدستور باقی ہے، کیونکہ منظور شدہ بل کی شق ۵ یوں ہے:

> ''اس آرٹیکل کے احکام دستور میں شامل کسی امر کے باوجود کسی قانون یا عدالت کے کسی فیصلے پر مؤثر ہوں گے۔'' (بحوالہ روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اس شق کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جا رہا ہے کہ اس آرٹیکل کے تحت حاصل شدہ اختیارات کی رو

سے حکومت جو احکام جاری کرے گی، انہیں پہلے سے موجود تمام قوانین اور عدالتی فیصلوں پر بالادستی حاصل ہوگی۔ چنانچہ وفاقی شرعی عدالت کے سابق چیف جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن نے اس شق کا ذکر کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

> "لیکن تیسرا اور آخری امر "اس آرٹیکل کے احکام عدالت کے کسی فیصلے پر مؤثر ہوں گے" خاص توجہ چاہتا ہے۔ میرا ایقان (رجوع الی اللہ کے بعد) یہ کہتا ہے اس شق میں "کسی عدالت کے فیصلہ" کا ذکر خالی از علت نہیں ہے۔ میرے ایک قریب ترین عزیز نے جب اس بل کے متن کو اخبار میں پڑھا تو اسی وقت برملا اس کی زبان سے نکلا کہ "سود کے خلاف وفاقی شرعی عدالت کا فیصلہ نواز شریف کی داڑھ میں اٹکا ہوا ہے"۔ اور اللہ تعالیٰ سے اس دعا کے بعد کہ وہ مجھ پر اس کی حقیقت منکشف کر دے، میں کہتا ہوں کہ اس بل کا واحد اور بنیادی مقصد وفاقی شرعی عدالت کے سود کے خلاف فیصلہ سے نجات حاصل کرنا ہے۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ، لندن۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کا یہ تبصرہ بل کی منظوری سے پہلے کا ہے، لیکن چونکہ منظور شدہ بل میں بھی یہ شق جوں کی توں شامل ہے اس لیے یہ خدشہ بدستور موجود ہے۔ اور ہمارے نزدیک اس شق کا اصولی مطلب یہ ہے کہ اس کی منظوری کے بعد اسلام کی تعبیر و تشریح، اور کسی امر کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا حتمی اختیار صرف حکومت کو حاصل ہوگا، اور اس ضمن میں اس کے کسی فیصلے کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ حتیٰ کہ اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلٹ بینچ کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ممتاز عالم دین مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے اس بل کے منظور شدہ متن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک حالیہ مضمون میں تجویز پیش کی ہے کہ

> "ملکی آئین میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی فیصلے، قانون یا دستور کی کسی شق کو قرآن و سنت کے موافق یا خلاف قرار دینے کا اختیار وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلٹ بینچ کو ہو گا۔" (بحوالہ روزنامہ جنگ، لاہور ۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

بہرحال قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے اختیار کے حوالے سے منظور شدہ بل میں ابہام موجود

ہے۔ قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لا قرار دلوانے کے فیصلہ کا خیر مقدم کرنے اور اس مسرت کا اظہار کرنے کے باوجود ہم مذکورہ بالا خدشات سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اور حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس ابہام کو دور کیا جائے اور جید علماء کرام کو اعتماد میں لے کر قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کے اختیار کا کوئی ایسا فارمولا طے کیا جائے جو ملک میں کسی نئے فکری خلفشار کا باعث نہ بنے۔

مروجہ قوانین کی اسلامائزیشن کے لیے
اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۸ء)

صدر مملکت جناب محمد رفیق تارڑ نے گزشتہ دنوں اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی ہے کہ حکومت سپریم کورٹ سے اپنی وہ اپیل واپس لے لے گی جو اس نے سودی قوانین کو غیر اسلامی قرار دینے کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف دائر کر رکھی ہے۔ جبکہ اجلاس میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر شیر زمان نے صدر سے یہ استدعا کی تھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش کے مطابق یہ رٹ واپس لے لی جائے کیونکہ سودی نظام کو جاری رکھنے پر اصرار قرآن کریم کے ارشاد کی رو سے اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے مترادف ہے۔

کونسل کے چیئرمین نے کونسل کی طرف سے دیگر سفارشات بھی اس موقع پر صدر مملکت کے گوش گزار کی ہیں۔ ان میں اتوار کی ہفتہ وار تعطیل ختم کر کے جمعہ کی چھٹی بحال کرنے اور ملک میں رائج جوئے کی مختلف صورتوں کو ختم کرنے کی تجاویز بھی شامل ہیں۔ اور اس کے ساتھ یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ پارلیمنٹ میں قرآن و سنت کے منافی قانون سازی کو روکنے کے لیے یہ طریق کار اختیار کیا جائے کہ اسمبلی یا سینٹ میں کوئی بل بحث کے لیے منظور ہو تو اسے متعلقہ ایوان کی مجلس قائمہ کے ساتھ ساتھ اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی ریفر کر دیا جائے تاکہ کونسل اس کے بارے میں قرآن و سنت کی روشنی میں بروقت رائے دے سکے۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جو ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ اس کونسل کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ سات سال کی مقررہ مدت کے اندر ملک کے تمام مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر ان کے بارے میں قرآن و سنت کی روشنی میں رپورٹ پیش کرے تاکہ اگر کوئی قانون یا کسی قانون کی کوئی دفعہ قرآن و سنت سے متصادم ہے تو اس میں ترمیم کر کے اسے قرآن و سنت کے مطابق

بنایا جاسکے۔ اور اس طرح دستور کی فراہم کردہ اس ضمانت کی عملی صورت سامنے آئے کہ ملک میں رائج تمام قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھال دیا جائے گا اور آئندہ کوئی قانون قرآن و سنت کے خلاف نہیں بنایا جاسکے گا۔

۱۹۷۳ء کے دستور کے نفاذ کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل عمل میں آئی تو سات سال کی دستوری مدت پوری ہونے سے پہلے ہی بھٹو حکومت رخصت ہوگئی اور دستور معطل کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کی از سرِ نو تشکیل ہوئی اور اس کے ڈھانچے میں کئی بار تبدیلیاں ہوئیں مگر صدر ضیاء الحق مرحوم کے ۹۰ دن کی طرح اسلامی نظریاتی کونسل کے سات سال بھی لمبے ہوتے چلے گئے۔ اس دوران اسلامی نظریاتی کونسل نے مروجہ قوانین کے جائزے اور متبادل اسلامی قوانین کی ترتیب کا بہت سا کام کیا۔ بالخصوص جسٹس (ر) ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی چیئرمین شپ کے دور میں کونسل نے خاصا کام نمٹا دیا مگر وہ حتمی رپورٹ تیار نہ کر سکی جو دستور کے نفاذ کے بعد سات سال کے اندر پیش کرنا ضروری تھی۔ اور جس رپورٹ کے پیش ہونے کے بعد پارلیمنٹ دستوری طور پر پابند ہے کہ وہ دو سال کے اندر اس رپورٹ کو قانون کی شکل دے اور اس کے مطابق ضروری قانون سازی کرے۔ چنانچہ طویل انتظار کے بعد جناب اقبال احمد خان کی چیئرمین شپ کے دور میں اسلامی نظریاتی کونسل نے حتمی رپورٹ مکمل کر کے حکومت کو پیش کر دی۔

اب دستور کے مطابق ملک میں رائج تمام قوانین کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی مکمل رپورٹ پارلیمنٹ کے سپرد کی جاچکی ہے جس میں متعدّد قوانین اور ان کی مختلف شقوں کا جائزہ لے کر ان کی شرعی حیثیت کا تعین کر دیا گیا ہے۔ اور کونسل نے جن قوانین اور دفعات کو قرآن و سنت سے متصادم محسوس کیا ہے ان کی جگہ متبادل قوانین کے مسودہ جات بھی رپورٹ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ دستور کے مطابق پارلیمنٹ اس بات کی پابند ہے کہ حتمی رپورٹ اس کے حوالے ہونے کے بعد دو سال کے اندر اس کے مطابق قانون سازی کرے۔ اس طرح قوم کا یہ دیرینہ خواب کسی حد تک پورا ہوتا نظر آرہا ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو اس کے بنیادی نظریہ اور مقصد قیام کے مطابق غیر اسلامی قوانین سے نجات مل جائے۔

مگر گزشتہ دنوں اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن مولانا سید امیر حسین گیلانی نے ایک ملاقات کے دوران بتایا کہ اندرون خانہ اس رپورٹ کو نظر ثانی کے بہانے ایک بار پھر اسلامی نظریاتی کونسل کے

پاس واپس بھجوانے کی سازش ہو رہی ہے جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح رپورٹ کی تیاری میں سات سال کی بجائے کم و بیش ربع صدی کا وقت صرف ہوگیا ہے، اسی طرح نظر ثانی کے نام پر بھی کچھ وقت اور حاصل کر لیا جائے اور قوانین کی اسلامائزیشن کا یہ عمل جتنا مؤخر ہو سکے اسے غنیمت سمجھا جائے۔ اگر یہ بات درست ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ کو پارلیمنٹ کے فلور پر آجانے کے بعد پھر نظر ثانی کے لیے کونسل کو بھجوانے کی کوئی تجویز واقعی چل رہی ہے تو یہ تجویز انتہائی افسوسناک ہے اور اسے دستور کے اسلامی تقاضوں سے انحراف اور اسلامائزیشن کے خلاف مکروہ سازش کے علاوہ اور کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا۔

اس لیے ہم صدر محترم سے اس موقع پر یہ گزارش ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس صورتحال پر ذاتی طور پر نظر رکھیں، وہ ملک کے سربراہ ہیں اور انہوں نے دستور کے تحفظ اور پاسداری کا حلف اٹھا رکھا ہے، اور وہ شخصی طور پر بھی ایک متدین، باشعور نظریاتی، اور عملی مسلمان کا تعارف رکھتے ہیں۔ اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل کے مذکورہ اجلاس میں کونسل کے چیئرمین نے کونسل کی طرف سے جو سفارشات اور تجاویز ان کے گوش گزار کی ہیں وہ حکومت کو ان پر عملدرآمد کے لیے تیار کریں، اور خود انہوں نے سود کی اپیل کے بارے میں کونسل کے فورم پر جو وعدہ کیا ہے اس کو پورا کرنے کا اہتمام کریں۔ صدر مملکت اس بات کی کڑی نگرانی فرمائیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی حتمی رپورٹ کو پارلیمنٹ کے فلور سے کونسل کے پاس نظر ثانی کے بہانے واپس بھجوانے کی کوئی سازش پروان نہ چڑھ سکے اور دستور کے مطابق پارلیمنٹ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر دو سال کے اندر قانون سازی کرے۔

حق مہر اور عورت کی مظلومیت

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۳ مارچ ۱۹۹۹ء)

گزشتہ دنوں خواتین کے حقوق کا دن منایا گیا، اس موقع پر ملک بھر میں خواتین کے حقوق کی وضاحت کے لیے اجتماعات ہوئے اور مختلف طبقات اور اہل دانش نے اپنے اپنے ذوق اور نقطۂ نظر کے مطابق خواتین کے حقوق پر روشنی ڈالی۔

خواتین بلاشبہ اس دور میں بہت مظلوم ہیں۔ ایک طرف آزادی کے نام پر عورت کو اس کے فطری تقدس اور عصمت و عفت سے محروم کرنے کی کوششیں جاری ہیں جبکہ دوسری طرف معاشرتی اقدار اور حدود و قیود کی جکڑبندیوں میں اس کی آزادی اور حقوق کا استحصال ہو رہا ہے۔ ستم خیزی کی انتہا یہ ہے کہ مادر پدر آزادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے بھی اسلام کے حوالے سے بات کہنے میں عافیت محسوس کر رہے ہیں اور ظالمانہ کلچر کی استحصالی اقدار کے علمبردار بھی عورت کو اپنے خول میں بند رکھنے کے لیے اسلام کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کشمکش میں اسلام اور عورت دونوں بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئے ہیں۔

آپ اسے اسلام کے نام پر بدترین استحصال اور ظالمانہ جبر کے سوا اور کیا عنوان دے سکیں گے کہ خود ہمارے ملک کے ایک حصے میں جاگیردار طبقہ کے بعض لوگ اپنی بیٹیوں کو وراثت کے حق سے محروم کرنے کے لیے ان کی شادی قرآن کریم سے رچا دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ اور باقاعدہ شادی کی تقریب کر کے نوجوان بیٹی کی گود میں قرآن کریم رکھ کر اسے کہہ دیتے ہیں کہ اس کی شادی اللہ تعالیٰ کے پاک کلام سے ہو گئی ہے (العیاذ باللہ)۔ اور یہ کہ اب اس نے ساری زندگی اسے تلاوت کرتے ہوئے بسر کرنی ہے۔

گزشتہ دنوں جب اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے سامنے آئی کہ اس نے ایسی شادی کو ناجائز قرار دیا ہے تو راقم الحروف نے عرض کیا کہ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ یہ شادی ناجائز ہے۔ بلکہ ایسا کرنے والوں کو قرآن کریم کی بے حرمتی کے جرم میں باقاعدہ سزا ملنی چاہیے کیونکہ یہ ایک عورت کے جائز اور شرعی حقوق کو پامال کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن مقدس کی کھلم کھلا توہین اور بے حرمتی

ہے کہ اسے ظلم واستحصال کے لیے آڑ بنایا جا رہا ہے۔ مگر مسئلہ چونکہ جاگیرداروں کا ہے اور اسے ہاتھ میں لینے سے عالمی سیکولر لابیوں اور اسلام دشمن قوتوں سے کوئی مفاد ملنے کی توقع نہیں ہے اس لیے محترمہ عاصمہ جہانگیر اور جناب ایس ایم ظفر کی تنظیموں سمیت کوئی این جی او اسے اپنا ایشو بنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ہمارے معاشرہ میں عورت کی مظلومیت کے بہت سے پہلو ہیں جن پر آواز اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اور صرف ضرورت ہی نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات و احکام کی رو سے بعض معاملات ایسے ہیں جن پر کلمہ حق بلند کرنا ہماری دینی ذمہ داریوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ مگر انسانی حقوق کی تنظیمیں اور این جی اوز تو رہیں ایک طرف، علماء کرام کی جماعتوں اور دینی تنظیموں کو بھی فرصت نہیں ہے کہ وہ ان امور کی طرف توجہ دیں اور ان کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کریں۔

عورت کے حقوق و فرائض کے بارے میں اسلامی تعلیمات و احکام کے حوالہ سے ہمارے ہاں اس قدر ابہام پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات عجیب و غریب قسم کی مضحکہ خیز صورتحال پیدا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اسلامی احکام میں کوئی ابہام نہیں، وہ قرآن و سنت میں بالکل واضح ہیں لیکن ہم ان تعلیمات سے عام لوگوں کو آگاہ کرنے میں ناکام ہیں۔ اور ابہام کی یہ افسوسناک فضا غلط فہمیوں اور شکوک و شبہات کو جنم دیتی ہے جس سے اسلام دشمن عناصر اسلام کے خلاف اپنی مہم میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خواتین کے حقوق کے اسی دن کے حوالہ سے راولپنڈی میں ہونے والی ایک تقریب کی رپورٹ نظر سے گزری جس کا اہتمام ہیومن رائٹس ایسوسی ایشن آف پاکستان نے کیا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر رضیہ ناصر نے کی جبکہ سینیٹر راجہ اورنگزیب اور سینیٹر راجہ حیدر اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ اس تقریب میں ایسوسی ایشن کے صدر کوکب اقبال ایڈووکیٹ کی طرف سے پیش کیے جانے والے مطالبات میں ایک مطالبہ یہ بھی شامل ہے کہ:

> ”عورت کی طلاق یا مرد کی دوسری شادی کو حق مہر کی ادائیگی کے ساتھ مشروط کیا جائے۔“

یہ مطالبہ پڑھ کر بے ساختہ سر پیٹ لینے کو جی چاہا کہ مہر کے بارے میں اس سطح کے پڑھے لکھے لوگوں کی معلومات کا یہ حال ہے تو ملک کے عام شہری بے چارے کس قطار میں ہیں؟

مہر کے بارے میں ہمارے ہاں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ اس صورت میں واجب

الادا ہوتا ہے جب خاوند فوت ہو جائے یا وہ عورت کو طلاق دے دے۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔ اس لیے کہ نکاح میں جو مہر مقرر ہوا ہے نکاح کے بعد میاں بیوی کے یکجا ہونے کے بعد وہ بہر حال واجب ہو جاتا ہے اور یہ خاوند کے ذمہ بیوی کا قرض ہے۔ حق مہر کا طلاق یا موت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور خاوند کو یہ بہر صورت ادا کرنا ہے۔ اگر خاوند اپنی بیوی کا حق مہر ادا نہیں کرے گا یا بلاوجہ ٹال مٹول سے کام لے گا تو شرعاً اسی طرح حق تلفی کا مجرم ٹھہرے گا جیسے کسی سے قرض لے کر واپس نہ کرنے والا شخص مجرم قرار پاتا ہے۔

مہر کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ سہاگ رات میں بیوی سے معاف کرا لیا جائے تو وہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ یہ بھی شرعاً غلط ہے، اس طرح معاف کرانے سے رقم معاف نہیں ہوتی۔ ہاں اگر خاوند مہر کی پوری رقم بیوی کے سپرد کر دے اور وہ اسے وصول کرنے کے بعد اپنی خوشی سے کسی دباؤ کے بغیر واپس کر دے تو الگ بات ہے۔

اسی طرح مہر کے بارے میں ایک مضحکہ خیز بات اس وقت سامنے آتی ہے جب بعض شادیوں میں دیگر رسوم پر لاکھوں روپے خرچ کرنے والے حضرات سے نکاح کے وقت مہر کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو بڑی سادگی سے کہہ دیتے ہیں کہ:

"جی وہی شرعی مہر بتیس روپے چھ آنے۔"

انا للہ وانا الیہ راجعون، مجھے تو ایسے موقع پر بہت غصہ آتا ہے اور موقع محل کی مناسبت سے ڈانٹ بھی دیتا ہوں کہ یہ شریعت آپ لوگوں نے کہاں سے نکال لی ہے؟ شرعاً مہر کا اصول یہ ہے کہ لڑکے کی مالی حیثیت کے مطابق جتنا اس وقت کے حالات کے مطابق مناسب اور باوقار ہو اتنا مہر مقرر کرنا چاہیے۔ یعنی اتنا زیادہ نہ ہو کہ لڑکے پر بوجھ ہو اور اتنا کم نہ ہو کہ لڑکی والوں کے لیے خفت کا باعث بنے۔ بلکہ احناف کے ہاں تو ایک حدیثِ نبویؐ کے مطابق دس درہم مالیت سے کم مہر مقرر کرنا شرعاً درست بھی نہیں ہے جو کہ تقریباً تین تولے چاندی بنتی ہے۔

پھر بعض دیندار حضرات مہرِ فاطمی کا تذکرہ کر دیتے ہیں مگر اس کا حساب ان کے ذہن میں نہیں ہوتا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کا مہر پانچ سو درہم مقرر کیا تھا جو وزن کے لحاظ سے ایک سو چھیالیس تولے سے کچھ اوپر چاندی بنتی ہے۔ بازار سے چاندی کا بھاؤ معلوم کر کے حساب کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ مہر فاطمی کی مقدار کتنی بنتی ہے۔

الغرض مہر کا مسئلہ بھی ہمارے معاشرہ میں عورت کی مظلومیت کا ایک پہلو ہے جو اول تو مناسب مقدار میں مقرر ہی نہیں کیا جاتا۔ پھر جو مقرر کیا جاتا ہے اس کی ادائیگی کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر ذہن کے کسی گوشے میں ادائیگی کا تصور موجود بھی ہو تو سہاگ رات میں شرمائی لجائی دلہن کے منہ سے ''معاف'' کا لفظ کہلوا کر خود کو بری الذمہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ یہ سراسر ظلم ہے، غصب ہے اور حق تلفی ہے۔ اور اس ضمن میں سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ پڑھے لکھے اور سربرآوردہ حضرات بھی مہر کے شرعی حکم سے واقف نہیں ہیں اور مطالبہ کر رہے ہیں کہ عورت کی طلاق یا مرد کی دوسری شادی کو حق مہر کی ادائیگی کے ساتھ مشروط کر دیا جائے۔

سودی نظام کے خاتمہ کی جدوجہد

(ہفت روزہ الہلال، اسلام آباد- ۵ مئی ۱۹۹۹ء)

...... چنانچہ غیر سودی بینکاری کے نظام کی تیاری کا کام شروع کر دیا گیا اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ محنت اسلامی نظریاتی کونسل نے کی، جس نے جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی سربراہی میں بلاسود بینکاری پر ایک جامع رپورٹ مرتب کر کے پیش کر دی، جس کی بنیاد پر ۱۹۸۴ء میں اس وقت کے وفاقی وزیر خزانہ جناب غلام اسحاق خان نے اپنی بجٹ تقریر میں یہ اعلان کیا کہ بلاسود بینکاری کا سسٹم طے کر لیا گیا ہے جو جامع اور قابلِ عمل ہے، اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے قوم کو یہ خوشخبری دی کہ اگلے سال کا پاکستان کا بجٹ مکمل طور پر غیر سودی ہو گا۔ مگر عملاً ایسا نہ ہو سکا اور سودی قوانین بدستور ملک میں نافذ العمل رہے۔

اس کے بعد جب وفاقی شرعی عدالت کے دائرہ اختیار سے مالیاتی قوانین کی استثنا کی دس سالہ مدت ختم ہوئی تو ملک کے بہت سے حلقوں نے سودی قوانین کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج کر دیا، اس وقت وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن تھے، جو اس سے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے کونسل کی طرف سے بلاسود بینکاری کی جامع رپورٹ پیش کر چکے تھے۔ اس لیے وفاقی شرعی عدالت نے کیس کی تفصیلی سماعت کے بعد ملک میں رائج تمام سودی قوانین کو غیر آئینی قرار دے دیا اور حکومت کو نوٹس دے دیا کہ وہ ایک مقررہ تاریخ تک متبادل قوانین نافذ کر دے، ورنہ یہ سارے سودی قوانین خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

بات کو آگے بڑھانے سے پہلے ملک بھر کے علماء کرام اور دینی کارکنوں کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی مذکورہ بالا رپورٹ کا خلاصہ اور وفاقی شرعی عدالت کا مذکورہ فیصلہ کراچی کے صدیقی ٹرسٹ نے الگ الگ کتابچوں کی صورت میں اردو زبان میں شائع کر دیا ہے اور تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام، اساتذہ، وکلاء، ماہرین معیشت اور دینی جماعتوں کے کارکنوں سے گزارش ہے کہ وہ ان دونوں کتابچوں کا ضرور مطالعہ کریں۔

وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلہ کو وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا جس پر اسے حکم

امتناعی مل گیا، اس کی وجہ سے سودی قوانین ابھی تک جاری و ساری ہیں۔ اور حکومت سے دینی جماعتوں کا یہ پیہم مطالبہ چلا آرہا ہے کہ وہ سود کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں دائر کردہ رٹ واپس لے۔ کچھ عرصہ پہلے وفاقی حکومت نے سپریم کورٹ سے یہ رٹ واپس لینے کی درخواست دائر کردی، مگراس کے ساتھ ہی وفاقی شرعی عدالت میں بھی سابقہ فیصلہ پر نظر ثانی کی درخواست دے دی جس میں سود کی بعض صورتوں کو حکم سے مستثنیٰ قرار دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ مگر سپریم کورٹ کے شریعت اپلیٹ بینچ نے جسٹس خلیل الرحمٰن خان کی سربراہی میں حکومت کی یہ درخواست واپس کرنے سے انکار کردیا اور اس کی باقاعدہ سماعت شروع کردی، جس کا دوسرا مرحلہ تین مئی کو شروع ہونے والا ہے۔

اس دوران سپریم کورٹ کے شریعت اپلیٹ بینچ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمٰن خان کو قائم مقام وفاقی محتسب اعلیٰ مقرر کیا جا چکا ہے اور انہوں نے نئے عہدہ کا چارج لے لیا ہے، اس لیے یہ ابہام پیدا ہو گیا ہے کہ وہ شریعت اپلیٹ بینچ میں بیٹھ سکیں گے یا نہیں؟ اور اگر نہیں بیٹھیں گے تو ان کی جگہ بینچ کا نیا سربراہ کون ہو گا؟ تاہم اس مضمون میں اس سلسلہ کی اشاعت تک یہ صورتحال واضح ہو چکی ہو گی۔......

شرعی احکام اور ہماری عدالتوں کے فیصلے

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ا جون ۱۹۹۹ء)

روزنامہ پاکستان لاہور ۷ مئی ۱۹۹۹ء کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے سندھ ہائی کورٹ کے جسٹس شائق عثمانی کے اس فیصلہ کو قرآنی احکام کی خلاف ورزی قرار دیا ہے جس میں وراثت میں لڑکی اور لڑکے کے حصہ کو برابر قرار دیتے ہوئے اس ضمن میں قرآنی حکم میں اجتہاد کی تجویز پیش کی گئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے دستور کی دفعہ ۲۰۹(۵)(٦) کے تحت صدر مملکت کو ریفرنس پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں ان سے استدعا کی گئی ہے کہ جسٹس مذکور کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں کاروائی عمل میں لائی جائے۔

خبر کے مطابق جسٹس شائق عثمانی نے ۳ مارچ ۱۹۹۹ء کو ایک مقدمہ کا فیصلہ سناتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں لڑکی کو باپ کی وراثت میں لڑکے سے نصف حصہ کی جو مقدار بیان کی گئی ہے وہ لڑکی کے کم از کم حصہ کا تعین ہے۔ اور یہ کہنا کہ یہ قانون ناقابلِ تبدیل اور ہمیشہ رہنے والا ہے، غلط تشریح کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یہ دعوی اصل میں مرد پرستی کے اس مزاج کا نتیجہ ہے جو ہمارے مزاج میں سرایت کر چکا ہے۔ اس لیے ایک اسلامی مملکت کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس میں ترمیم کر کے عورت کا حصہ بڑھا دے، جس طرح ترکی میں لڑکوں اور لڑکیوں کو وراثت میں برابر حصے کا حقدار تسلیم کیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے خاندانی قوانین یعنی نکاح، طلاق اور وراثت سے متعلقہ احکام میں ردوبدل پر ایک عرصہ سے زور دیا جا رہا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا کے مروجہ بین الاقوامی قوانین اسلام کے ان احکام سے مطابقت نہیں رکھتے، اور مسلم معاشرہ کے خاندانی نظام کو مغربی معاشرہ کے معیار پر لانے میں یہ اسلامی قوانین رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اس لیے مسلم حکومتوں پر دباؤ ہے کہ وہ قرآنی احکام پر اصرار کرنے کی بجائے مروجہ بین الاقوامی قوانین کو اپنے اپنے ملک میں نافذ کریں، اور قرآن وسنت کے جو احکام اور ضابطے ان بین الاقوامی قوانین سے متصادم ہیں ان میں ردوبدل کر لیں۔ اس سلسلہ میں پاکستان میں سب سے پہلی پیشرفت صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں عائلی قوانین کے نفاذ کے ساتھ ہوئی تھی، اور علماء کرام نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے عائلی قوانین کی متعدّد

دفعات کو قرآن و سنت کے صریحاً منافی قرار دیا تھا مگر ان کا یہ احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا، اور اب اسی کام کے باقی حصہ کی تکمیل کے لیے مسلسل ورک ہو رہا ہے۔

- گزشتہ سال سپریم کورٹ کے جج مسٹر جسٹس ناصر اسلم زاہد کی سربراہی میں قائم خواتین حقوق کمیشن نے جو سفارشات پیش کی تھیں ان میں بھی نکاح، طلاق اور وراثت کے اسلامی قوانین کو بین الاقوامی قوانین کے مطابق بنانے کے لیے اسی قسم کی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔
- اور اس کے بعد ہائی کورٹس کے متعدّد فیصلے اس سلسلہ میں سامنے آچکے ہیں جن میں قرآن و سنت کے صریح احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی مروجہ بین الاقوامی معیار کو سامنے رکھا گیا ہے۔
- جسٹس شائق عثمانی کے مذکورہ فیصلے کا پس منظر بھی یہی ہے۔
- اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کا احتجاج بالکل بجا ہے مگر صرف اتنی بات کافی نہیں ہے بلکہ دینی جماعتوں اور علمی مراکز کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس صورتحال کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں اور اسلامی احکام و قوانین کے تحفظ کے لیے مؤثر کردار ادا کریں۔

سودی نظام اور سپریم کورٹ کا تاریخی فیصلہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲ جنوری ۲۰۰۰ء)

سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت ایپلیٹ بینچ نے ہر قسم کے سود اور سودی کاروبار کو قرآن و سنت سے متصادم اور غیر اسلامی قرار دے کر فیصلہ دے دیا ہے کہ سود اور سودی کاروبار کے بارے میں تمام مروجہ قوانین ۳۱ مارچ ۲۰۰۰ء کو خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ جسٹس خلیل الرحمٰن خان، جسٹس منیر اے شیخ، جسٹس وجیہہ الدین اور جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی پر مشتمل ایپلیٹ بینچ نے وفاقی شرعی عدالت کے فیصلہ کے خلاف متعلقہ فریقوں کی اپیلوں کی طویل سماعت کے بعد یہ تاریخی فیصلہ صادر کیا ہے اور حکومت پاکستان کو ہدایت کی ہے کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ایک ماہ کے اندر کمیشن قائم کیا جائے جو دو ماہ کے اندر موجودہ مالیاتی نظام کو شریعت کے مطابق ڈھالے۔ جبکہ فیصلہ میں وزارت قانون کو ہدایت کی گئی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی معاونت سے ایک ماہ کے اندر ٹاسک فورس بنائی جائے جو اس بات کا جائزہ لے کہ اسلامی مالیاتی نظام کے لیے کون سے قوانین بنائے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے اختتام پر رمضان کے بابرکت مہینہ میں سپریم کورٹ کا یہ تاریخ ساز فیصلہ جنوبی ایشیا میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لیے مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کے قیام کے مقصد کی طرف ایک اہم اور فیصلہ کن پیشرفت ہے جس کا نہ صرف پاکستان بھر میں بلکہ پورے عالم اسلام میں خیر مقدم کیا جائے گا۔ اور یہ فیصلہ صادر کر کے عدالت عظمٰی کے معزز ججوں نے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی اس خواہش کی تکمیل کی ہے جس کا اظہار انہوں نے ۱۹۴۸ء میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر کیا تھا اور ملک کے ماہرین کو ہدایت کی تھی کہ وہ اقتصاد و معیشت میں مغرب کے ناکام استحصالی نظام کی پیروی کرنے کی بجائے اسلام کے فطری اصولوں پر پاکستان کے اقتصادی نظام کی بنیاد رکھیں۔......

جمعہ کی چھٹی اور اسلامی نظریاتی کونسل

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ مارچ ۲۰۰۰ء)

ہفت روزہ الہلال اسلام آباد ۱۸ فروری ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان نے حکومت کو سمری بھجوائی ہے جس میں جمعہ کی چھٹی کی بحالی کی تجویز پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات اور ملتِ اسلامیہ کی روایات کے مطابق ہفتہ وار تعطیل جمعہ کے دن ہی مناسب ہے، اور اس سلسلہ میں ملک بھر کی دینی جماعتیں اور عوامی حلقے ایک عرصہ سے مطالبہ کر رہے ہیں، اس لیے جمعہ کی سرکاری چھٹی بحال کر دی جائے۔

پاکستان میں جمعہ کی سرکاری چھٹی جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے دینی جماعتوں کے مطالبہ پر کی تھی جسے میاں نواز شریف نے اپنے دورِ حکومت میں منسوخ کر کے اتوار کی چھٹی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں عالمی طاقتوں کا دباؤ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے ایسا کیا۔ مگر ملک کے دینی حلقے اس کے بعد سے اس پر مسلسل احتجاج کر رہے ہیں اور اسے مغربی اقدام کی نقالی قرار دے کر جمعہ کی چھٹی کی دوبارہ بحالی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اس پس منظر میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی طرف سے حکومت کو بھجوائی جانے والی مذکورہ سمری ایک خوش آئند فیصلہ ہے جس کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ملک کے دینی و عوامی حلقوں کا مطالبہ پورا کرتے ہوئے جلد از جلد جمعہ کی چھٹی بحال کرنے کا اعلان کیا جائے۔

مشرف حکومت کے عبوری دستور میں اسلامی دفعات کی شمولیت

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ۱۱ اگست ۲۰۰۰ء)

چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف نے بالآخر دستورِ پاکستان کی اسلامی دفعات کو اپنے عبوری آئین کا حصہ بنانے کا اعلان کر دیا ہے، اور ان کے سیکرٹریٹ کی طرف سے جاری ہونے والے ایک اعلانیہ میں بتایا گیا ہے کہ

۱. قراردادِ مقاصد،
۲. اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے،
۳. قرآن و سنت کے منافی دستور سازی کی ممانعت،
۴. وفاقی شرعی عدالت،
۵. اسلامی نظریاتی کونسل،
۶. قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے،
۷. اور ملکی قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت

کے حوالے سے دستورِ پاکستان کی اسلامی دفعات عبوری آئین کا حصہ ہیں۔ جنرل پرویز مشرف کے برسراقتدار آنے کے بعد ان کی طرف سے دستورِ پاکستان کی معطلی اور عبوری دستوری آرڈر کے نفاذ کے ساتھ ہی ملک کے دینی حلقوں کی طرف سے یہ مطالبہ شروع ہو گیا تھا کہ دستور کی اسلامی دفعات کو عبوری آئین کا حصہ بنایا جائے۔ جس کے جواب میں جنرل پرویز مشرف اور ان کے رفقاء نے بارہا کہا کہ دستور کی اسلامی دفعات معطل نہیں ہیں، مگر دینی حلقوں نے اس وضاحت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور آخر کار چیف ایگزیکٹو نے دینی جماعتوں کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا، جس پر وہ پوری قوم کی طرف سے شکریہ اور تبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک جائز اور اصولی بات کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور دینی حلقوں کے موقف کو قبول کر لیا ہے۔

جنرل صاحب موصوف کے اس اعلان کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس ضمن میں ہم دو گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

۱. ایک یہ کہ ہم یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس اعلان سے ملک میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہو جائے گا۔ اور قرآن و سنت کے نظام کے عملی نفاذ کے لیے ابھی جدوجہد کا طویل، جانگسل اور صبر آزما مرحلہ باقی ہے۔ لیکن اس اقدام سے اصولی طور پر ملک کی اسلامی نظریاتی حیثیت کا تحفظ ضرور ہو گیا ہے۔ اور اسی مقصد کے پیش نظر دینی حلقے اس پر سنجیدہ اور یک آواز ہو گئے تھے۔ بالخصوص اس پس منظر میں کہ جنرل پرویز مشرف کے برسراقتدار آنے سے بہت سے بین الاقوامی حلقے اور ملک کے اندر بیرونی سرمائے کے بل بوتے پر کام کرنے والی این جی اوز کو یہ امید ہو گئی تھی، اور ان کی طرف سے اس کا اظہار بھی ہونے لگا تھا کہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کے لیے ان کی مہم کو اب تقویت حاصل ہو گی۔ لیکن جنرل پرویز مشرف نے ان کی خواہشات اور توقعات کو مسترد کر دیا ہے، جو ایک اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کے حوالے سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لیے بلاشبہ ایک نیک شگون ہے۔

۲. دوسری گزارش یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے جب عبوری آئین میں اسلامی دفعات کو باضابطہ شامل کرنے کا راستہ اختیار کر ہی لیا ہے تو اس کے منطقی تقاضوں کی طرف بھی انہیں اسی سنجیدگی کے ساتھ توجہ دینی چاہیے۔ اور اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ لیں اور انہیں قانونی شکل دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کریں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو سرکاری سطح پر قبول کر کے انہیں قانونی شکل دے دی جائے تو ملک میں اسلامی نظام کے عملی نفاذ اور قرآن و سنت کے قوانین و احکام کی بالادستی کے لیے اور کسی پیشرفت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور اگر جنرل پرویز مشرف ایسا کر گزریں تو یہ عمل نہ صرف دنیا کی تاریخ میں بلکہ آخرت میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بھی ان کی سرخروئی کا باعث بنے گا۔

دینی مدارس کو درپیش چیلنجز کے موضوع پر ایک اہم سیمینار

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۷ اور ۱۸ اگست ۲۰۰۰ء)

انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اسلام آباد نے ۱۳ اگست ۲۰۰۰ء کو "دینی مدارس اور درپیش چیلنجز" کے عنوان سے ایک مجلس مذاکرہ کا اہتمام کیا جس میں ملک کے منتخب ارباب علم و دانش نے شرکت کی اور دینی مدارس کے حوالہ سے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا۔ مجلس مذاکرہ کی تین نشستیں ہوئیں۔ پہلی نشست کی صدارت اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان، دوسری نشست کی صدارت قومی اسمبلی کے سابق رکن مولانا گوہر رحمان اور تیسری نشست کی صدارت نیشنل سکیورٹی کونسل کے رکن ڈاکٹر محمود احمد غازی نے کی۔ مجلس مذاکرہ کی کارروائی مجموعی طور پر تقریباً سات گھنٹے جاری رہی اور اس میں مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں پروفیسر خورشید احمد، مولانا عبد المالک خان، ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی، ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، پروفیسر افتخار احمد بھٹہ، ڈاکٹر محمد میاں صدیقی، مولانا محمد صدیق ہزاروی، مولانا محمد حنیف جالندھری، سید ریاض حسین نقوی، جناب خالد رحمان، ڈاکٹر ممتاز احمد اور مولانا سید معروف شاہ شیرازی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں جبکہ ڈاکٹر خالد علوی اور پروفیسر یاسین ظفر کے مضامین پڑھ کر سنائے گئے۔ دیگر شرکاء میں ڈربن یونیورسٹی (جنوبی افریقہ) کے شعبہ اسلامیات کے سابق سربراہ پروفیسر ڈاکٹر سید سلمان ندوی نمایاں تھے جو تحریکِ پاکستان کے عظیم راہنما حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فرزند ہیں۔

مجلس مذاکرہ میں راقم الحروف کو بھی اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی اور میں نے "دینی نظام تعلیم: اصلاح احوال کی ضرورت اور حکمت عملی" کے عنوان سے اپنی گزارشات تحریری صورت میں پیش کیں جو قارئین اسی کالم میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ان معروضات کو کم و بیش سب شرکاء نے پسند کیا اور پروفیسر خورشید احمد نے اعلان کیا کہ ان گزارشات کو مجلس مذاکرہ کی مجموعی سفارشات کی حیثیت دی جا رہی ہے۔

مجلس مذاکرہ میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مقررین نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں معاشرہ میں دینی تعلیم کو باقی رکھنے اور اسلامی علوم و روایات کے تحفظ میں دینی مدارس کے کردار کا اعتراف نمایاں تھا، اور دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری کے تحفظ کے لیے بھی سب حضرات کے جذبات یکساں تھے۔ البتہ آزادانہ کردار اور خود مختاری کو برقرار رکھتے ہوئے دینی مدارس کے نظام و نصاب میں دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق اصلاح و ترمیم کی ضرورت کی طرف اکثر حضرات نے توجہ دلائی اور دینی مدارس کے وفاقوں پر زور دیا کہ وہ اس ضرورت کا احساس کریں اور دینی مدارس کے معاشرتی کردار کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے بہی خواہ اور مخلص حلقوں کی طرف سے پیش کی جانے والی سفارشات و تجاویز کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں۔

بعض اربابِ دانش نے اس نکتہ کی طرف توجہ دلائی کہ ملک کے نظام کو چلانے اور صالح رجال کار فراہم کرنے کے لیے دینی مدارس پر جو زور دیا جا رہا ہے اس کی اصل ذمہ داری تو ریاستی نظام تعلیم پر عائد ہوتی ہے۔ جبکہ نصف صدی گزر جانے کے باوجود ریاستی نظام تعلیم میں کوئی بامقصد تبدیلی سامنے نہیں آئی اور ملک کے ریاستی نظام تعلیم کے اربابِ حل و عقد سرے سے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہے۔ بلکہ اگر ملک کے مروجہ ریاستی نظام تعلیم میں اسلامی مقاصد اور ضروریات کو شامل کرنے کی طرف کسی جانب سے توجہ دلائی جاتی ہے تو اسے یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جناب ڈاکٹر ایس ایم زمان کا یہ انکشاف بطور خاص قابلِ توجہ ہے کہ انہوں نے کچھ عرصہ قبل لاء گریجویٹس کے لیے ایل ایل بی کے نصاب میں اسلامی قوانین کے اضافہ کے ساتھ نصاب کا دورانیہ دو سال کی بجائے تین سال کر دینے کی تجویز پیش کی، مگر ان سفارشات کا جائزہ لینے والی کمیٹی نے جس میں متعدّد لاء کالجز کے پرنسپل حضرات بھی شامل تھے کورس کا دورانیہ دو سال سے تین سال کرنے کی تجویز تو منظور کر لی مگر اسلامی قوانین کے جس نصاب کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی گئی تھی اس کا بمشکل پانچ فیصد حصہ کورس میں شامل کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے مروجہ نظام تعلیم کو اسلامی مقاصد و ضروریات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اس نظام تعلیم کے کار پردازان کی دلچسپی کا عالم کیا ہے۔

چنانچہ اسی بنیاد پر مولانا گوہر رحمان نے زور دے کر یہ بات کہی کہ دینی مدارس کے نصاب میں ضروری اصلاحات سے ہمیں انکار نہیں اور ہم بتدریج ایسا کر بھی رہے ہیں لیکن اس سے بات نہیں بنے

گی اور ملک کے سیاسی، انتظامی، عدالتی اور عسکری شعبوں کو دینی لحاظ سے تربیت یافتہ افراد کار مہیا کرنے کا مقصد پورا نہیں ہو گا۔ بلکہ اس کے لیے ملک کے ریاستی نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور سرکاری نصاب تعلیم کو مکمل طور پر تبدیل کر کے اسے قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے کیونکہ یہ ذمہ داری بنیادی طور پر اسی نظام کی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس نظام میں تبدیلی کی طرف تو کوئی توجہ نہیں دے رہا اور دینی مدارس کے نظام و نصاب میں تبدیلی کے لیے چاروں طرف سے شور مچایا جا رہا ہے۔

بعض مقررین نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ دینی مدارس کے طلبہ اور عصری کالجز کے طلبہ میں اجنبیت کو دور کرنے کے لیے سنجیدہ اقدامات کی ضرورت ہے اور اس کے لیے اس نوعیت کے پروگراموں کا اہتمام ہونا چاہیے کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ عصری کالجوں میں جا کر جدید علوم کی تعلیم حاصل کر سکیں، اور کالجوں کے فاضل نوجوانوں کو دینی مدارس میں جا کر درس نظامی کا کوئی مختصر کورس کرنے کی سہولت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ طلبہ کے وفود کے باہمی تبادلہ، تعلیمی اداروں کے دوروں اور مشترکہ مجالس کے اہتمام کے ذریعے بھی اس سلسلہ میں مؤثر پیشرفت ہو سکتی ہے۔

مجلس مذاکرہ میں دینی مدارس کے دائرہ میں وسعت اور پھیلاؤ کا ذکر کیا گیا کہ مختلف اطراف سے مخالفت کے باوجود دینی مدارس کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور طلبہ و طالبات کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ ایک مقرر نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ریاستی نظام تعلیم اپنے مقاصد کے حوالہ سے ناکام ہو چکا ہے کیونکہ لاکھوں ڈگری یافتہ افراد بے روزگاری کا شکار ہیں اس لیے اب نوجوان ادھر سے مایوس ہو کر دینی تعلیم کی طرف آ رہے ہیں تاکہ اگر دنیا کا فائدہ نہ ہو تو کم از کم دین تو ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے کہا کہ خود ان کی زیر نگرانی ایک ہائی اسکول سے گزشتہ سال بیس طالبات نے میٹرک پاس کیا جن میں سے صرف پانچ طالبات کالج میں گئی ہیں جبکہ باقی پندرہ طالبات نے مزید تعلیم کے لیے دینی مدارس کو ترجیح دی ہے۔

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کی مجلس مذاکرہ میں پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد کے بارے میں ایک سروے رپورٹ پیش کی گئی جس میں بتایا گیا کہ وفاقی وزارت تعلیم کی سروے مہم کے نتیجہ میں جو معلومات سامنے آئی ہیں ان کے مطابق ملک میں دینی مدارس کی تعداد اس وقت چھ ہزار سے زیادہ ہے جن میں مجموعی طور پر ساڑھے دس لاکھ کے قریب طلبہ اور طالبات قرآن و سنت، فقہ

اسلامی اور دیگر اسلامی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں، دینی تعلیم حاصل کرنے والی طالبات کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، بیرونی ممالک کے اٹھائیس ہزار کے قریب طلبہ ان مدارس میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جبکہ اساتذہ کی تعداد تیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ سروے رپورٹ کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ محکمہ تعلیم کی طرف سے ان مدارس کی امداد کے لیے جو رقم مختص کی جاتی ہے اس کا آغاز ایک لاکھ روپے سالانہ سے ہوا تھا اور اب یہ پندرہ لاکھ روپے سالانہ تک پہنچی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ دلچسپ واقعہ بھی بتایا گیا کہ جس دور میں سید فخر امام صاحب وزیر تعلیم تھے دینی مدارس کی امداد کے لیے محکمہ تعلیم کی طرف سے دس لاکھ روپے کی منظوری دی گئی اور وزارت کے افسران کے ایک اجلاس میں وفاقی وزیر تعلیم کی طرف سے افسران پر زور دیا گیا کہ رقم کی تقسیم میں مدارس کے معیار اور کوالٹی کا لحاظ رکھا جائے۔ اس پر اجلاس میں موجود وزارت تعلیم کے ایک افسر نے وزیر تعلیم موصوف سے گزارش کی کہ جناب والا اس وقت دینی مدارس میں طلبہ کی جتنی تعداد تعلیم حاصل کر رہی ہے اس کے حساب سے محکمہ تعلیم کی عطا کردہ دس لاکھ روپے کی اس رقم کو تقسیم کیا جائے تو فی طالب علم پچیس پیسے سالانہ بنتے ہیں۔ وزیر تعلیم نے اس کا کوئی جواب نہ دیا مگر ان کا یہ اصرار قائم رہا کہ رقم تقسیم کرتے ہوئے مدارس کے معیار اور کوالٹی کا بہر حال لحاظ رکھا جائے۔

مجلس مذاکرہ میں امریکہ کی ہیمپٹن یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ممتاز احمد بھی شریک تھے جو جنوبی ایشیا کے دینی مدارس کے بارے میں سروے کر رہے ہیں اور حال ہی میں بنگلہ دیش کا دورہ کر کے واپس آئے ہیں۔ انہوں نے اپنے خطاب میں بنگلہ دیش کے دینی مدارس کے بارے میں اپنی سروے رپورٹ کا خلاصہ پیش کر کے شرکائے محفل کو چونکا دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش میں دینی تعلیم دینے والے مدارس کی تعداد اس وقت اٹھارہ ہزار سے زائد ہے جن میں ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ طلبہ اور طالبات تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں ساڑھے چھ ہزار مدارس وہ ہیں جو عوامی چندہ سے چلتے ہیں، ان مدارس کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی ہے جنہیں حکومت کی طرف سے امداد دی جاتی ہے جو مختلف مدارج میں اخراجات کے اسی فیصد تک بھی جا پہنچتی ہے، جبکہ کچھ دینی مدارس ایسے ہیں جو صرف حکومت کے خرچہ پر قائم ہیں۔ اور اس سال بنگلہ دیش کی حکومت نے اپنے بجٹ میں دینی مدارس کے لیے جو رقم مخصوص کی ہے اس کی تعداد پانچ ارب ٹکہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کی حکومت نے ان دینی مدارس کو بند کرنے کا پروگرام بنایا تھا، ان مدارس پر الزام

تھا کہ انہوں نے پاکستان کی حمایت کی ہے اور ان سے فارغ ہونے والے علماء بنگلہ قومیت کی بجائے اسلام کی بات کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا جس نے رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ ان مدارس کو بند کر دیا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مجیب حکومت نے ایک عوامی سروے کا بھی اہتمام کیا جس کی رپورٹ حیران کن تھی کیونکہ اس کے مطابق ملک کے نوے فیصد عوام نے جن میں جدید پڑھے لکھے حضرات کی اکثریت تھی دینی مدارس کو بند کر دینے کی تجویز کی سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی اور حکومت سے کہا تھا کہ وہ دینی مدارس کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد نے بتایا کہ اس سلسلہ میں بنگلہ دیش کے عوامی حلقوں میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ اسی دوران ایک روز مولانا عبد الحمید بھاشانی نے شیخ مجیب الرحمٰن کی گاڑی کو ایک سڑک پر جاتے ہوئے راستہ میں رکوا کر ان سے کہا کہ آپ کی بہت سی باتیں برداشت کرتا رہا ہوں اور اب بھی کر رہا ہوں مگر دینی مدارس بند کرنے کی بات برداشت نہیں کروں گا اور اگر اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس کی مزاحمت کے لیے میں خود میدان میں آؤں گا۔ چنانچہ شیخ مجیب الرحمٰن نے دینی مدارس پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا اور بنگلہ دیش میں دینی مدارس پوری آزادی اور پہلے سے زیادہ وسعت کے ساتھ دینی خدمات میں مصروف ہیں۔

اس موقع پر پروفیسر خورشید احمد نے ترکی کے تجربہ کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ ترکی میں اتاترک کے دور میں دینی مدارس کو بالکل بند کر دیا گیا تھا اور دینی تعلیم ہر سطح پر ممنوع قرار دے دی گئی تھی جو کم و بیش پینتیس سال تک مسلسل ممنوع رہی۔ جبکہ ساٹھ کی دہائی میں وزیراعظم عدنان میندریس شہیدؒ نے یہ پابندی اٹھا کر ابتدائی اور ثانوی سطح پر دینی تعلیم کی اجازت دے دی جس کے بعد دینی مدارس قائم ہوئے اور ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان سول اور فوج کے مختلف محکموں میں جانے لگے جس کا نتیجہ عظیم فکری اور ذہنی انقلاب کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے کہ ترکی میں اسلامی بیداری کی لہر نے پوری قومی زندگی کا احاطہ کر لیا ہے اور اسی سے پریشان ہو کر سیکولر فوج نے اب پھر ترکی کے مدارس میں قرآن و سنت کی تعلیم کو ممنوع قرار دے دیا ہے۔ لیکن دینی تعلیم کا پہلا دور اپنا اثر دکھا چکا ہے اور ترکی میں اب اسلامی بیداری کو دبانا ممکن نہیں رہا۔

مجلس مذاکرہ کے اختتامی خطاب میں نیشنل سیکیورٹی کونسل کے رکن ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بتایا کہ حکومت دینی مدارس کی آزادی اور خود مختاری پر یقین رکھتی ہے اور اس کا اس میں کسی قسم کی مداخلت کا

پروگرام نہیں ہے۔ البتہ وہ دینی مدارس کے نظام و نصاب میں اس قسم کی ترمیم و اصلاح ضرور چاہتی ہے کہ دینی مدارس کے فضلاء آج کے دور کے تقاضوں کو سمجھیں اور ان سے ہم آہنگ ہو کر آج کے عالمی تناظر میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔ انہوں نے کہا کہ حکومت دینی مدارس کے نظام میں کسی قسم کا دخل دیے بغیر دینی تعلیم کا ایک مستقل بورڈ قائم کرنے اور تعلیمی کونسل تشکیل دینے کا پروگرام بنا رہی ہے جس کے ساتھ رضاکارانہ طور پر منسلک ہونے کی دینی مدارس کو دعوت دی جائے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی حکومت بڑے شہروں میں ماڈل دارالعلوم قائم کرنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے جس کے لیے نصاب ترتیب دیا جا چکا ہے اور بہت جلد اس سلسلہ میں عملی پیشرفت کی جا رہی ہے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے وزیر داخلہ کی سفارشات اور حقیقتِ حال

(ہفت روزہ الہلال، اسلام آباد۔ ۱۴ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

وزیر داخلہ کی سفارشات اور حقیقتِ حال

وفاقی وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر نے گزشتہ روز ایک پریس کانفرنس میں اس ٹاسک فورس کی سفارشات کا اعلان کیا ہے جو ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بارے میں قائم کی گئی تھی۔ روزنامہ ایکسپریس کراچی کے ۳۰ ستمبر کے ادارتی نوٹ کے مطابق وزیر داخلہ نے جن سفارشات کا اعلان کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

- سرکاری انتظامیہ کا مؤثر احتساب۔
- اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قوانین میں ترامیم۔
- عدالتی کاروائیاں اردو زبان میں کرنا۔
- کسی کو کافر کہنے پر قانون کے مطابق کارروائی۔
- ہر قسم کی چاکنگ پر پابندی۔
- مذہبی جلوسوں کو اوقات اور مقررہ روٹس کا ہر حال میں پابند بنانے اور تعلیمی اداروں میں مذہبی جماعتوں کی سرگرمیوں پر پابندی۔

سرکاری انتظامیہ کا احتساب

جہاں تک سرکاری انتظامیہ کے مؤثر احتساب کی سفارشات کا تعلق ہے یہ ملک کے ہر باشعور شہری کے دل کی آواز ہے کیونکہ سرکاری اہل کاروں میں رشوت، بدعنوانی، نااہلی اور سفارش کی مذموم روایات جس طرح سرایت کیے ہوئے ہیں انہوں نے ملک کے پورے نظم ونسق کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ حتیٰ کہ اوپر سے نیچے تک کسی بھی سطح پر عوام کے جائز کام وقت پر اور سفارش و رشوت کے بغیر

ہونے کے تمام امکانات معدوم ہوتے جا رہے ہیں اور اس نے عوام کی مایوسی کو انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ پاکستان میں آنے والی ہر حکومت نے انتظامیہ کے احتساب کا اعلان کیا ہے مگر عملاً یہ کارروائی کسی دور میں بھی حکومت مخالف اہل کاروں کی چھانٹی اور باقی ماندہ کو خوفزدہ کر کے حکومتی ترجیحات کا پابند بنانے کے علاوہ کوئی نتیجہ نہیں دے سکی۔ اس لیے احتساب کے ان نعروں اور اعلانات پر اب کوئی بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارا انتظامی ڈھانچہ فرنگی استعمار کے نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے جس کی تشکیل ہمارے قومی مفادات اور ملی ضروریات کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ غیر ملکی آقاؤں کے مفادات و مقاصد کی تکمیل کے لیے کی گئی تھی۔ اور اب اس کی جگہ لوکلائزیشن اور ضلعی حکومتوں کے نام سے جو نیا انتظامی ڈھانچہ لانے کی باتیں ہو رہی ہیں اس میں بھی ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، اور عالمی استعمار کے گلوبلائزیشن کے سامراجی منصوبے پیش نظر ہیں۔ جبکہ ہمارا قومی ذہن استعماری قوتوں کے دائرہ اثر سے آزاد ہو کر اپنے مفادات اور قومی ضروریات کے حوالہ سے سوچنے کے لیے ابھی تک تیار ہی نہیں ہوا۔ اس لیے ملک کو ایک صحت مند اور باوقار انتظامی ڈھانچہ دینے اور انتظامی افسران کے مؤثر احتساب کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ذہنوں کو مغرب کی مرعوبیت سے آزاد کریں اور ملی مفادات کو اپنی پالیسیوں کی بنیاد بنائیں۔ ورنہ احتساب کے نام پر باہمی انتقام کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا اور انتظامیہ کی مشینری مزید خلفشار اور انارکی کا شکار ہوگی۔

مروجہ قوانین کی اسلامائزیشن کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانونی ترامیم اور اردو کو عدالتی زبان بنانے کی سفارش بھی بہت اہم ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے دستور کے مطابق اپنے ذمہ ڈیوٹی کو مکمل کرتے ہوئے ملک کے تمام رائج الوقت قوانین کا جائزہ لے کر قرآن و سنت کی روشنی میں ان میں ترامیم کی سفارشات بلکہ متبادل قوانین کے مسودات مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر دیے ہیں لیکن اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی جامع اور مکمل رپورٹ وزارت قانون کے ڈیپ فریزر میں منجمد پڑی ہے۔ اگر ان سفارشات کو قانون سازی کی بنیاد بنا کر ملک کے مروجہ قوانین میں ضروری ترامیم کر دی جائیں تو نہ صرف ملک کے عدالتی اور قانونی ڈھانچے میں صحت مند اور انقلابی تبدیلی رونما ہوگی بلکہ دستور میں قوم سے اسلامی قوانین کے عملی نفاذ کا

جو وعدہ کیا گیا ہے اس کی بھی تکمیل ہو جائے گی۔ اور اگر موجودہ حکومت یہ کام کر گزرے تو دیگر تمام تر مسائل کے باوجود تاریخ میں اس کا یہ کارنامہ ایک شاندار اور روشن باب کی صورت میں ہمیشہ کے لیے یاد گار رہے گا۔

کسی کو کافر کہنے پر پابندی

البتہ "کسی کو کافر کہنے پر پابندی" کی سفارش کے بارے میں ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ صرف کافر کہنے پر پابندی کافی نہیں ہوگی بلکہ ان امور کے کھلے بندوں اظہار پر پابندی لگانا بھی ضروری ہوگا جو کفر کے فتووں کا باعث بنتے ہیں۔ کیونکہ اگر کفریہ باتوں کے اظہار پر پابندی نہ ہو اور صرف کافر کہنے پر پابندی لگا دی جائے تو یہ یکطرفہ بات ہوگی جو سراسر ناانصافی ہے اور کوئی بھی معقولیت پسند شخص اس کو قبول نہیں کر پائے گا۔ جبکہ منطقی اور بدیہی بات یہ ہے کہ جہاں کفر کی باتوں کا اعلانیہ اظہار ہوگا تو اسے کفر قرار دینے پر پابندی کا کوئی عقلی اور اخلاقی جواز نہیں رہ جائے گا۔ اس لیے اس ضمن میں ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وفاقی شرعی عدالت یا اسلامی نظریاتی کونسل کے آئینی اداروں کے ذریعہ ان امور کا تعین کیا جائے جو کفر کا موجب بنتے ہیں اور جن کے اظہار کی اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کسی کو اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اس قانونی ضابطہ اور حدود کے تعین اور اعلان کے بعد بلا جھجھک یہ پابندی لگا دی جائے کہ اس سے ہٹ کر کوئی شخص یا گروہ کسی کو کافر کہے گا تو وہ قانون کی رو سے سزا کا مستوجب ہوگا۔ ورنہ کسی کو کافر کہنے کی یکطرفہ پابندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلام کے نام پر اور اسلامی نظام کے نفاذ کے وعدے کے ساتھ بننے والے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اگر کوئی شخص (نعوذ باللہ)

- اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کر دے،
- اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف پرچار شروع کر دے،
- عقیدۂ ختم نبوت سے بغاوت کر دے،
- قرآن کریم یا سنتِ نبویؐ کے خلاف ہرزہ سرائی کرے،
- حضرات انبیاء کرامؑ کی شان میں توہین کا ارتکاب کرے،
- یا صحابہ کرامؓ کے ایمان اور ان کی عدالت و دیانت پر حرف زنی شروع کر دے

تو اس پر تو کوئی قدغن نہیں ہوگی مگر جو شخص ان کے اس کفر کی نشاندہی کرے گا اور اس کے خلاف احتجاج کرے گا وہ قانون کی نظر میں مجرم قرار پائے گا۔ یہ انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے اور اس کے بارے

میں کسی بھی قسم کی قانونی پیشرفت کے نتائج انتہائی دوررس ہوں گے۔ اس لیے جذباتی اور سطحی انداز میں کوئی قدم اٹھانے سے قبل حکومت کو اس کے دونوں پہلوؤں کا جائزہ لینا ہوگا ورنہ فرقہ وارانہ کشیدگی ختم کرنے کی غرض سے کی جانے والی کارروائی اس کشیدگی میں کمی کی بجائے اس کی شدت میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہے۔

مذہبی جلوسوں پر مقررہ اوقات اور روٹس کی پابندی

اسی طرح مذہبی جلوسوں کے روٹس اور اوقات کے بارے میں بھی ٹھوس اور قابلِ عمل پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ امن عامہ کے قیام واستحکام کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ فرقہ وارانہ مذہبی رسوم وعبادات کو، جن میں جلسے اور جلوس بھی شامل ہیں، عبادت گاہوں تک محدود کر دیا جائے۔ یعنی چار دیواری اور عبادت گاہ کی حدود میں کسی فرقہ کی سرگرمیوں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہ ہو لیکن متنازعہ مذہبی رسوم کو مشترکہ پبلک مقامات بالخصوص ان علاقوں میں بجالانے کی قطعًا اجازت نہ ہو جہاں ان رسوم کو شرعًا جائز نہ سمجھنے والے لوگوں کی آبادی بھی ہو۔ ورنہ تنازعات پر قابو پانا ممکن نہیں رہے گا اور فرقہ وارانہ کشیدگی پر پابندی کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو پائے گی۔ حکومت اگر فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے میں سنجیدہ ہے تو اسے فرقہ وارانہ کشیدگی کا باعث بننے والی باتوں کو روکنے میں بھی سنجیدہ ہونا چاہیے کیونکہ اسباب ختم کیے بغیر نتائج پر قابو پانے کی خواہش ہوا میں تلوار چلانے کے مترادف ہے اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

کیا اسلامی نظام صرف مولویوں کا مسئلہ ہے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۴ نومبر ۲۰۰۰ء)

وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر نے یہ کہہ کر اسلامی نظام اور اس کی علمبردار دینی قوتوں کے خلاف ایک بار پھر وہی گھسی پٹی دلیلیں دہرائی ہیں جو اس سے قبل پچاس سال سے ہم سن رہے ہیں کہ ''الگ الگ جھنڈے اٹھا کر مذہبی جماعتیں ملک میں کون سا اسلام نافذ کرنا چاہتی ہیں اور اگر دینی جماعتیں واقعی موزوں، مفید اور مناسب طور پر یہ کام کر رہی ہیں تو وہ اب تک کے الیکشنوں میں اچھے نتائج کیوں نہیں دکھا پائیں؟''

یہ بات پاکستان کے قیام کے بعد ہی سیکولر حلقوں نے کہنا شروع کر دی تھی کہ ملک میں مختلف دینی مکاتبِ فکر ہیں اور اسلام کی الگ الگ تعبیر و تشریح کر رہے ہیں، اس لیے یہاں کون سا اسلام نافذ کیا جائے گا؟ لیکن تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے تحریکِ پاکستان کے عظیم راہنما علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت اسلامی نظام کی ۲۲ متفقہ دستوری بنیادیں طے کر کے اس بات کو رد کر دیا تھا اور قوم کو یہ بتا دیا تھا کہ مختلف مکاتبِ فکر اور فقہی مذاہب میں فروعات، جزئیات اور تعبیرات میں جو اختلافات موجود ہیں ان کا اسلامی نظام (کے نفاذ) سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسلامی نظام کے اصولوں، طریق کار اور احکام و قوانین کے ضوابط پر وہ سب متفق ہیں۔ اس اتفاق و اجتماع میں اہل السنۃ والجماعۃ اور اہل تشیع دونوں شامل تھے۔ اہل سنت کے تمام مکاتبِ فکر دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث اور جماعتِ اسلامی کے اکابر شریک تھے اور کوئی مسلمہ مذہبی مکاتبِ فکر اس سے باہر نہیں تھا۔ اس لیے یہ دلیل اسی وقت دم توڑ گئی تھی کہ ملک میں کون سا اسلام نافذ کیا جائے اور کس مذہبی مکتبِ فکر کی تعبیر و تشریح کو نفاذ اسلام کی بنیاد بنایا جائے؟

جناب معین الدین حیدر کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان دستوری نکات اور خاکہ پر آج بھی ملک کے تمام مکاتبِ فکر متحد ہیں اور کسی مذہبی فرقہ کو ان سے کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے اگر وزیر داخلہ اور ان کے رفقاء ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے اصولوں سے متفق ہیں تو انہیں ''کون سا اسلام'' کی بے جارٹ چھوڑ کر تمام مکاتبِ فکر کے متفقہ ۲۲ دستوری نکات کو دستورِ پاکستان میں سمو کر

ان کی بنیاد پر نفاذ اسلام کا آغاز کر دینا چاہیے۔

پھر یہ دلیل اس وقت بھی دہرائی گئی تھی جب ۱۹۷۳ء کے دستور کے لیے دستور ساز اسمبلی میں بحث ہو رہی تھی اور دستور ساز اسمبلی میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا عبد المصطفٰی ازہریؒ، مولانا محمد ذاکر اور پروفیسر غفور احمد سمیت تمام بڑے مکاتبِ فکر کے نمائندے موجود تھے۔ اس وقت حکمران کیمپ کی طرف سے چیلنج کیا گیا تھا کہ یہ علماء تو مسلمان کی قانونی تعریف پر متفق نہیں ہو سکتے اس لیے اسلامی نظام کی متفقہ تعبیر کہاں سے لائی جائے گی مگر ان علماء کرام نے دستور ساز اسمبلی میں نہ صرف مسلمان کی متفقہ تعریف پیش کی بلکہ دستور میں اسلامی نکات کی شمولیت کے لیے متحد ہو کر پارلیمانی جنگ لڑی جس کے نتیجے میں حکمران کیمپ کو اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دینا پڑا اور ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھال دینے کی ضمانت دینا پڑی۔ اسمبلی میں موجود علماء کے اس موقف کو اسمبلی سے باہر کے تمام علماء کرام اور مکاتبِ فکر کی تائید حاصل تھی اور پوری قوم اس پر متفق تھی لیکن دستوری ضمانت کے باوجود ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا اور قوم بدستور انتظار میں ہے۔

وزیر داخلہ جناب معین الدین حیدر سے گزارش ہے کہ اسی دستور نے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی ہے جس میں نہ صرف تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام شامل ہیں بلکہ عصری قانونی نظام کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ اس کونسل نے ملک کے قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جو مسودات مرتب کیے ہیں اور جو سفارشات پیش کی ہیں ان پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام کا اجماع اور اتفاق ہے۔ اور ۲۲ دستوری نکات کی اصولی اور آئینی دستاویز کے بعد ملکی قوانین کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ جامع اور مکمل رپورٹ دوسری بڑی دستاویز ہے جو متفقہ ہے جس سے ملک کے کسی مسلمہ مذہبی مکتبِ فکر کو اختلاف نہیں اور اس میں تمام مروجہ قوانین کے بارے میں تفصیلی تجزیہ اور سفارشات موجود ہیں۔ اس لیے جب دستور اور قانون دونوں معاملات میں قائم مذہبی جماعتوں کا اتحاد موجود ہے اور ریکارڈ پر ہے تو ہمارے وزیر داخلہ محترم علماء کرام سے اور کس قسم کے اتحاد کا تقاضا کر رہے ہیں اور انہیں مذہبی جماعتوں کے الگ الگ جھنڈوں میں کون سا ایسا اختلاف نظر آرہا ہے جو اسلامی نظام کے نفاذ میں رکاوٹ بن سکتا ہو؟

وزیر داخلہ صاحب نے دوسری بات یہ کی ہے کہ اگر مذہبی جماعتیں مفید ہیں تو انہیں الیکشن میں

عوامی حمایت حاصل کیوں نہیں ہوتی؟ ہمارا ان سے سوال یہ ہے کہ اگر عوامی حمایت ہی واحد معیار ہے اور انہوں نے سارے فیصلے اس کی کسوٹی پر پرکھ کر کرنے ہیں تو ان کے پاس بھاری عوامی مینڈیٹ رکھنے والی حکومت اور قومی اسمبلی کو توڑنے کا کیا جواز ہے؟ بے شک عوام نے مولویوں کی حمایت نہیں کی تھی مگر اس اسمبلی کو تو ووٹ دیے تھے، اسے توڑ کر جناب معین الدین حیدر وزارت داخلہ کا قلمدان کس اصول کے تحت سنبھالے ہوئے ہیں؟ ہماری گزارش کا یہ مطلب نہیں کہ ہم موجودہ حکومت کے قانونی اور اخلاقی جواز کو چیلنج کر رہے ہیں بلکہ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ حکومت کا وجود اور اس میں جناب معین الدین حیدر کا وزارت داخلہ کے منصب کو سنبھالنا اس بات کی دلیل ہے کہ قومی معاملات میں عوامی حمایت اور ووٹنگ پاور واحد معیار نہیں ہے بلکہ اس کے ہوتے ہوئے بھی بعض دیگر امور کی طرف دیکھنا اور انہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے اور بسا اوقات قومی مفاد کے دیگر معاملات عوامی حمایت اور ووٹنگ پاور سے زیادہ اہمیت اختیار کر جاتے ہیں حتیٰ کہ ان کی خاطر عوامی ووٹوں سے منتخب ہونے والی اسمبلیوں اور حکومتوں کو برطرف کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا معاملہ بھی ان اہم ترین قومی امور اور ملی معاملات میں سے ہے جنہیں صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا پرچم اٹھانے والی جماعتوں کو الیکشن میں ووٹ نہیں ملتے۔ یہ ہمارے ایمان کا معاملہ ہے، پاکستان کی نظریاتی بنیاد کا مسئلہ ہے اور ملکی بقا و استحکام کا تقاضا ہے اور اسے اسی حوالہ سے دیکھنا ہوگا۔ ہم مانتے ہیں کہ دینی جماعتوں میں اختلافات موجود ہیں جو اسلامی دستور اور قوانین کے کسی مسئلہ یا ان کے نفاذ کے طریق کار پر نہیں ہیں بلکہ غیر متعلقہ امور اور قیادت کی ترجیحات پر ہیں، اور ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دینی جماعتوں اور ان کی قیادتوں کی یہ باہمی معاصرت اور ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ کر آگے بڑھنے کی کشمکش نفاذ اسلام کی جدوجہد کے لیے سخت نقصان دہ ہے اور اسی وجہ سے انہیں انتخابات میں عوامی حمایت حاصل نہیں ہوتی۔ ورنہ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی دینی قوتیں متحد ہوئی ہیں عوام نے ان کے پرچم تلے مجتمع ہونے میں کبھی دیر نہیں لگائی۔

لیکن اس سب سے قطع نظر ہم جناب معین الدین حیدر سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ الگ الگ جھنڈے اٹھانے والی مذہبی جماعتوں کو ایک طرف رہنے دیں، انہیں آپس میں لڑنے جھگڑنے دیں، انہیں بھول جائیں اور صرف یہ دیکھیں کہ اسلام ہماری ملی ضرورت اور قومی تقاضا ہے۔ آپ خود

مسلمان ہیں، قرآن و سنت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسلامی نظام و قوانین کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں، اس لیے جب آپ کے پاس اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت جیسے دستوری اداروں کے مرتب کردہ اسلامی قوانین کے مسودات موجود ہیں تو پھر آپ کو انتظار کس بات کا ہے؟ آپ انہیں نافذ کیوں نہیں کر دیتے اور دنیا کو یہ کیوں نہیں بتا دیتے کہ یہ مذہبی جماعتیں تو خود کو اس کا اہل ثابت نہیں کر سکیں مگر ہم نے پاکستان میں اسلامی نافذ کر دیا ہے اور نوآبادیاتی دور کے استحصالی نظام سے ملک کی جان چھڑا کر قرآن و سنت کے عادلانہ قوانین و احکام کی عملداری قائم کر دی ہے۔ اور اگر وزیر داخلہ صاحب ناراض نہ ہوں تو ڈرتے ڈرتے ان سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا اسلامی نظام صرف مولویوں اور مذہبی جماعتوں کا مسئلہ ہے، آپ کا مسئلہ نہیں ہے؟ اور اگر یہ آپ کا مسئلہ بھی ہے تو پھر بال کو مولویوں کی کورٹ میں پھینک کر آپ خود کو ہر ذمہ داری سے بری الذمہ ظاہر کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟

خسر اور خوشدامن کی وراثت میں حصہ داری کی سفارش

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - ا فروری ۲۰۰۱ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۲۴ جنوری ۲۰۰۱ء کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے ”خواتین حقوق کمیشن“ کی رپورٹ میں شامل اس سفارش کو شرعی اصولوں کے منافی قرار دیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ میاں بیوی کو ماں باپ کی طرح خسر اور خوشدامن کی وراثت میں بھی حصہ دار قرار دیا جائے۔

خواتین حقوق کمیشن نے اپنی سفارشات میں اس طرح کی اور بھی بہت سی تجاویز دی ہیں جن کا مقصد پاکستان میں نکاح و طلاق اور وراثت کے قوانین کو موجودہ عالمی معیار کے مطابق بنانا اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کے تابع کرنا بتایا جاتا ہے، اور انسانی حقوق کی تنظیموں اور کچھ دانشوروں کی طرف سے ان تجاویز اور سفارشات کے حق میں باقاعدہ مہم چلائی جا رہی ہے۔ اس سے قبل وراثت میں لڑکی اور لڑکے کا حصہ برابر کرنے، اور یتیم پوتے کو اپنے مرحوم باپ کی جگہ دادا کی وراثت میں حصہ دار قرار دینے کی تجاویز بھی سامنے آ چکی ہیں۔ مگر قرآن کریم، سنتِ نبویؐ اور اجماع امت کے صریح منافی ہونے کے باعث ملک کے دینی حلقے اس قسم کی تجاویز کو مسترد کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس قسم کی غیر اسلامی سفارشات و تجاویز کا بروقت نوٹس لے کر حکومت کے ساتھ ساتھ ملک کے دینی حلقوں اور علمی مراکز کو بھی اس مہم سے خبردار کیا ہے، جو اسلام کے خاندانی نظام کو مغرب کی خواہشات کے مطابق سبوتاژ کرنے اور قرآن و سنت کے صریح احکام میں ردوبدل کے لیے انسانی حقوق کی آڑ میں چلائی جا رہی ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کے اس فیصلہ کو حکومت اور دینی حلقوں کی طرف سے سنجیدہ توجہ اور پذیرائی حاصل ہو گی۔

مولانا قاضی عبداللطیف کے دورۂ قندھار کے تاثرات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۷ جولائی ۲۰۰۱ء)

...... جے ٹی آئی کے کنونشن میں حضرت مولانا قاضی عبداللطیف سے بھی ملاقات ہوئی جو حال ہی میں قندھار سے ہوکر آئے ہیں۔ میں نے اخبارات میں ان کے دورہ قندھار کی خبر پڑھی تھی اور وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لیے ان سے ملاقات کا خواہشمند تھا، اس لیے ملاقات پر خوشی ہوئی اور ان سے قندھار کی تازہ ترین صورتحال پر تبادلۂ خیال ہوا۔

قاضی صاحب نے بتایا کہ امیرالمومنین ملا محمد عمر اور ان کے متعدّد وزراء سے ان کی ملاقات ہوئی ہے اور بعض اہم امور پر تفصیلی تبادلۂ خیالات ہوا ہے۔ قاضی صاحب کا کہنا ہے کہ امیرالمومنین اور ان کی کابینہ پورے اعتماد اور حوصلے کے ساتھ موجودہ صورتحال اور بین الاقوامی دباؤ کا سامنا کر رہے ہیں، اور کسی پریشانی اور گھبراہٹ کے بغیر وہ اپنے اس عزم پر قائم ہیں کہ عالمی دباؤ کے باوجود وہ افغانستان میں مکمل اسلامی نظام قائم کریں گے اور اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ میں کسی قسم کی لچک اختیار نہیں کریں گے۔

قاضی صاحب نے گفتگو کی بعض تفصیلات بتائیں تو قلبی خوشی ہوئی کہ بعض اہم باتیں جو موجودہ حالات کے تناظر میں طالبان حکومت کی قیادت سے میں خود کرنا چاہ رہا تھا، وہ مجھ سے بہتر انداز میں قاضی صاحب نے ان سے کہہ دی ہیں، اور طالبان قیادت نے ان سے اتفاق بھی کیا ہے۔ خاص طور پر افغانستان میں اسلامی نظام کے دستوری اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل میں میری خواہش تھی کہ طالبان حکومت پاکستان کی ”اسلامی نظریاتی کونسل“ کے کام سے استفادہ کرے، جو اسلامائزیشن کے علمی و فکری ہوم ورک کے طور پر نہ صرف پاکستان بلکہ پورے عالم اسلام میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ اور اسے علمی مواد اور ثقاہت کے حوالے سے یہ درجہ حاصل ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مسلم ملک اسلامائزیشن کے پروگرام میں اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔ مولانا قاضی عبداللطیف نے، جو خود بھی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے ہیں، بتایا کہ انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی بعض اہم سفارشات اور قانونی مسودات امیرالمومنین ملا محمد عمر حفظہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پیش کیے ہیں جس

پر انہوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان سے استفادہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد طالبان حکومت کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ حساس مسئلہ اسلامی حکومت کے دستوری اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل کا ہے۔ کیونکہ ایک واضح دستوری اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل اور اس کی بنیاد پر ایک عملی سوسائٹی کے قیام کے بعد ہی دنیا کے سامنے ایک صحیح اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ کا نقشہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ طالبان حکومت نے یہ مرحلہ اگر خیر و خوبی کے ساتھ طے کر لیا تو ان کی اسلامی حکومت نہ صرف دنیا بھر کی مسلم حکومتوں کے لیے آئیڈیل ثابت ہو گی، بلکہ گلوبلائزیشن کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے اس دور میں ایک نئے فطری اور عالمی نظام کی متلاشی اقوام کے لیے بھی راہنمائی کا سرچشمہ بنے گی۔ اللہ تعالیٰ کرے کہ ایسا ہی ہو، آمین ثم آمین۔

اسلامی نظریاتی کونسل اور ایک مسیحی شاعر

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۳ اگست ۲۰۰۱ء)

گزشتہ دنوں اسلامی نظریاتی کونسل نے سرکاری ملازمین کے لیے دفاتر میں نماز کی ادائیگی اور پابندی کے اہتمام کی سفارش کی تو ایک گونہ خوشی ہوئی کہ ملک میں عملاً نہ سہی، مگر سفارش اور تجویز کے درجہ میں تو ایک اسلامی ریاست کا تصور اعلیٰ حلقوں میں موجود ہے۔ کیونکہ نماز اسلام کے بنیادی فرائض میں سے ہے اور امیر المومنین حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ

میں اپنے اہلکاروں کی کارکردگی کا جائزہ نماز کے حوالے سے لیا کرتا ہوں، اور یہ سمجھتا ہوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا حق پابندی سے ادا کرتا ہے وہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرتا ہوگا، اور جسے اللہ تعالیٰ کے حق کی پرواہ نہیں ہے وہ لوگوں کے حقوق کا کب لحاظ رکھتا ہوگا۔

یہ امید نہیں تھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ سادہ اور فطری سی سفارش بھی طنز و اعتراض کا نشانہ بنے گی۔ اور خیال تھا کہ سبھی حلقے اس سفارش کی تائید کریں گے جس میں بندوں کو اپنے مالک اور خالق کے سامنے جھکنے اور اس کی بندگی کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ مگر لاہور سے شائع ہونے والے مسیحی ماہنامہ شاداب کا جولائی ۲۰۰۱ء کا شمارہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ یار لوگوں کو اس پر بھی اعتراض ہے۔ جیسا کہ پروفیسر گلزار وفا چوہدری کی ایک آزاد نظم شاداب میں ''افسوس'' کے عنوان کے تحت (اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش سے متاثر ہو کر) کے بریکٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے کہ

علماء نے حکومت وقت کو فرمایا ہے
وہ ایسا قانون بنائے جس کے نفاذ سے
فرض نماز سے غافل انسانوں کے حق میں
شہری سہولتیں اور سرکاری نوکری ممنوعہ ہو جائے

جس کے بعد لمبی نظم میں کہا گیا ہے کہ علماء یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں پر زندگی کا دامن تنگ ہو جائے اور وہ بھوک اور مشکلات سے دوچار ہوں تاکہ وہ عبرت پکڑیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سب کا رازق ہے، ان کا بھی جن کو علماء نے بہشت الاٹ کی ہے، اور ان کا بھی جن کو فقہاء نے دوزخ کے ایندھن کا نام دیا

ہے۔ پھر نظم کا اختتام اس بند پر کیا گیا ہے:

علماء اور فقہاء افسوس
تمہاری ذات وصفات کی شاخ شاخ
اچھے آثار سے
پاک نوشتوں کے ادوار
سے آج کے دن تک
خالی تھی اور خالی ہے

ظاہر ہے کہ نظم میں علماء وفقہاء کی ان باتوں کو اظہار افسوس اور طنز وتعریض کا نشانہ بنایا گیا ہے جن میں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی سے گریز اور احکام و قوانین کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیا اور آخرت میں ملنے والی سزا کا ذکر کرتے ہیں، اور بے نمازوں اور نافرمانوں کو خدا کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ شاعر نے علماء اور فقہاء کے ان ارشادات پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور ان کی بنیاد پر علماء وفقہاء کی ذات وصفات کو ''پاک نوشتوں کے ادوار سے خالی'' قرار دیا ہے۔

خدا جانے پروفیسر گلزار وفا چوہدری کے ہاں پاک نوشتوں کا اطلاق کس پر ہوتا ہے؟ ورنہ وہ پاک نوشتے جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات پر مشتمل ہیں، ان میں تو وہی کچھ ہے جو علماء وفقہاء کہتے ہیں۔ اگر وفا چوہدری صاحب کو یقین نہ ہو تو برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی، انار کلی، لاہور کی ۱۹۵۶ء کی شائع کردہ اردو کی ''کتاب مقدس'' (بائیبل) میں احبار باب ۲۶ کی ان آیات کا مطالعہ کر لیں جن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ

۱۔ ''تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ کوئی تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو اس لیے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔''

۲۔ ''اگر تم میری شریعت پر چلو اور میرے حکموں کو مانو اور ان پر عمل کرو تو میں تمہارے لیے بروقت مینہ برساؤں گا اور زمین سے اناج پیدا ہوگا اور میدان کے درخت پھلیں گے یہاں تک کہ انگور جمع کرنے کے وقت تک تم رہو گے اور جو تنے بونے کے وقت تک انگور جمع کرو گے اور پیٹ بھر کر اپنی روٹی کھایا کرو گے اور چین سے اپنے ملک میں بسے رہو گے اور میں ملک میں امن بخشوں گا اور تم سوؤ گے اور تم کو کوئی نہیں ڈرائے گا اور میں برے درندوں کو

ملک سے نیست کروں گا اور تلوار تمہارے ملک میں نہیں چلے گی۔"

۳. "لیکن اگر تم میری نہ سنو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو اور میری شریعت کو ترک کردو اور تمہاری روحوں کو میرے فیصلوں سے نفرت ہو اور تم میرے سب حکموں پر عمل نہ کرو بلکہ میرے عہد کو توڑ دو تو میں بھی تمہارے ساتھ اس طرح پیش آؤں گا کہ دہشت اور تپ دق اور بخار کو تم پر مقرر کروں گا جو تمہاری آنکھوں کو چوپٹ کر دیں گے اور تمہاری جان کو گھلا دیں گے اور تمہارا بیج بونا فضول ہوگا کیونکہ تمہارے دشمن اس کی فصل کھائیں گے۔"

۴. "اور میں خود بھی تمہارا مخالف ہو جاؤں گا اور تم اپنے دشمنوں کے آگے شکست کھاؤ گے اور جن کو تم میں سے عداوت ہے وہی تم پر حکمرانی کریں گے اور جب کوئی تم کو رگید تا بھی نہ ہوگا تب بھی تم بھاگو گے۔"

۵. "اور اگر تمہارا چال چلن میرے خلاف ہی رہے اور تم میرا کہا نہ مانو تو میں تمہارے گناہوں کے موافق تمہارے اوپر اور سات گنی بلائیں لاؤں گا اور جنگلی درندے تمہارے درمیان چھوڑ دوں گا جو تم کو بے اولاد کر دیں گے اور تمہارے چوپایوں کو نیست کر دیں گے اور تمہارا شمار گھٹا دیں گے اور تمہاری سڑکیں سونی پڑ جائیں گی۔"

یہ بائبل کی بیسیوں آیات میں سے صرف چند آیات بطور نمونہ نقل کی گئی ہیں تاکہ پروفیسر گلزار وفا چوہدری صاحب اور ان کے ہمنواؤں کے علم میں یہ بات آئے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور شریعت کے احکام کی خلاف ورزی پر سزا اور عذاب کی جو بات علماء اور فقہاء کرتے ہیں، وہ ان کی اپنی بات نہیں ہے، بلکہ انہی "پاک نوشتوں" کی صدائے بازگشت ہے جن کو پس پشت ڈال کر مسیحی رہنماؤں نے بین الاقوامی سیکولر لابیوں کی قراردادوں پر صلیب کا نشان بنا کر انہیں گلے میں لٹکا لیا ہے۔ کیا گلزار وفا چوہدری صاحب مسلم علماء اور فقہاء سے بھی اسی "خود فریبی" کی توقع رکھتے ہیں؟

سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کا تسلسل

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۔ نومبر ۲۰۰۱ء)

روزنامہ جنگ لندن ۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کی ایک خبر کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کو ظالمانہ نظام قرار دیتے ہوئے حکومتِ پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ اس نظام کو تبدیل کیا جائے۔ کونسل کی سفارش میں کہا گیا ہے کہ یہ نظام تمام تر خرابی کی جڑ ہے، اس لیے اس نظام کو ختم کر کے اسلام کے اصولوں پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے لیے مؤثر نظام نافذ کرنا چاہیے تاکہ سب سے انصاف ہو اور کوئی کسی کا حق نہ چھین سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ ہے جس کی بنیاد چند مخصوص طبقات کو سہولتیں فراہم کرنے، ان کے مفادات کے تحفظ اور غریب عوام کے استحصال پر ہے۔ اور اسی سودی اور استحصالی نظام کے بطن سے بیشتر معاشرتی جرائم اور خرابیوں نے جنم لیا ہے۔ یہ معاشی سسٹم اس نوآبادیاتی نظام کا تسلسل ہے جو مغربی حکمرانوں نے اپنے قبضے کے دور میں ہم پر مسلط کیا تھا اور جسے آزادی کے اعلان اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

حتٰی کہ خود بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے بھی قیامِ پاکستان کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر ۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو اپنے خطاب میں پاکستانی ماہرینِ معیشت کو ہدایت کی تھی کہ وہ مغرب کے معاشی نظام کی پیروی کرنے کی بجائے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر نیا معاشی نظام تشکیل دیں۔ اس موقع پر انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں اور اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ مغرب کو اس تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ مغربی نظام افرادِ انسانی کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دور کرنے میں ناکام رہا ہے، بلکہ گزشتہ نصف صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور نظام اختیار کیا تو عوام کی پرسکون خوشحالی کو حاصل کرنے کے نصب العین میں ہمیں کوئی مدد نہیں ملے

گی۔

لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشی ماہرین اور ریاستی اداروں کا معاشی قبلہ مغرب ہی چلا آرہا ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد اس ظالمانہ اور استحصالی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بجائے ہم اس کے جال میں مزید جکڑتے چلے جارہے ہیں۔ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر عالمی مالیاتی اداروں کا شکنجہ ہمارے گرد دن بدن سخت ہوتا جارہا ہے اور اس جال سے نکلنے کی کوئی کوشش کامیاب ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ چند سال قبل وفاقی شرعی عدالت اور اس کے بعد سپریم کورٹ آف پاکستان نے سود کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے ملک میں رائج تمام سودی قوانین کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور حکومت کو ان کے متبادل اسلامی قوانین نافذ کرنے کی ہدایت کی تو کسی درجہ میں یہ امید قائم ہوگئی تھی کہ اس استحصالی نظام کی گرفت ڈھیلی پڑنا شروع ہو جائے گی۔ مگر ریاستی اداروں نے جس افسوسناک طریقہ سے اس عدالتی فیصلوں پر عملدرآمد کا راستہ روکا وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ سفارش نہ صرف قومی سطح پر اس اہم اور بنیادی مسئلہ پر یاددہانی کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس نے ملک کے دینی حلقوں کی طرف سے اس سلسلہ میں فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے حکمران اور ریاستی ادارے اس یاددہانی پر جلد توجہ دے کر قوم کو اس عظیم بحران بلکہ عذابِ خداوندی سے نجات دلا سکیں، آمین۔

نفاذِ شریعت اور مسلم ممالک کا المیہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - اپریل ۲۰۰۲ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ مارچ ۲۰۰۲ء کی ایک خبر کے مطابق نائجیریا کی وفاقی حکومت نے شرعی قوانین کو وفاقی آئین کے منافی قرار دے دیا ہے۔ بی بی سی کے مطابق حکومت کا کہنا ہے کہ ان میں دوسرے شہریوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو زیادہ سخت سزائیں دی جاتی ہیں۔ جبکہ پچھلے دو برس کے دوران بارہ شمالی ریاستوں نے شرعی قوانین نافذ کیے ہیں۔

نائجیریا میں ربع صدی قبل بھی الحاج ابوبکر تفاوا بلیواؒ اور الحاج و بیلو شہیدؒ نے نفاذِ شریعت کے کام کا آغاز کیا تھا مگر انہیں اقتدار سے محروم کر کے شہید کر دیا گیا تھا اور ایک عیسائی حکومت نائجیریا پر مسلط ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اب سے دو تین سال قبل شمالی نائجیریا کی ریاستوں نے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، صوبائی خود مختاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شرعی قوانین کے نفاذ کا عمل پھر شروع کر دیا، جس کے ردعمل میں مسلم مسیحی فسادات کی آگ بھڑک اٹھی، اور ان ریاستوں کی مسیحی اقلیت نے شرعی قوانین کے نفاذ کے خلاف احتجاجی مظاہروں اور فسادات کے ذریعے شرعی قوانین کے نفاذ کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ مگر ان ریاستوں کے مسلمان اپنے موقف پر قائم رہے تو اب نیا پینترا بدل کر شرعی قوانین کو وفاقی آئین کے منافی قرار دے دیا گیا ہے۔ جس کے لیے دلیل یہ اختیار کی گئی ہے کہ اس طرح مسلمانوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سخت سزائیں دی جاتی ہیں جو آئین میں تمام شہریوں کو دی گئی مساوات کے خلاف ہے۔

نائجیریا سے ہٹ کر ہمارے دیگر بیشتر مسلم ممالک کا المیہ بھی یہی ہے کہ ان ممالک کے حکمرانوں نے از خود جو آئین اور دستور طے کر رکھے ہیں انہیں حرف آخر قرار دے کر شرعی قوانین کو ان کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ان خود ساختہ دساتیر کو اصل معیار قرار دے کر قرآن و سنت کے احکام کا راستہ روکا جاتا ہے۔

پاکستان میں جن دنوں قومی اسمبلی میں قرآن و سنت کو ملک کا سپریم لا قرار دینے اور قانون ساز اداروں کو قرآن و سنت کا پابند بنانے کے لیے ''شریعت بل'' پر بحث ہو رہی تھی، اس کے خلاف سب

سے بڑی دلیل یہی دی جاتی تھی کہ اس سے پارلیمنٹ کی خود مختاری مجروح ہو گی۔ اور اب بھی مختلف حلقوں کی طرف سے وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کر دینے کے جو مطالبات ہو رہے ہیں ان کی وجہ یہی بیان کی جاتی ہے کہ ان اداروں کی وجہ سے پارلیمنٹ کی مطلق العنانیت ختم ہو کر رہ گئی ہے اور اس کے اختیارات محدود ہو گئے ہیں۔

مغرب نے گزشتہ دو صدیوں میں یہی سبق ہمیں اہتمام سے پڑھایا ہے جس پر اکثر مسلم ممالک کے حکمران سنجیدگی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ اور ان کا یہی طرز عمل عالم اسلام میں قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جبکہ ایک صحیح اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور مسلم امہ کے قیام کے لیے قرآن و سنت کی بالادستی اور شرعی قوانین کا نفاذ اولین شرط ہے، اور اس کے بغیر مسلم امہ موجودہ بحران سے نجات حاصل نہیں کر سکتی۔

حدود آرڈیننس ختم کرنے کی مہم؟

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - جون ۲۰۰۲ء)

کوہاٹ کی ایک خاتون زعفراں بی بی کو گزشتہ دنوں بدکاری کے جرم میں مقامی عدالت نے سنگساری کی سزا سنائی تو سیکولر حلقوں اور این جی اوز نے ملک بھر میں شور و غوغا کی فضا قائم کر دی۔ اور انسانی حقوق کی وہ تنظیمیں جنہیں افغانستان میں گزشتہ پون برس سے ہزاروں بے گناہ شہریوں کا امریکی بمباری کے ذریعے وحشیانہ قتل عام دکھائی نہیں دے رہا تھا، اچانک کوہاٹ کی ایک خاتون کو سنگساری کی سزا سے بچانے کے لیے میدان عمل میں کود پڑیں، بین الاقوامی پریس کو دل پسند موضوع ہاتھ آگیا، اور صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف نے بین الاقوامی فورم پر اعلان کیا کہ زعفراں بی بی کو سنگسار کرنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔

مذکورہ خاتون کو رجم کی سزا دینے کا فیصلہ مقامی عدالت نے کن شہادتوں پر کیا ہے، اس کا جائزہ لینے کے لیے بالاتر عدالتیں موجود ہیں۔ چنانچہ وفاقی شرعی عدالت نے اس فیصلہ کے خلاف اپیل سماعت کے لیے منظور کر کے تا فیصلہ سزا پر عملدرآمد معطل کر دیا ہے۔ لیکن عدالتی طریق کار کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اس کیس کو جس طرح اچھالا جا رہا ہے اور اس کی آڑ میں شرعی قوانین کے خلاف جو منفی پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے، وہ ملک کے دینی حلقوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

حتیٰ کہ اس کیس کے منظر عام پر آنے کے بعد سرکاری سطح پر "حدود آرڈیننس" کا جائزہ لینے کے لیے کمیٹی قائم کر دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ روزنامہ جنگ ۱۷ مئی ۲۰۰۲ء کی خبر کے مطابق خواتین کی حیثیت کے بارے میں قائم قومی کمیشن نے اپنی رپورٹ جاری کر دی ہے جس میں یہ ریمارکس دیے گئے ہیں کہ حدود قوانین امتیازی ہیں اور اسلام کے اصولوں کے مطابق نہیں ہیں۔ خبر کے مطابق یہ رپورٹ گزشتہ روز پاکستان لا کمیشن کے سیکرٹری ڈاکٹر فقیر حسین نے جاری کی ہے۔ دوسری طرف روزنامہ جنگ لاہور ہی کی ۱۸ مئی کی خبر کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی حدود آرڈیننس کا از سر نو جائزہ لینے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے اور کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر ایس ایم زمان نے کہا ہے کہ کونسل حدود آرڈیننس پر دوبارہ غور کرنے کے لیے تیار ہے۔

گزشتہ ماہ امریکہ کی طرف سے حکومت پاکستان سے باضابطہ طور پر کہا گیا تھا کہ (۱) توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون (۲) قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے (۳) اور حدود آرڈیننس کے قوانین پر نظر ثانی کی جائے۔ اور اس کے بعد سے اس سلسلہ میں جس پھرتی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان قوانین کو ختم کرنے یا کم از کم عملی طور پر غیر مؤثر بنانے کا پروگرام طے ہو چکا ہے۔ لیکن اس حوالے سے دینی حلقوں میں سکوت اور بے حسی کی جو کیفیت دکھائی دے رہی ہے وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ ہم ملک کے دینی حلقوں اور علمی مراکز سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اس ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں، اور دستور کی اسلامی دفعات کے ساتھ ساتھ چند نافذ شدہ شرعی قوانین کو امریکی خواہشات کی بھینٹ چڑھنے سے بچانے کے لیے مؤثر کردار ادا کریں۔

”دہشت گردی“ کے حوالے سے چند معروضات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کا سوال نامہ

اسلام امن و آشتی اور صلح و سلامتی کا مذہب ہے، اس نے انسانی زندگی کی حرمت کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیا ہے اور اگر کسی مسلمان ملک میں غیر مسلم اقلیت آباد ہو تو اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، نیز نجی زندگی سے متعلق معاملات میں انہیں اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی گئی ہے۔ اس نے نہ صرف ظلم و تعدی سے روکا ہے بلکہ ظلم کے جواب میں دوسرے فریق کے بارے میں حد انصاف سے متجاوز ہو جانے کو ناپسند کیا ہے اور انتقام کے لیے بھی مہذب اور عادلانہ اصول و قواعد مقرر کیے ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے زیادہ تر اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کی نیت سے اور کسی قدر غلط فہمیوں کی بنا پر اس وقت عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا ہے اور اس جھوٹ کو اس قدر دہرایا گیا ہے کہ اب ایک طبقہ اسلام اور دہشت گردی کو مترادف سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں علماء، فقہاء اور ارباب افتاء کی ذمہ داری ہے کہ دہشت گردی کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کریں اور اسلام نے امن، صلح، عدل، مذہبی رواداری اور غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کی جو ہدایات دی ہیں، ان کو واضح کریں تاکہ لوگوں کے سامنے اسلام کی حقیقی اور سچی تصویر آ سکے۔ اس پس منظر میں درج ذیل سوالات آپ کی خدمت میں پیش ہیں:

۱. اسلامی نقطۂ نظر سے ’دہشت گردی‘ کی تعریف اور حقیقت کیا ہے؟
۲. یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات حکومتیں اپنے ملک میں بسنے والے تمام طبقات کے ساتھ عدل و مساوات کا سلوک نہیں کرتیں بلکہ بعض طبقات کے ساتھ سیاسی و معاشی نا انصافی روا رکھی جاتی ہے اور کبھی تو ان کے جان و مال کے تحفظ میں بھی دانستہ کوتاہی سے کام لیا جاتا ہے یا سرکاری سطح پر ایسی تدبیریں کی جاتی ہیں کہ وہ طبقہ جانی و مالی نقصان سے دوچار

ہو۔ تو کیا حکومتوں کے اس غیر منصفانہ اور ظالمانہ رویے پر بھی 'دہشت گردی' کا اطلاق ہوگا؟

۳. اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ ناانصافی روا رکھی جاتی ہے تو اس پر احتجاج اور ردعمل کا اظہار جائز ہے یا واجب؟ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ کیا مظلوم کا ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی 'دہشت گردی' کے دائرے میں آتا ہے؟

۴. اگر ایک طبقہ کی طرف سے ظلم و زیادتی ہو جس میں اس طبقہ کے کچھ افراد شریک ہوں تو کیا مظلوموں کو ظلم کرنے والے گروہ کے ان لوگوں سے بدلہ لینا جائز ہے جو بے قصور ہوں اور جو خود اس ظلم میں شامل نہ ہوں؟

۵. مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟

۶. جہاں بھی دہشت گردی پیدا ہوتی ہے، وہاں اس کے کچھ بنیادی اسباب و محرکات ہوتے ہیں، جیسے کسی گروہ کے ساتھ معاشی یا سیاسی ناانصافی، یا کسی گروہ کے اندر طاقت و قوت کے ذریعہ حکومت اور معاشی وسائل پر تسلط حاصل کر لینے کی خواہش۔ ان اسباب کے تدارک کے لیے اسلام کیا ہدایات دیتا ہے؟

۷. اگر کسی گروہ یا فرد کی جان و مال یا عزت و آبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ حتی المقدور مدافعت واجب ہے، مباح ہے یا مستحب؟ نیز حق مدافعت کے حدود کیا ہیں؟

مولانا زاہد الراشدی کا جواب

نحمده تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آله واصحابه واتباعه اجمعین۔

اسلام بلاشبہ صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا دین ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام اور ایمان کا ایک معنی یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے لوگ محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جسے دوسرے لوگ اپنی جان و مال پر امین سمجھیں اور انہیں اپنی جان و مال اور آبرو کے حوالے سے اس سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام اعتدال و

توازن کا دین ہے جو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کا راستہ بھی بتاتا ہے اور اس کی تلقین کرتا ہے۔ ظلم و تعدی اور جبر و ناانصافی انسانی سوسائٹی کے لوازم میں سے ہے جو نسل انسانی کے آغاز سے جاری ہے اور اس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اس لیے ایک جامع اور مکمل ضابطہ حیات اور نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام ظلم و تعدی کو روکنے اور جبر و ناانصافی کے سدباب کے لیے بھی ایک مستقل فلسفہ و نظام رکھتا ہے جس کی تفصیلات قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں اور ہر دور میں اس زمانے کے مقتضیات اور احوال کی روشنی میں فقہاء امت اس فلسفہ و نظام کی احکام و قواعد کی شکل میں وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔

خلافت راشدہ سے لے کر خلافت عثمانیہ کے خاتمہ (۱۹۲۴ء) تک چونکہ اسلامی احکام و قوانین کا نفاذ کسی نہ کسی شکل میں اور کسی نہ کسی سطح پر تسلسل کے ساتھ موجود رہا ہے اس لیے ہر دور میں نئے پیش آمدہ مسائل و مشکلات کا حل بھی ساتھ ساتھ سامنے آتا رہا ہے جس میں قضاۃ کے اجتہادی فیصلوں کے علاوہ ارباب علم اور اصحاب استنباط کی آزادانہ اجتہادی کاوشیں بھی شامل ہیں اور انسانی سوسائٹی کے حالات میں تغیر کے ساتھ ساتھ اجتہادی دائرہ میں ضرورت کے مطابق شرعی احکام و قوانین میں ضروری تغیر و تبدل کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے البتہ خلافت کے زوال و ادبار کے دور میں بدقسمتی سے اجتماعی زندگی کے مسائل و ضروریات کی طرف اہلِ علم و دانش کی توجہ کم ہوتی گئی اور بیرونی افکار و نظریات اور فلسفہ و تہذیب کے مسلم معاشرے میں فروغ کے باعث اور اس سے پیدا ہونے والی آزاد روی کی وجہ سے ارباب فقہ و استنباط تحفظات کا شکار ہو کر ''جمود'' پر قناعت میں عافیت محسوس کرنے لگے تو جدید پیش آمدہ مسائل اور فکری و علمی چیلنجز کے حوالے سے استنباط اور اجتہاد کا وہ تسلسل قائم نہ رہ سکا جو تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے زمانے کی رفتار کا ساتھ دے سکتا اور اگرچہ بہت سے علمی اداروں اور شخصیات نے اس خلا کو پر کرنے کی اپنے اپنے طور پر کوشش کی لیکن تنفیذی اور اجتماعی اجتہاد و استنباط کے فقدان اور شخصیات و مراکز کے انفرادی اجتہاد و استنباط میں فطری اختلاف کے باعث وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو اس اجتہاد و استنباط کا اصل مقصد و ہدف تھے اور باہمی ربط و مفاہمت کا کوئی سسٹم موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ نظری و فکری خلفشار کا عنوان بن گئے۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمے اور اقوام متحدہ کے تحت اس کے منشور کے حوالے سے نئے عالمی نظام کے آغاز کے بعد دنیا کی صورتحال یکسر تبدیل ہو گئی تھی اور بین الاقوامی تعلقات کے ساتھ ساتھ

ہمارے داخلی اجتماعی نظام کے احکام وقوانین کا بھی ایک بڑا حصہ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد واستنباط کے ایک نئے اور ہمہ گیر عمل سے گزارے جانے کا متقاضی تھا لیکن عالمی سطح پر ملت اسلامیہ کے پاس اس کا کوئی فورم موجود نہیں تھا، مسلم حکومتوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انفرادی طور پر اس عمل کا اہتمام کرنے والے مراکز وشخصیات پر علاقائی، گروہی اور طبقاتی رجحانات کا غلبہ فطری امر ہے اس لیے یہ خلا نہ صرف باقی چلا آرہا ہے بلکہ فطری انداز میں نہ ہونے کی وجہ سے فکری خلفشار اور انتشار کی کیفیت نمایاں نظر آرہی ہے اور اس وقت ہماری صورتحال یہ ہے کہ:

- ایک طرف عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات مدوجزر کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہیں اور وہ مسلم ممالک میں مکمل اسلامی نظام کے نفاذ اور عالمی سطح پر خلافت کے احیا کی خواہاں ہیں۔
- دوسری طرف مغرب کے سیکولر فلسفہ، نظام اور ثقافت کی مسلم ممالک میں ترویج و نفاذ کے لیے اقتصادی، سیاسی اور عسکری بالادستی کے ساتھ، نیز مسلمان کہلانے والی حکومتوں کے تعاون سے پیشرفت جاری ہے۔
- تیسری طرف کم وبیش تمام مسلم ممالک اقوام متحدہ کے ممبر کی حیثیت سے اور اس کے منشور وقوانین پر دستخط کرنے کے باعث قانونی اور اخلاقی طور پر آج کے عالمی نظام کا حصہ ہیں جس کا بڑا حصہ اپنے مقاصد واہداف اور قوانین وضوابط دونوں حوالوں سے اسلامی تعلیمات سے متصادم ہے۔
- چوتھی جانب عالم اسلام میں دینی بیداری کے رجحانات، اسلامی تعلیمات کے مراکز، قرآن و سنت کے ساتھ غیر مشروط اور بے لچک کمٹمنٹ کے جذبات اور اسلامی تہذیب وثقافت کے عالمی سطح پر احیا کے لیے اسلامی تحریکات کے عزائم مبینہ دہشت گردی کے خلاف اس عالمی جنگ کا براہ راست ہدف ہیں جس کی فوج کشی کا شکار اسی وجہ سے افغانستان بن چکا ہے اور مذکورہ بالا عزائم و جذبات رکھنے والی ہر تحریک اور ہر طبقہ اس جنگ کی ''ہٹ لسٹ'' میں شامل ہے۔
- ان کے علاوہ معروضی حقائق و حالات کا ایک پانچواں دائرہ یہ بھی ہے کہ عالم اسلام کے وسائل خود مسلمانوں کے کنٹرول میں نہیں ہیں، مسلم ممالک اقتصادی اور معاشی طور پر پر

بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے تہہ در تہہ جال میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں، مسلم حکومتیں سیاسی، معاشی، عسکری اور انتظامی شعبوں میں کوئی بنیادی فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں ہیں اور دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی مسلم حکومت کے اختیارات و معاملات کے گرد ایک غیر مرئی ''ریڈلائن'' موجود ہے جس کو کراس کرنا اس کے بس میں نہیں ہے۔

اس وسیع تناظر میں دہشت گردی کا اسلامی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا یقیناً ایک اہم بات ہے اور اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن اس جزوی مسئلہ سے پہلے بہت سے اصولی معاملات اہلِ علم کی توجہات کے مستحق ہیں اور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل یہ مسئلہ ہے کہ عالم اسلام کو اس مخمصہ سے نکالنے اور اس کی آزادی و خود مختاری بحال کرنے کے لیے ہمارے ارباب علم و دانش جہد و عمل کا کون سا خاکہ تجویز کرتے ہیں؟ اور وہ ملت اسلامیہ کو موجودہ صورتحال پر قناعت کرنے یا اس سے جان چھڑانے کے لیے کچھ کر گزرنے میں سے کون سا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں؟ پھر یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دہشت گردی کی اسلامی حیثیت اور اس کے بارے میں شرعی احکام و قوانین کی وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ اور اس کی اصل غرض کیا ہے؟ اگر تو اس کا مقصد عالم اسلام کی دینی تحریکات کی راہنمائی کرنا ہے اور ان کو یہ بتلانا ہے کہ ملت اسلامیہ کی خود مختاری کی بحالی، خلافت اسلامیہ کے احیا، عالم اسلام کے وسائل کی بازیابی اور مسلم اقوام و ممالک کے گرد عالمی استعمار کے حصار کو توڑنے کے لیے ان کی جدوجہد کو ان شرعی حدود کا پابند رہنا چاہیے اور انہیں ارباب علم و دانش کی راہنمائی کے دائرے سے باہر نہیں نکلنا چاہیے تو یہ ایک مفید اور مثبت عمل ہے جس کی ضرورت مسلم ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر اس سارے عمل کی غرض دہشت گردی کے حوالے سے عالمی استعمار کو مطمئن کرنا اور قاعدین و متخلفین کو ان کے قعود و تخلف کے لیے جواز اور اس کے دلائل فراہم کرنا ہے تو اس سے زیادہ قابلِ نفرین عمل کا موجودہ حالات میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک عالم اسلام کی بعض عسکری تحریکات پر ''دہشت گردی'' کا لیبل چسپاں کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ایک اصولی بات ہر شخص کے ذہن میں رہنی چاہیے کہ عمل کے احکام سے رد عمل کے احکام مختلف ہوتے ہیں اور کسی ایکشن پر جن قواعد و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے، اس کے ری ایکشن پر انہی قواعد و ضوابط کا کلیتاً اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اصول دنیا کے ہر قانونی نظام میں تسلیم شدہ

ہے اور قرآن کریم نے بھی سورۃ النساء آیت ۱۴۸ میں اس اصول کو اس حوالے سے بیان فرمایا ہے کہ کسی شخص کا بری بات کو ظاہر کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے مگر مظلوم کو اجازت ہے کہ وہ اپنے اوپر ظلم و زیادتی کو روا رکھنے والے ظالم کی برائی کو ظاہر کرے۔ گویا جس بات کی ایکشن اور عمل میں شرعاً اجازت نہیں ہے، ری ایکشن اور ردعمل میں قرآن کریم اس کی اجازت دے رہا ہے۔ اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آجانی چاہیے کہ کوئی مظلوم ردعمل میں کوئی ایسی بات کر گزرتا ہے جس کی عام حالات میں اجازت نہیں ہے تو اس کی مظلومیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس معاملے میں اس سے درگزر کر دینا ہی اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔

اس لیے واقعاتی پس منظر کی تفصیل میں جائے بغیر اصولی طور پر یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی جن تحریکات اور گروہوں کو "دہشت گرد" قرار دیا جا رہا ہے، ان کے بارے میں اس بات کا جائزہ لے لینا چاہیے کہ اگر وہ غلبہ اور اقتدار کے شوق میں ایسا کر رہے ہیں اور حکمرانی کی حرص نے انہیں ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا ہے تو ان کے "دہشت گرد" ہونے میں کوئی شک نہیں ہے لیکن اگر انہیں کسی طرف سے ہونے والے مظالم اور جبر نے ردعمل کے طور پر اس راستے پر ڈالا ہے اور جبر و استبداد کے حصار کو توڑنے میں دیگر کسی متبادل حربہ اور کوشش میں کامیابی کا کوئی امکان نہ دیکھتے ہوئے "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں تو انہیں اس رعایت سے محروم کر دینے کا کوئی جواز نہیں ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء کی آیت ۱۴۸ میں مظلوموں کے لیے بیان فرمائی ہے۔

ان تمہیدی گزارشات کے بعد ہم ان سوالات کی طرف آتے ہیں جو مذکورہ بالا سوال نامہ میں اٹھائے گئے ہیں۔

ان میں سے پہلا سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دہشت گردی کی تعریف کیا ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ قرآن کریم نے سورۃ المائدہ کی آیت ۳۳ میں "محاربہ" کا جو حکم بیان فرمایا ہے، ہمیں اس پر غور کر لینا چاہیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو سزا کا مستحق بتایا ہے، ان کے دو وصف بیان فرمائے ہیں:

- ایک "یحاربون اللہ ورسولہ" کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے خلاف جنگ لڑتے ہیں جس سے مراد ہمارے خیال میں یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے قائم کردہ نظام

سے بغاوت کرتے ہیں۔

- دوسرا "ویسعون فی الارض فسادا" کہ وہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں جس کا معنی آج کی معروف زبان میں یہ ہوگا کہ وہ امن عامہ کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کی روشنی میں ہمارے ناقص فہم کے مطابق جو لوگ کسی جائز اور قانونی سسٹم کے خلاف ناجائز طور پر بغاوت کرتے ہیں اور عام شہریوں کی جان و مال کے لیے بلاوجہ خطرہ بن جاتے ہیں، وہ ''دہشت گرد'' کہلائیں گے۔ کسی حکومت کے جائز اور قانونی ہونے کے لیے اس دور کے عرف کو دیکھا جائے گا کہ اس وقت بین الاقوامی تعامل اور عرف کی رو سے کون سی حکومت کو جائز اور قانونی سمجھا جاتا ہے جبکہ بغاوت کے جائز یا ناجائز ہونے میں بھی اسی بین الاقوامی عرف کا اعتبار ہوگا لیکن اس میں ایک بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا کہ عرف اور تعامل اور چیز ہے اور کسی مخصوص مسئلہ پر عالمی برادری کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف معاملہ ہے جس کا تجربہ ہمیں حال ہی میں افغانستان کے حوالے سے ہوا ہے کہ وہاں طالبان کی حکومت نے ملک کے ۹۰ فیصد علاقہ کا کنٹرول حاصل کر لیا تھا، دارالحکومت کابل بھی ان کے کنٹرول میں تھا اور ان کے زیر اثر علاقہ میں امن کا قیام اور ان کے احکام کی عمل داری بھی تسلیم شدہ ہے۔ آج کے بین الاقوامی عرف میں کسی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے یہ باتیں کافی سمجھی جاتی ہیں بلکہ اس سے کم تر اہداف حاصل کرنے والی حکومتیں بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں لیکن اس کے باوجود عالمی برادری نے افغانستان میں طالبان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا بلکہ اس پر فوج کشی کر کے اسے جبراً ختم کر دیا۔ اس لیے ہمیں حقیقی عرف و تعامل اور وقتی طرز عمل میں فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا اور اب تو یہ فرق اس قدر واضح ہو گیا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے کہ بین الاقوامی قوانین و ضوابط، اخلاقیات اور عالمی سیاسیات کی بیشتر اقدار و روایات کا مفہوم و معیار تک بدل کر رہ گیا ہے۔

دوسرا سوال اس حوالے سے ہے کہ کوئی حکومت اپنے ملک کے کسی طبقہ کے ساتھ انصاف نہیں کرتی اور ان کے سیاسی حقوق اور جان و مال تک کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو کیا اس حکومت کے ایسے طرز عمل کو بھی ''دہشت گردی'' قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس کے جواب میں گزارش ہے کہ کوئی حکومت اپنی رعیت کے کسی طبقے کو اس کے جائز حقوق سے محروم رکھتی ہے اور اس محروم رکھنے میں ریاستی جبر کا ایسا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے جس سے اس طبقہ کے وجود اور اس کے افراد کی جان و مال کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں تو یہ بات یقیناً ''ریاستی

دہشت گردی" کہلائے گی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر کسی گروہ یا طبقہ کے ساتھ ناانصافی روا رکھی جاتی ہو تو اس پر احتجاج اور رد عمل کی کیا حیثیت ہے؟ اور کیا مظلوم کا ظالم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی "دہشت گردی" کہلائے گا؟

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ مظلوم کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا دنیا کے ہر قانون میں حق حاصل ہے اور اسلام بھی اسے یہ حق دیتا ہے۔ اب اس حق کی درجہ بندی کہ یہ جائز ہے یا واجب، اس کا انحصار اس وقت کے حالات پر اور مظلوم کی صواب دید پر ہے۔ اسلام نے اس میں دو درجے رکھے ہیں: عزیمت اور رخصت۔ اگر وہ عزیمت پر عمل کرتا ہے اور اپنے حق کے لیے ظالم کے خلاف جدوجہد کرتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے اور اگر صبر و تحمل کے ساتھ رخصت کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے اس کا جواز بھی ہے چنانچہ جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو شخص اپنی جان کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے۔ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا، وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی عزت کی حفاظت میں مارا گیا، وہ بھی شہید ہے۔ اس ارشاد نبویؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ رخصت پر عمل کی اجازت ہے، لیکن ترجیح بہر حال عزیمت ہی کو حاصل ہے۔

باقی رہی بات ہتھیار اٹھانے کی تو فقہائے کرام کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصی اور انفرادی معاملات میں تو قانون کو ہاتھ میں لینے اور ہتھیار اٹھانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے اور ایسا کرنا بغاوت کے زمرے میں آئے گا البتہ اجتماعی معاملات میں (۱) مسلم حکمران کی طرف سے کفر بواح کے ارتکاب اور (۲) مسلم اکثریت پر غیر مسلم اقلیت کا جبری اقتدار قائم ہو جانے کی صورت میں ہتھیار اٹھانے کی اجازت ہے جو بسا اوقات فرض کا درجہ بھی اختیار کر جاتا ہے جیسا کہ دہلی پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار قائم ہو جانے کے بعد حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور دیگر اکابر علماء کرام نے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا۔

حملہ آور قوت کے خلاف اپنی آزادی اور خود مختاری کے لیے ہتھیار اٹھانے کے حق کو دنیا کے ہر قانون میں تسلیم کیا جاتا ہے اور اسے حریت اور آزادی کی جنگ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسے "دہشت گردی" قرار دینا ایسا ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ برطانوی استعمار سے آزادی کے لیے جن امریکی حریت پسندوں نے ہتھیار اٹھائے تھے اور اس جنگ میں انہوں نے متعلقہ اور غیر متعلقہ ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، وہ حریت پسند نہیں بلکہ "دہشت گرد" تھے اور اسی طرح دنیا بھر کی وہ تمام

اقوام وممالک دہشت گرد قرار پائیں گے جنہوں نے غیر ملکی قابضین اور نوآبادیاتی حکمرانوں کے خلاف جنگ لڑکر آزادی حاصل کی ہے۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اگر کسی طبقہ کے کچھ افراد نے ظلم کیا ہے تو کیا مظلوموں کو یہ حق حاصل ہے کہ اس طبقے کے دوسرے افراد کو انتقام کا نشانہ بنائیں جو اس عمل میں شریک نہیں تھے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ جہاں تک غیر متعلقہ لوگوں کو انتقام کا نشانہ بنانے کا تعلق ہے، اسلام اس کی کسی صورت میں اجازت نہیں دیتا۔ یہ بھی اسی طرح کا ظلم ہو گا جس کا وہ مظلوم خود نشانہ بن چکے ہیں۔ البتہ ظالموں کے خلاف کارروائی کے دوران کچھ لوگ ناگزیر طور پر زد میں آتے ہوں تو ان کا معاملہ مختلف ہے۔ جناب نبی اکرمؐ نے جہاد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور غیر متعلقہ افراد کو قتل کرنے سے صراحتاً منع کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلم شریف کتاب الجہاد میں حضرت صعب بن جثامہؓ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ آنحضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ہم ایک جگہ شب خون مارنا چاہتے ہیں مگر وہاں عورتیں اور بچے بھی ہیں تو آپؐ نے فرمایا کہ: ہم منہم ”وہ انہی میں سے ہیں“ یعنی اگر وہ شب خون (چھاپہ مار کارروائی) کی زد میں ناگزیر طور پر آتے ہیں تو وہ انہی میں شمار ہوں گے اور ان کی وجہ سے کارروائی روکی نہیں جائے گی۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں جو غیر مسلم شہری آباد ہیں، ان کو اپنے مذہبی معاملات یعنی عقیدہ، عبادت، شخصی قوانین وغیرہ میں کس حد تک آزادی حاصل ہے؟

اس کے جواب میں ہمارا طالب علمانہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں کوئی مسلم حکومت ایسی نہیں ہے جس پر خالص اسلامی حکومت کا اطلاق کیا جا سکے یا جسے خلافت کا قائم مقام قرار دیا جائے اور اس کے دائرے میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمیوں کا درجہ دینا شرعاً ضروری ہو جبکہ کم و بیش تمام مسلم ممالک اقوام متحدہ کے منشور پر دستخط کرنے کے علاوہ اس حوالے سے دیگر بین الاقوامی معاہدوں کی پابندی بھی قبول کر چکے ہیں اس لیے جب تک خلافت کا احیا نہیں ہوتا اور خالصتاً اسلامی شرعی حکومت قائم نہیں ہو جاتی، ہم ”میثاق مدینہ“ کی طرز پر بین الاقوامی معاہدات کے پابند ہیں اور ہمیں ان پر عمل درآمد کرنا چاہیے الا یہ کہ ان میں سے کوئی بات کسی مسلمان ملک کی خود مختاری و سالمیت اور مسلمانوں کے ملی مفاد کے لیے صریحاً خطرے کا باعث ہو تو اس میں وہ ملک ضروری تحفظات اختیار کر سکتا ہے۔

چھٹا سوال یہ ہے کہ دہشت گردی کے ہر جگہ کچھ نہ کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ اسلام ان اسباب کے تدارک کے لیے کیا ہدایات دیتا ہے؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ دہشت گردی فی الواقع بہت بڑا جرم ہے۔ اسلام تو عام معاشرتی جرائم میں بھی مجرم کے لیے سخت سزائیں تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ جرم کے اسباب و عوامل کے تدارک کا حکم دیتا ہے اور ان دواعی کا راستہ روکتا ہے جو کسی شخص کو جرم تک لے جاتے ہیں۔ اسلام کا یہی اصول دہشت گردی کے بارے میں بھی ہے۔ اس پس منظر میں ہمارے نزدیک دہشت گردی کے حوالے سے دو محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک محاذ یہ ہے کہ جو عالمی قوتیں ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا عنوان اختیار کر کے دنیا بھر کی دینی تحریکات کو ٹارگٹ بنائے ہوئے ہیں، انہیں اس بات کا احساس دلایا جائے کہ جس کو تم دہشت گردی قرار دے رہے ہو، یہ دراصل ردعمل ہے ان مظالم اور جبر و ناانصافی کا جو ان اقوام و ممالک اور طبقات پر مسلسل روا رکھے جا رہے ہیں اور اس ردعمل کو جبر اور تشدد کے ذریعے کبھی ختم نہیں کیا جا سکتا بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی صورتحال میں جبر و تشدد سے مزید منافرت بڑھتی ہے اور جذبات میں شدت پیدا ہوتی ہے اس لیے اگر تم دہشت گردی کو ختم کرنے میں سنجیدہ اور مخلص ہو تو تمہیں جبر و تشدد اور عسکری جنگ کا راستہ ترک کر کے مفاہمت اور مذاکرات کا راستہ اپنانا ہوگا۔ ظالم اور مظلوم کے فرق کو محسوس کرو، مظلوم کی مظلومیت کو تسلیم کرو، ظالم کو ظالم قرار دو اور مسلمہ اصولوں کی روشنی میں مظلوم اقوام و طبقات کو ظلم و استحصال سے نجات دلانے کے لیے سنجیدہ پیش قدمی کرو ورنہ تمہاری یہ جنگ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے نہیں بلکہ اس کے فروغ کے لیے متصور ہوگی اور دہشت گردی کا جواب اس سے بڑی دہشت گردی کے ذریعہ دے کر تم خود سب سے بڑے دہشت گرد قرار پاؤ گے۔

دوسری طرف عالم اسلام کی ان عسکری تحریکات سے بھی گفتگو کی ضرورت ہے جو مختلف محاذوں پر مصروف کار ہیں اور جنہیں دہشت گرد قرار دے کر ان کو کچلنے کا عمل مسلسل جاری ہے۔ ان تحریکات کی قیادتوں کو دو باتیں سمجھانے کی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ ہر مسئلے کا حل ہتھیار نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر جگہ ہتھیار اٹھانا ضروری ہے۔ جہاں کسی مسئلہ کے حل کا کوئی متبادل راستہ موجود ہے، اگرچہ وہ لمبا اور صبر آزما ہی کیوں نہ ہو، وہاں ہتھیار سے کام لینا ضروری نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں شاید شرعاً جائز بھی نہ ہو۔ ہتھیار تو آخری حربہ ہے۔ جہاں اور کوئی ذریعہ کام نہ دیتا ہو اور کسی جگہ مسلمانوں کا وجود اور

دینی تشخص حقیقی خطرات سے دوچار ہوگیا ہو تو آخری اور اضطراری حالت میں ہتھیار اٹھانے کی گنجائش نکل سکتی ہے اس لیے اضطرار بلکہ ناگزیر اضطرار کے بغیر ہتھیار کو ہاتھ میں نہ لیا جائے۔

دوسری بات ان سے یہ عرض کرنے کی ہے کہ آزادی، قومی تشخص اور خود مختاری کے لیے اضطرار کی حالت میں قومیں ہتھیار اٹھایا کرتی ہیں۔ یہ زندہ قوموں کا شعار ہے اور آزادی کی عسکری تحریکات سے دنیا کی تاریخ بھری پڑی ہے لیکن غیر متعلقہ لوگوں کو نشانہ بنانا اور بے گناہ لوگوں کا خون بہانا نہ شرعاً جائز ہے اور نہ ہی دنیا کا کوئی اور قانون وضابطہ اس کی اجازت دیتا ہے۔ ان تحریکات کو اس حوالے سے شرعی احکام وقوانین کی پابندی کا ایک بار پھر عہد کرنا چاہیے اور شرعی احکام بھی وہ نہیں جو خود ان کے ذہن میں آجائیں بلکہ وہ قوانین وضوابط جوامت کے اجماعی تعامل وتوارث کے ساتھ تسلیم شدہ چلے آ رہے ہیں اور جنہیں وقت کے اکابر علماء وفقہاء کی طرف سے ضروری قرار دیا جارہا ہو۔ اس کے بغیر کوئی بھی تحریک اور جدوجہد تمام تر خلوص وجذبہ اور ایثار وقربانی کے باوجود خلفشار پیدا کرنے کا باعث بنے گی اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی ہوگی اس لیے ایسی تحریکات کو کسی بھی ایسی بات سے قطعی طور پر گریز کرنا چاہیے جو:

- معروف اور مسلمہ شرعی اصولوں کے مطابق نہ ہو۔
- جس سے مسلمانوں کی مشکلات میں بلاوجہ اضافہ ہوتا ہو۔
- جو اسلام کے لیے بدنامی کا باعث بن سکتی ہو۔
- اور جس سے خود ان تحریکات کی قوت کار اور دائرۂ عمل متاثر ہوتا ہو۔

ساتواں سوال یہ ہے کہ کسی گروہ یا فرد کی جان ومال اور عزت وآبرو پر حملہ کیا جائے تو اس کے دفاع کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور یہ دفاع واجب ہے یا مستحب؟

اس سلسلے میں اصولی طور پر یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے جب اپنی جان، مال، اور آبرو کی حفاظت میں مارے جانے والے مسلمان کو شہید قرار دیا ہے تو ان تینوں حوالوں سے دفاع کا حق اور اس کی فضیلت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں رہ جاتی البتہ ایک اور بات عرض کرنا بھی شاید نامناسب نہ ہو کہ جان بچانے کو فقہاء کرام نے فرض قرار دیا ہے اور جہاں جان کے تحفظ کا مسئلہ آ جائے، وہاں اضطرار کی حالت میں خنزیر کا گوشت بقدر ضرورت کھانے کو بھی بعض فقہاء نے فرض بتایا ہے تو اس اصول کی رو سے کسی فرد یا گروہ کے لیے یہ بات بھی فرض ہی کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر

اسے اپنے وجود اور جان کا خطرہ لاحق ہو جائے تو وہ اسے بچانے کے لیے جو صورت دفاع کی ناگزیر ہو، وہ اسے اختیار کرے اور اس دفاع کی حد بھی وہی ہے جو حالت اضطرار کی دیگر صورتوں میں ہے کہ جتنی کارروائی سے جان بچ سکتی ہو، اسی حد تک اجازت ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔

صوبہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۳ء)

صوبہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت قائم ہوگئی ہے، جمعیۃ علماء اسلام کے اکرم خان درانی نے وزیر اعلیٰ کا منصب سنبھال لیا ہے، اکرم خان درانی کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ تحریک آزادی کے نامور عسکری راہنما فقیر ایپیؒ کے دست راست حاجی گل نوازؒ کے پوتے ہیں جن کی جائیداد ضبط کر کے ان کے مکانات کو اس جرم میں فرنگی حکومت نے بموں سے اڑا دیا تھا کہ وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے ہتھیار بکف تھے اور فرنگیوں سے اپنا وطن آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ اکرم درانی نے صوبائی حکومت کا چارج سنبھالنے کے بعد متعدّد اصلاحات کے ساتھ صوبہ میں نفاذ اسلام کے لیے اقدامات کا آغاز کیا ہے جن میں شراب پر پابندی اور بڑھتی ہوئی فحاشی پر کنٹرول کرنا بھی شامل ہے۔ اس صوبے میں اس سے قبل جمعیۃ علماء اسلام کے قائد حضرت مولانا مفتی محمودؒ بھی ۱۹۷۲ء کے دوران وزیر اعلیٰ رہ چکے ہیں اور انہوں نے دس ماہ کے مختصر دور میں نفاذ اسلام کے حوالہ سے متعدّد عملی اقدامات کے علاوہ سادگی اور قناعت کے ساتھ حکومتی نظام چلانے کا نمونہ پیش کیا تھا۔

اخباری بیانات کے مطابق اکرم خان درانی کا عزم یہ ہے کہ وہ صوبہ سرحد میں نفاذ اسلام کے لیے جو اقدامات بھی کر سکے اس سے گریز نہیں کریں گے اور صوبہ سرحد کی حدود میں بیرونی مداخلت بالخصوص امریکی ایف بی آئی کے چھاپوں کی اجازت نہیں دیں گے۔ ان کے یہ دونوں اعلانات اسلامی نظام، ملکی سالمیت اور قومی خود مختاری کے ساتھ ان کی واضح کمٹمنٹ کی علامت ہیں اور ان اعلانات و اقدامات کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم ان سے گزارش کرنا چاہیں گے کہ ان دونوں مقاصد کے لیے بہت احتیاط، تدبر اور حوصلے کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں عملی پیشرفت کا ناگزیر تقاضہ یہ ہے کہ وہ صوبے میں تمام محب وطن دینی و سیاسی حلقوں سے رابطہ و مفاہمت کو فروغ دیتے ہوئے دونوں مسائل پر قومی مفاہمت اور اتفاق رائے کی فضا قائم کریں اور سنجیدہ عملی اقدامات کے ذریعہ نفاذ اسلام اور قومی خود مختاری کی بحالی کی منزل کی طرف بڑھیں۔

اس سلسلہ میں ہماری تجویز یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو سفارشات کا جائزہ لے کر ان میں

سے صوبائی اختیارات سے تعلق رکھنے والی سفارشات اور مسودات قانون کو الگ کیا جائے اور سرحد اسمبلی کے ذریعہ انہیں قانونی شکل دے کر صوبے میں ان کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت قومی خود مختاری اور نفاذ اسلام کے لیے سنجیدہ پیشرفت میں کامیاب ہوئی تو اس کے اثرات پورے ملک پر پڑیں گے، قومی سیاست میں نظریاتی قیادت اور دیانتدار لیڈر شپ کا جو خلا ایک عرصہ سے ملک کے محب وطن شہریوں کے لیے اضطراب کا باعث بنا ہوا ہے اس کے پُر ہونے کی صورت نکل آئے گی اور پاکستان صحیح معنوں میں ایک اسلامی اور جمہوری ریاست کی صورت اختیار کر سکے گا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اکرم خان درانی کی حکومت کو ان مقاصد کی طرف کامیابی کے ساتھ آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

سرحد اسمبلی کا شریعت بل، حکومتی کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۱ جون ۲۰۰۳ء)

سرحد اسمبلی میں شریعت بل پیش کیے جانے کے ساتھ بلکہ اس سے بھی پہلے اس پر ردعمل کے اظہار کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور اس میں دن بدن شدت آ رہی ہے۔ ایک طرف وہ عملی اقدامات ہیں جو سرحد حکومت کو ناکام بنانے اور اسے نت نئے مسائل میں الجھانے کے لیے کیے جا رہے ہیں جن میں صوبائی حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر چیف سیکرٹری اور آئی جی پولیس کے تبادلوں کا فیصلہ اور ضلعی ناظموں کی طرف سے استعفوں کا اعلان سرفہرست ہیں۔ اور دوسری طرف وفاقی حکومت کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے صوبہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت کے اس اقدام کے خلاف بیان بازی کا سلسلہ جاری ہے حتیٰ کہ پیپلز پارٹی کی سربراہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے بھی اس معاملہ میں حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا ہے اور افغانستان پر امریکی حملہ کے بعد یہ دوسرا مسئلہ ہے جس پر حکمران کیمپ اور محترمہ بے نظیر بھٹو یک آواز اور ہم آہنگ دکھائی دے رہے ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو افغانستان میں طالبان حکومت کے خاتمہ کے لیے مسلح امریکی مداخلت پر بھی اعتراض نہیں تھا بلکہ انہیں صرف یہ شکایت تھی کہ یہ کام ان کے ذریعے کیوں نہیں لیا جا رہا اور افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف جہاد کے نتیجے میں ابھرنے والے اسلامی رجحانات کو ختم کرنے کے لیے امریکہ بہادر نے ان کی خدمات پر بھروسہ کرنے کی بجائے جنرل پرویز مشرف کی ٹیم کا انتخاب کیوں کیا ہے؟ اور اب بھی ان کا کہنا ہے کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی میں شریعت بل کی منظوری جنرل پرویز مشرف کی پالیسیوں کا نتیجہ ہے ورنہ اگر وہ ان کی جگہ پاکستان میں برسراقتدار ہوتیں تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت بل کو ”طالبان بل“ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ طالبان طرز کے اسلام کو نافذ کرنے کی طرف پیشرفت ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہیں کہ طالبان کے طرز حکومت اور صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کے طرز عمل میں

زمین وآسمان کا فرق ہے:

- طالبان افغانستان میں جہادی کمانڈروں کی باہمی کشمکش اور خانہ جنگی کی وجہ سے بذریعہ قوت افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ جبکہ متحدہ مجلسِ عمل نے انتخابی عمل کے ذریعے عوامی ووٹ حاصل کرکے صوبائی حکومت حاصل کی ہے۔
- طالبان کا نظام امارت کا نظام تھا جس میں امیر کے شخصی احکامات ہی قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ جبکہ سرحد کی صوبائی حکومت نے منتخب اسمبلی میں بل پیش کرکے عوامی نمائندوں کے ذریعے اس کا نفاذ کیا ہے۔
- طالبان نے افغانستان کے سابقہ نظام کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکا تھا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام نافذ کرنے کی طرف پیشرفت کی تھی۔ جبکہ سرحد حکومت نے ملک کے دستور اور مروجہ سسٹم کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس کی طرف سے ملنے والے اختیارات اور حدود میں نفاذِ شریعت کے اقدامات کیے ہیں۔
- طالبان نے اسلام کے نفاذ اور اس کی تعبیر و تشریح کے لیے اپنے امیر اور ان کی مجلس مشاورت کو فائنل اتھارٹی قرار دیا تھا۔ جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت نے اس سلسلہ میں دستورِ پاکستان کے تحت پہلے سے قائم اداروں اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کو بنیاد بنایا ہے اور انہیں اتھارٹی تسلیم کیا ہے۔
- طالبان کا نظام ہمہ گیر اور قومی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط تھا۔ جبکہ سرحد اسمبلی کا منظور کردہ شریعت بل صاف طور پر اعلان کر رہا ہے کہ اس کا تعلق صرف ان معاملات سے ہے جن میں دستور کے تحت صوبائی حکومت کو قانون سازی اور نفاذ قانون کا حق حاصل ہے، اس کے علاوہ باقی معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے۔

اس پس منظر میں اس بات پر تو بحث کی گنجائش موجود ہے کہ نفاذ اسلام کے لیے طالبان کا طرز عمل زیادہ مفید اور مؤثر تھا یا متحدہ مجلسِ عمل کا طریق کار زیادہ فائدہ مند ہے، مگر سرحد اسمبلی کے منظور کردہ شریعت بل کو ''طالبان بل'' قرار دینا اور اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس سے طالبان طرز کے اسلام کے نفاذ کی راہ ہموار ہوگی، سراسر مغالطہ نوازی اور کج فہمی کی بات ہے جس کی محترمہ بے نظیر بھٹو جیسی ذہین و فطین خاتون اور تجربہ کار سیاستدان سے قطعی طور پر توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور اس پر اس

کے سوااور کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو ساری صورتحال کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی جان بوجھ کر سرحد اسمبلی کے شریعت بل کو عالمی حالات کے تناظر میں انتہائی خوفناک شکل میں پیش کر کے اعلیٰ ترین قوتوں کو یقین دلانا چاہ رہی ہیں کہ اگر انہیں یعنی محترمہ بے نظیر بھٹو کو نظر انداز کیا جاتا رہے گا تو حالات اسی رخ پر آگے بڑھتے رہیں گے۔

دوسری طرف حکمران کیمپ کی صورتحال یہ ہے کہ سرحد اسمبلی میں ''شریعت بل'' کی منظوری پر اس کی بے چینی اور اضطراب قابلِ دید ہے:

- صدر پرویز مشرف نے اس پر اپنے ردعمل کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ وفاقی حکومت کو چاہیے کہ وہ پاکستان کو ایک روشن خیال اسلامی ریاست بنانے کے تصور کو مجروح کرنے کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دے۔
- وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی نے جہلم میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے یہ کہہ کر اپنے غصے کا اظہار کیا ہے کہ ''مسجدوں کے پیسے کھانے والے ملک کا کیا حشر کریں گے؟
- حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری شجاعت حسین نے فرمایا ہے کہ سرحد اسمبلی میں شریعت بِل پیش کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جب اسلامی نظریاتی کونسل قائم ہے اور وفاقی شرعی عدالت موجود ہے تو اس کے بعد نفاذ اسلام کے لیے اور کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حالانکہ یہ بات چوہدری صاحب موصوف کے علم میں یقیناً ہوگی کہ صوبہ سرحد کی اسمبلی نے اسی اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں اور سفارشات کو صوبائی اختیارات کی حدود میں نافذ کرنے کی بات کی ہے جس کا ذکر انہوں نے فرمایا ہے اور جسے وہ خود بھی نفاذ اسلام کی علامت قرار دے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ ارشادات وفاقی وزیر اطلاعات جناب شیخ رشید احمد کے ہیں جنہوں نے متحدہ مجلسِ عمل کے خلاف گولہ باری کے محاذ کی کمان سنبھال رکھی ہے اور وہ بھی محترمہ بے نظیر بھٹو ہی کے لہجے میں سرحد کی صوبائی حکومت کے لتے لیے جا رہے ہیں۔

شیخ رشید احمد نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز اسلام کے نعرہ سے کیا تھا، شیخ القرآن حضرت مولانا غلام اللہ خانؒ کی سرپرستی میں سیاسی پیش قدمی کی راہ ہموار کی تھی اور راجہ بازار راولپنڈی خصوصاً دارالعلوم تعلیم القرآن میں اسلام کے حق میں شیخ رشید احمد کے پرجوش خطابات کی گونج آج بھی پرانے سیاسی

کارکنوں کے کانوں میں سنائی دے رہی ہے۔ مگر اب وہ وزارت اطلاعات کے منصب پر فائز ہونے کے بعد فرما رہے ہیں کہ اسلام کو اسلام آباد سے دور رکھو۔ ان کا ارشاد ہے کہ وہ اسلام کے لیے متحدہ مجلسِ عمل کے ساتھ ہیں لیکن متحدہ مجلسِ عمل اسلام آباد کے لیے فٹ نہیں ہے اس لیے اسے اسلام آباد سے دور رہنا چاہیے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اسلام اور اسلام آباد کے درمیان فاصلہ قائم رکھنا چاہتے ہیں، وہی فاصلہ جو محترمہ بے نظیر بھٹو کے نزدیک اسلام اور اسلام آباد کے درمیان قائم رہنا ضروری ہے، اور وہی فاصلہ جسے آج کے عالمی حکمرانوں نے نہ صرف اسلام اور اسلام آباد کے درمیان بلکہ دنیا کے ہر مسلمان ملک کے دارالحکومت اور اسلام کے درمیان ضروری قرار دے رکھا ہے۔ انہی عالمی حکمرانوں کی خوشنودی کی خاطر عالم اسلام کے اکثر و بیشتر حکمرانوں اور سیاستدانوں نے اسلام کے سیاسی اور حکومتی کردار کی نفی کو اپنا فریضہ قرار دیا ہے۔

شیخ رشید احمد نے فرمایا ہے کہ متحدہ مجلسِ عمل کو عالمی حالات اور خطہ کی صورتحال کی سنگینی کا احساس کرنا چاہیے۔ ان کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش ہے کہ اگر ملک کے مقتدر طبقات اسلام کا راستہ اسی طرح روکتے رہیں گے تو حالات کی سنگینی میں کمی کی بجائے اضافہ ہوگا۔ یہ ملک اسلام کی خاطر بنا ہے، ملک کے عوام ایک سے زیادہ بار اسلامی نظام کے حق میں واضح فیصلہ دے چکے ہیں، متحدہ مجلسِ عمل نے گزشتہ الیکشن میں نفاذ اسلام کے وعدہ پر ووٹ لیے ہیں اور عوامی مینڈیٹ کا احترام اس کی ذمہ داری ہے۔ دستورِ پاکستان نے ملک کے تمام قوانین کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی گارنٹی دے رکھی ہے، اسلامی نظریاتی کونسل نے دستور کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات مرتب کی ہیں اور سرحد اسمبلی نے انہی سفارشات پر صوبائی اختیارات کے دائرہ میں عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

اگر شیخ رشید احمد اور ان کا کیمپ عالمی حالات اور خطہ کی صورتحال یا دوسرے الفاظ میں امریکہ اور بھارت کی خوشنودی کی خاطر مذکورہ بالا تمام حقائق کو کراس کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو یہ فیصلہ انہیں مبارک ہو۔ لیکن ایک بات انہیں ہر وقت یاد رکھنی چاہیے کہ پاکستان کے عوام کو اسلام سے دستبردار کرانے کی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوگی اور اگر جمہوری اور سیاسی عمل کے ذریعے نفاذ اسلام کا راستہ روکنے کی غیر جمہوری کوششیں اسی طرح جاری رہیں تو اس کے ردعمل میں خطہ کی صورتحال جو رخ اختیار کرے گی اس کا سامنا کرنا شیخ محترم اور ان کے کیمپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔

سرحد اسمبلی کا شریعت ایکٹ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۰۳ء)

سرحد اسمبلی نے گزشتہ دنوں ''شریعت ایکٹ'' کی منظوری دی ہے اور اس کے ساتھ ہی ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اس کے خلاف پروپیگنڈے کی ایک نئی مہم کا آغاز ہو گیا ہے۔ شریعت ایکٹ میں کہا گیا ہے کہ صوبہ سرحد میں دستور کے مطابق صوبائی اختیارات کی حدود میں تمام قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا اور قرآن و سنت کے احکام کی روشنی میں انتظامی و عدالتی امور چلائے جائیں گے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ آج سے تیس سال قبل ملک میں نافذ ہونے والے ۱۹۷۳ء کے دستور میں اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا اور قرآن و سنت کے خلاف آئندہ کوئی قانون ملک میں نافذ نہیں کیا جا سکے گا۔ دستور کے تحت اس کام کے لیے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' قائم کی گئی تھی جس میں تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علاوہ ملک کے ممتاز قانون دان اور جج صاحبان ہر دور میں شامل رہے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے تمام قوانین کا جائزہ لے کر ان میں قرآن و سنت کی روشنی میں اصلاحات و ترامیم کے لیے ایک جامع رپورٹ اپنی سفارشات کی صورت میں کئی برس قبل حکومت کو پیش کر دی تھی۔ دستور کے مطابق وفاقی اور صوبائی حکومتیں اس امر کی پابند ہیں کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے اپنے اپنے دائرہ اختیار میں انہیں قانون سازی کی بنیاد بنائیں لیکن ابھی تک کسی حکومت کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ اپنی اس دستوری ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز و سفارشات کو قانون ساز اداروں میں لائے، حالانکہ ملک کے دینی حلقے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق ہر سطح پر قانون سازی کا مسلسل مطالبہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اب تیس برس کے بعد صوبہ سرحد میں متحدہ مجلسِ عمل کی حکومت نے اس طرف پیشرفت کی ہے اور مذکورہ بالا شریعت ایکٹ کی صورت میں صوبائی اختیارات کے دائرہ میں قرآن و سنت کو احکام و قوانین کی بنیاد بنانے کا فیصلہ کیا ہے تو ملک کے مقتدر حلقے اس کا خیر مقدم کرنے اور اس سلسلہ میں اپنی اب تک کی کوتاہی پر شرمساری کا اظہار کرنے کی بجائے الٹا صوبہ سرحد کی حکومت کو ہدف تنقید بنا

رہے ہیں اور ملکی اور عالمی میڈیا میں اس کے خلاف ایک طوفان بپا کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ زور و شور سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ صوبہ سرحد حکومت طالبان کی طرز کا اسلام صوبے میں نافذ کرنا چاہتی ہے اور پاکستان میں ''طالبانائزیشن'' کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ چنانچہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۰ جون ۲۰۰۳ء کی رپورٹ کے مطابق صدر جنرل پرویز مشرف نے اپنے دورۂ برطانیہ کے دوران بعض مغربی اخبارات کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ صوبہ سرحد کے عوام متحدہ مجلسِ عمل کی پالیسی کو قبول نہیں کریں گے اور صوبہ سرحد میں طالبانائزیشن کی مہم کامیاب نہیں ہوگی۔ صدر پرویز مشرف اس سے قبل متعدّد بار سرحد اسمبلی کے اس شریعت ایکٹ کو طالبانائزیشن قرار دے چکے ہیں اور ان کے علاوہ بھی مقتدر حلقوں کی مختلف شخصیات اسی قسم کے خیالات کا مسلسل اظہار کر رہی ہیں، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ سرحد حکومت اور طالبان میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیونکہ:

- طالبان نے طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کیا تھا جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت عوام کی منتخب کردہ ہے۔
- طالبان نے پورے نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور اس کی جگہ مکمل اسلامی نظام نافذ کر دیا تھا جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت نے اپنے اقدامات کو صرف صوبائی اختیارات کے دائرہ میں محدود رکھا ہے۔
- طالبان کی حکومت نے کوئی باضابطہ دستور نافذ نہیں کیا تھا بلکہ امیر المومنین ملا محمد عمر کے شخصی احکامات کے ذریعہ نفاذ اسلام کے اقدامات کیے جا رہے تھے جبکہ صوبہ سرحد کی حکومت ملک میں تیس سال پہلے نافذ ہونے والے دستور کی بالادستی قبول کرتے ہوئے اس کے تحت نفاذِ شریعت کے اقدامات کر رہی ہے۔

یہ بات اپنی جگہ الگ طور پر بحث طلب ہے کہ کسی بھی مسلم ملک میں نفاذ اسلام کے لیے طالبان کا طرز عمل زیادہ مؤثر اور مفید ہو سکتا ہے یا اس طریق کار سے بھی اسلام کا نفاذ ممکن ہے جو صوبہ سرحد کی حکومت نے اختیار کیا ہے، لیکن اس بحث سے قطع نظر سرحد اسمبلی کی طرف سے شریعت ایکٹ کی منظوری کو طالبانائزیشن قرار دینا اور اس کے خلاف اس طرح کی نفرت انگیز مہم چلانا جہاں امر واقعہ اور حقائق کے منافی ہے وہاں دستورِ پاکستان کا مذاق اڑانے کے مترادف بھی ہے۔

ہم صدر پرویز مشرف اور ان کے کیمپ کے دیگر حضرات سے گزارش کریں گے کہ وہ اس معاملہ

کاازسرنوجائزہ لیں اور نفاذِ شریعت کے لیے سرحد حکومت کے دستوری اقدامات پر اعتراض کرنے کی بجائے اسلامائزیشن کے حوالہ سے خود اپنی دستوری ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ قیامِ پاکستان کے وقت اور پھر دستور کے نفاذ کے موقع پر قوم سے واضح طور پر وعدہ کیا گیا تھا کہ پاکستان میں مکمل اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا اور اس وعدہ سے انحراف پاکستان کے بنیادی مقاصد سے روگردانی ہے۔

طالبان والا اسلام!

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

......جہاں تک طالبان والے اسلام یا طالبان کی طرز کے پاکستان کی پھبتی کا تعلق ہے، ہم اس سے قبل یہ بات واضح کر چکے ہیں اور پھبتی کسنے والے خود بھی اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کو یہ طعنہ دینا سراسر ناانصافی ہے اور یہ حقائق و واقعات کے سراسر منافی ہے۔ لیکن ان کی یہ مجبوری ہے کہ اس کے سوا اور کوئی الزام اور طعنہ ان کے ترکش میں باقی نہیں رہ گیا۔ پہلے پاکستان کے علماء کرام پر فرقہ پرستی کا الزام لگایا جاتا تھا اور نفاذ اسلام کے امکانات کو روکنے کے لیے یہ سوال کیا جاتا تھا کہ علماء تو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، ان میں سے کس فرقے کا اسلام نافذ کیا جائے؟ لیکن پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں نے علمی اور سیاسی دونوں محاذوں پر متحد ہو کر اس طعنے کے غبارے سے ہوا خارج کر دی ہے۔ وہ قانون سازی کے علمی فورم "اسلامی نظریاتی کونسل" میں بھی اکٹھے ہیں اور نفاذ اسلام کے سیاسی محاذ "متحدہ مجلسِ عمل" میں بھی یکجا ہیں۔ اسلامی قوانین کی تعبیر و تشریح اور ان کے نفاذ کی عملی صورتوں کے حوالے سے ان کے درمیان کوئی ایسا خلا یا اختلاف دکھائی نہیں دے رہا جسے بہانہ بنا کر انہیں فرقہ پرستی کا طعنہ دیا جا سکے۔ البتہ طالبان کے خلاف گزشتہ دو سال کے دوران جو فضا جان بوجھ کر عالمی سطح پر بنائی گئی ہے اور صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس کی آڑ میں اسلام کی مخالفت کی جا سکے، دینی قوتوں کو گالی دی جا سکے اور اسلامی احکام کا مذاق اڑایا جا سکے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کی دینی قوتوں اور ملک کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے خلاف نئی مہم کی منصوبہ بندی کا آغاز ہو گیا ہے، ورنہ نہ طالبان نے اسلام کا کوئی نیا نقشہ پیش کیا ہے کہ انہوں نے کوئی ایسا حکم یا قانون افغانستان میں نافذ کیا ہو جو ان کا خود ساختہ ہو، اور جس کا تذکرہ قرآن و سنت اور امت کے چودہ سو سالہ فقہی ذخیرے میں پہلے سے موجود نہ ہو، اور نہ ہی پاکستان کی دینی قوتوں نے نفاذ اسلام کے لیے طالبان کا طریقہ کار اختیار کیا ہے۔ اس لیے کہ "قراردادِ مقاصد" سے لے کر سرحد اسمبلی کے حالیہ "شریعت ایکٹ" تک کے لیے جتنے اقدامات بھی ہوئے ہیں، جمہوری طریق کار کے مطابق ہوئے ہیں، منتخب اسمبلیوں کے ذریعے ہوئے ہیں، اور عوامی ووٹ اور مینڈیٹ کی بنیاد پر ہوئے ہیں......

ملکی قوانین کی تعبیر وتشریح اور نئے سانچے

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۷ اجولائی ۲۰۰۳ء)

......اس کے ساتھ ہی ایک اور رخ پر بھی نظر ڈال لیں کہ دستوری طور پر ملک کے قوانین کی تشریح اور ان کی اسلامی حیثیت کے تعین کے لیے دو باضابطہ ادارے وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کی صورت میں موجود ہیں، جو اپنے حصے کا خاصا کام کر چکے ہیں، لیکن ان دستوری اداروں اور ان کی سفارشات اور فیصلوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ''پاکستان لاء کمیشن'' ملکی قوانین کی تعبیر وتشریح اور انہیں نئے سانچوں میں ڈھالنے کے کام میں شب وروز مصروف ہے اور اس کی تجاویز وسفارشات کا بتدریج عملی نفاذ بھی ہو رہا ہے۔

نفاذِ شریعت کی جدوجہد کے ایک شعوری کارکن کے طور پر میرا اندازہ ہے کہ جس طرح ہمارے خاندانی قوانین اور شرعی احکام کی پاکستان لاء کمیشن کی طرف سے تشریح کی جا رہی ہے اور جس انداز سے ہماری اعلیٰ عدالتیں مسلسل فیصلے صادر کرتی جا رہی ہیں، اگر ملک کے دینی مراکز اور علمی حلقوں نے اس کا سنجیدہ نوٹس نہ لیا تو پاکستان کو ترکی بنانے کے لیے کسی باضابطہ اعلان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، اور زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کے عرصہ میں پاکستان اسلامی قوانین کے حوالے سے ترکی کے شانہ بشانہ کھڑا ہو گا۔

ہماری بدقسمتی اور محرومی کا ایک المناک پہلو یہ بھی ہے کہ نفاذِ شریعت کے حوالے سے ہر کام اور ہر جدوجہد کو ہم نے سیاست اور اسمبلی کے ساتھ مختص کر رکھا ہے۔ اسمبلی میں ہوں گے، حالات سازگار ہوں گے، کوئی سیاسی موقع میسر آئے گا تو شریعت کی بات ہوگی، ورنہ خاموش تماشائی بنے رہیں گے اور گھروں میں یا مساجد کے حجروں اور مدارس کے دفاتر میں بیٹھ کر اسلام کے خلاف کام کرنے والوں کو کوستے رہیں گے۔ مجھے اس حوالے سے سیاست اور اسمبلی کی اہمیت سے انکار نہیں، اور جو لوگ اس میدان اور شعبہ سے مناسبت رکھتے ہیں انہیں اس میدان میں موجود اور متحرک رہنا چاہیے، لیکن ہمارے علمی اداروں اور دینی مراکز نے جو خاموشی اختیار کر رکھی ہے، میں پیشگی معافی مانگتے ہوئے اسے مجرمانہ خاموشی کہنے کی جسارت کر رہا ہوں، اس لیے کہ اس کے سوا مجھے اس کے لیے کوئی اور عنوان

موزوں نظر نہیں آرہا ہے۔

خاندانی نظام اور نکاح وطلاق اور وراثت کے شرعی احکام کا شعبہ آج عالمی یلغار کی زد میں ہے، اور علمی وفکری محاذ پر اس کا مقابلہ کرنا اور مغربی تہذیب وثقافت کے تقابل میں اسلامی احکام وقوانین کی علمی وفکری وضاحت ہمارے علمی ودینی مراکز کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ اس کی طرف بروقت توجہ نہیں دیں گے اور خاموش تماشائی کے کردار پر قانع رہیں گے تو عنداللہ اور عندالناس کسی جگہ بھی سرخروئی نہیں ہوگی اور اس محاذ پر پاکستان کی (نعوذ باللہ) پسپائی کی ذمہ داری اول وآخر انہی پر ہوگی۔

زائداز ضرورت مکانات اور اسلامی نظریاتی کونسل

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۲ اگست ۲۰۰۳ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک سفارش گزشتہ دنوں بعض قومی اخبارات میں نظر سے گزری ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ مکانات کی تعمیر میں درجہ بندی کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے اور حکومت کو مختلف درجات کے لیے ضرورت کی حد بندی کر کے زائد از ضرورت بلڈنگ کی تعمیر پر پابندی لگا دینی چاہیے۔

ہمارے ہاں اس حوالے سے جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ بعض مقامات پر اس قدر ہوشربا ہے کہ معاشرہ میں مساوات، بھائی چارے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی اسلامی تعلیمات خواب کی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک قوم کے افراد نہیں ہیں، بلکہ مختلف قوموں کے لوگ یہاں رہتے ہیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

چند ماہ قبل کی بات ہے میں گوجرانوالہ کی جدید ترین اور ترقی یافتہ بستی ''واپڈا ٹاؤن'' گیا جہاں اعلیٰ درجہ کے مکانات اور زندگی کی بہترین سہولتیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک قدیمی گاؤں کوہلو والہ ہے۔ درمیان میں چار انچ کی دیوار کا صرف ایک پردہ ہے، دیوار کی ایک جانب واپڈا ٹاؤن ہے دوسری طرف کوہلو والہ ہے اور شاید یہ میرے اس معاملہ میں حد درجہ حساس ہونے کی بات ہے کہ مجھے یہ دیوار معاشرتی طور پر ''دیوار برلن'' محسوس ہوتی ہے۔ میں نے بہت سے دوستوں سے کہا ہے کہ وہ وہاں جائیں، اس دیوار کے اوپر کھڑے ہو کر دونوں طرف کا منظر دیکھیں، پھر اسلام کی ان تعلیمات کو ذہن میں لائیں جو مسلمانوں کے باہمی معاشرتی حقوق کے حوالے سے قرآن و سنت میں سینکڑوں مقامات پر موجود ہیں، اور اس کے بعد اس بات کا فیصلہ کریں کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک میں اور مسلمان کہلانے والی اس قوم میں اسلامی معاشرت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ابھی کس قدر محنت کی ضرورت ہے۔

ہمارے لیے اسلامی معاشرت کا آئیڈیل دور صحابہ کرامؓ کا دور اور اسلامی نظام کا آئیڈیل سسٹم خلافت راشدہ کا سسٹم ہے۔ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں حضرت عثمانؓ، حضرت عبد

الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ جیسے مالدار ترین حضرات بھی تھے اور حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ جیسے فقیر منش حضرات بھی کثیر تعداد میں تھے، لیکن مکان، لباس، خوراک، سواری اور دیگر روز مرہ ضروریات کے حوالے سے معیار زندگی کا ایسا تفاوت موجود نہیں تھا کہ الگ الگ طبقات نظر آنے لگیں۔ تھوڑے بہت فرق سے انکار نہیں کہ وہ فطری امر ہے، لیکن اس طرح کا فرق کہ آبادیاں ہی الگ الگ ہو جائیں اور روز مرہ ضروریات و معمولات کا معیار زمین و آسمان کا فرق ظاہر کرنے لگے اس دور میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ سرکاری عمال کے لیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ

- ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گے۔
- چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائیں گے۔
- گھر کے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنائیں گے اور
- باریک لباس نہیں پہنیں گے۔

یہ باتیں اس دور میں معاشرتی امتیاز کی علامتیں شمار ہوتی تھیں اور "سٹیٹس سمبل" سمجھی جاتی تھیں جن پر امیر المومنین حضرت عمرؓ نے پابندی لگا دی اور اپنے ہر سطح کے عمال، افسروں اور گورنروں کو پابند کر دیا کہ وہ لباس، رہن سہن، خوراک اور سواری وغیرہ میں عام لوگوں جیسی زندگی اختیار کریں گے، اور کوئی ایسا امتیاز پیدا نہیں کریں گے جس سے وہ عام شہریوں سے الگ کوئی طبقہ دکھائی دینے لگیں۔

حضرت عمرؓ نے صرف پابندی نہیں لگائی بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔ کوفہ کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے گھر کے آگے چھپر تعمیر ہونے کی اطلاع ملی تو اس کو اپنے حکم سے آگ لگوا دی۔ اور مصر کے گورنر عیاض بن غنمؓ کے بارے میں شکایت موصول ہوئی کہ انہوں نے باریک لباس کا استعمال شروع کر دیا ہے تو انہیں کچھ عرصہ کے لیے گورنری سے معزول کر کے بیت المال کی بکریاں چرانے پر لگا دیا۔ یہ امت کو اس بات کی تعلیم تھی کہ معاشرہ میں طبقاتی تفاوت اسلامی تعلیمات کی رو سے قابلِ قبول نہیں ہے اور اسلام کا معاشرہ طبقاتی نہیں ہے کہ اس میں ایک ہی شہر کی حدود کے اندر مختلف طبقات مختلف معیار زندگی کے الگ الگ انداز سے زندگی بسر کر رہے ہوں۔

خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دیکھ لیجئے کہ زندگی بھر سہولتوں اور آرام طلبی کے ہر قسم کے مواقع میسر آنے کے باوجود جان بوجھ کر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی ہے۔ یہ صرف

عزیمت وتقویٰ کی بات نہیں تھی، بلکہ اس کا تعلق تعلیم وتربیت سے بھی ہے اور معاشرتی معاملات میں امت کی رہنمائی سے بھی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ کی اس قسم کی تعلیمات اور ان حوالوں سے ان کے کردار کو ذاتی تقویٰ اور عزیمت کے کھاتے میں ڈال کر ان کے معاشرتی اور تربیتی پہلوؤں سے آنکھ بند کر لیتے ہیں اور رخصت کا سائن بورڈ کھڑا کر کے اپنے لیے ان تمام باتوں کی گنجائش پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کا خیر القرون میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

زائد از ضرورت مکان کی تعمیر پر پابندی کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے جو سفارش کی ہے وہ اس سلسلہ میں ایک جزوی حوالے سے ہے۔ اس کا تعلق اس بات سے بھی ہے کہ زائد از ضرورت بلڈنگ کی تعمیر سے سرمایہ بلاوجہ ضائع ہوتا ہے اور ایک بڑی رقم کسی ترقیاتی یا رفاہی مصرف پر لگنے کی بجائے نمود ونمائش اور تعیش کے کاموں پر صرف ہو جاتی ہے۔ ہم اس سفارش کی حمایت کرتے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کو اس سفارش پر مبارکباد دیتے ہیں۔ لیکن اصل ضرورت معاشرتی رویہ اور طرز عمل کو تبدیل کرنے کی ہے اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان پائے جانے والے اس خوفناک تفاوت کو کم کرنے کی ہے، جس نے ہمیں ایک دوسرے سے عملی طور پر لاتعلق طبقات میں بانٹ رکھا ہے۔

یہ تفاوت تنخواہوں میں بھی ہے، لباس میں بھی ہے، سواری میں بھی ہے، خوراک میں بھی ہے اور دیگر معاشرتی ضروریات واقدار میں بھی ہے۔ جس کی بنیاد معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کے ذہن وفکر پر ہے۔ ایک طرف ایک ہی شہر میں رہنے والے ایک صاحب کی ماہانہ تنخواہ دس لاکھ روپے ہے اور دوسری طرف اسی شہر کے دوسرے شخص کو بمشکل تین چار ہزار روپے ملتے ہیں۔ مجھ سے ایک دوست نے پوچھا کہ تنخواہوں میں اس قدر تفاوت اور معیار زندگی میں اس قدر فرق کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اگر آئیڈیل دور صحابہ کرامؓ اور خلفاء راشدینؓ کا ہے تو کوئی گنجائش نہیں ہے، اور ہماری موجودہ معاشرتی زندگی اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی اور متضاد ہے۔ اگر ہم نے کسی اور سوسائٹی کو اپنے لیے آئیڈیل اور راہنما قرار دے لیا ہے تو اس طرح کی سینکڑوں گنجائشیں مل سکتی ہیں۔

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جس منشور کے تحت حصہ لیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ جمعیۃ برسر اقتدار آنے کے بعد ملک بھر میں تنخواہوں کے تناسب میں تفاوت اور فرق کو کم کر

کے فوری طور پر انہیں ایک اور دس کے تناسب پر لے آئے گی، اور پھر اسے بتدریج ایک اور پانچ کے تناسب پر لایا جائے گا۔ یہ فیصلہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کے پس منظر میں تھا اور جمعیۃ علماء اسلام نے اس کے ذریعے طبقاتی تقسیم کے تلخ نتائج و ثمرات کو محسوس کرتے ہوئے ان کو کم کرنے کے لیے ایک عملی راستہ اختیار کرنے کی بات کی تھی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ کے چند سرداروں کے مطالبہ پر ان سے گفتگو کے لیے حضرت عمارؓ، حضرت بلالؓ اور ان جیسے فقیروں کو مجلس سے اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ بھلا کرے فقہاء کرام کا کہ انہوں نے مسجد کے آداب و شرائط میں یہ بات طے کر دی کہ کسی مسلمان کو مسجد میں آنے سے نہیں روکا جائے گا، ورنہ ہم تو طبقاتی تفاوت و تقسیم کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں رہائشی بستیوں کی طرح مسجدیں بھی امیروں اور غریبوں کے لیے الگ الگ ہوتیں، اور اسلام آباد کے مختلف گریڈوں کے حساب سے رہائشی سیکٹروں کی تقسیم کی طرح مسجدوں پر بھی بورڈ لگ جاتے کہ یہ مسجد بیس تا بائیس گریڈ والوں کی ہے، یہ پندرہ تا انیس گریڈ والوں کی مسجد ہے، اور اس مسجد میں اس سے نچلے گریڈ کے ملازمین نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اس لیے ہم اسلامی نظریاتی کونسل کی مذکورہ بالا سفارش کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ذمہ دار حضرات سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کی مجموعی صورتحال کے بارے میں بھی رائے دیں اور قوم کی اس باب میں رہنمائی کریں کہ اس طبقاتی تقسیم اور تفاوت کے زہر کا تریاق ہمیں کہاں سے ملے گا اور ہم اس دلدل سے کیسے نکل پائیں گے؟

زائد از ضرورت مکانات
اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۔ ستمبر ۲۰۰۳ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک سفارش حال ہی میں قومی اخبارات کے ذریعہ منظر عام پر آئی ہے جس میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ مکانات کی تعمیر میں ضروریات کے حوالہ سے درجہ بندی کی جائے اور زائد از ضرورت مکان کی تعمیر پر پابندی عائد کی جائے۔

اس سفارش کی ضرورت غالباً اس لیے پیش آئی ہے کہ ملک میں جس طرح بلند و بالا بلڈنگیں اور تعیش و نمائش کے رجحانات قیمتی سرمائے کے ضیاع کا باعث بن رہے ہیں انہیں کنٹرول کیا جائے اور سرمائے کے ضیاع کے ساتھ ساتھ تعیش اور نمود و نمائش کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو بھی روکا جائے۔ یہ سوچ قابلِ قدر ہے کیونکہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور نمود و نمائش کے بے جا اظہار نے انتہائی تکلیف دہ صورت اختیار کر لی ہے جس سے ملکی دولت کا ایک بڑا حصہ ترقیاتی اور رفاہی کاموں پر خرچ ہونے کی بجائے بے مقصد بلڈنگوں پر لگ رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی غریب اور امیر کا فرق بڑھتا جا رہا ہے، دولت کا چند ہاتھوں میں ارتکاز ہو رہا ہے اور عام آدمی کی زندگی اجیرن ہوتی جا رہی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی کی ضروریات تک محدود رہنا چاہیے اور اس میں سہولت کا راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب معاملہ ضرورت اور سہولت سے بڑھ کر تعیش اور نمود و نمائش تک جا پہنچے تو وہ معاشرہ کی تباہی کا ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ (۱) دولت کے ارتکاز، حرام و حلال کی پروا کیے بغیر ہر حال میں دولت کمانے، اور اسے تعیش اور نمود و نمائش کا ذریعہ بنانے کے رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ (۲) اور سادگی، قناعت اور ایثار کی روایات کو زندہ کرنے کی جدوجہد کی جائے کہ ہمارے مسائل کا اصل حل یہی ہے۔

”حدود آرڈیننس“ ختم کرنے کا مطالبہ

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ ستمبر ۲۰۰۳ء)

گزشتہ روز اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے تیس کے لگ بھگ این جی اوز سے تعلق رکھنے والی خواتین نے حدود آرڈیننس کے خلاف مظاہرہ کیا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق مظاہرہ کی قیادت کرنے والیوں میں دیگر سرکردہ خواتین کے علاوہ ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی محترمہ حنا جیلانی بھی شامل تھیں۔ انہوں نے خواتین کمیشن کی سربراہ جسٹس ماجدہ رضوی کی طرف سے حدود آرڈیننس کو منسوخ کرنے کی سفارش کی حمایت کی اور حدود آرڈیننس کو ختم کرنے کے مطالبہ کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا کہ عورتوں کے بارے میں تمام امتیازی قوانین کو ختم کر دیا جائے۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ وزیراعظم میر ظفر اللہ جمالی پارلیمنٹ ہاؤس جاتے ہوئے مظاہرہ کرنے والی خواتین کے پاس سے گزرے تو انہیں دیکھ کر گاڑی روک لی اور مظاہرین سے ملاقات کر کے انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے مطالبہ کا جائزہ لیں گے۔

حدود آرڈیننس چند معاشرتی جرائم مثلاً چوری، ڈکیتی، زنا، قذف اور شراب نوشی وغیرہ کی ان شرعی سزاؤں پر مشتمل ہے جو قرآن و سنت میں حتمی طور پر طے شدہ ہیں۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی اسلامی نظام کے دیگر حصوں کے ساتھ ساتھ ملک میں ان شرعی سزاؤں کے نفاذ کا مطالبہ شروع ہو گیا تھا اور بالآخر جنرل محمد ضیاء الحق کے دور میں ایک آرڈیننس کی صورت میں ملک میں انہیں نافذ کیا گیا تھا۔ یہ آرڈیننس اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی بنیاد پر ترتیب پایا تھا اور اس کے نفاذ کے لیے سب سے زیادہ کوشش اس وقت جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کی حکومت میں شامل ”پاکستان قومی اتحاد“ کی طرف سے کی گئی تھی۔ چنانچہ پاکستان قومی اتحاد نے اس کے نفاذ پر اس کی حمایت میں لاہور میں حضرت مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ کی زیر قیادت ایک عوامی مظاہرہ کا اہتمام بھی کیا تھا۔

اگرچہ عملی صورتحال یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد سے اب تک ان میں سے کسی سزا پر عمل نہیں ہو سکا اور مروجہ قانونی نظام کی بالادستی کا ایک ایسا حصار حدود آرڈیننس کے گرد قائم کر دیا گیا ہے کہ اصولی طور پر نافذ ہونے کے باوجود اب بھی کسی شرعی سزا پر عملدرآمد عملاً ممکن نہیں ہے، لیکن

اس کی مخالفت عالمی حلقوں اور ملک کے بعض حلقوں بالخصوص این جی اوز کی طرف سے مسلسل جاری ہے۔ اور ایمنسٹی انٹرنیشنل سے لے کر ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان تک بیسیوں ادارے اور لابیاں حدود آرڈیننس کی منسوخی کے لیے ایک عرصہ سے مصروف عمل ہیں۔ جسٹس ماجدہ رضوی کی سربراہی میں قائم خواتین کمیشن کی طرف سے حدود آرڈیننس کی منسوخی کی سفارش کی پشت پر یہی دباؤ کار فرما ہے اور انہیں مروجہ بین الاقوامی اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کے منافی قرار دیتے ہوئے ان کے خاتمے پر زور دیا جارہا ہے۔

حدود آرڈیننس پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ و نظام سے متصادم ہے، اور دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پاکستان میں اس قانون کا غلط استعمال ہو رہا ہے اور خاندانی جھگڑوں اور گروہی عصبیتوں کے ماحول میں بہت سے جھوٹے مقدمات درج کرا دیے جاتے ہیں جس سے سینکڑوں خواتین کو اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جہاں تک انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ و نظام سے متصادم ہونے کا تعلق ہے ہمیں اس سے انکار نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم نے مغرب کے فلسفہ و نظام ہی کو اپنانا ہے اور اس کی خاطر قرآن و سنت کے احکام و قوانین تک سے دستبرداری (نعوذ باللہ) اختیار کرنے کے لیے بھی ہم تیار ہیں، تو پھر اسلام کے نام پر ایک الگ ملک کے قیام، اس ملک کے دستور میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے، اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کے نفاذ کی ضمانت دینے کا کوئی مطلب باقی نہیں رہ جاتا۔ اور مغربی فلسفہ و نظام کی خاطر اسلامی احکام و قوانین سے دستبرداری کا مطالبہ خود پاکستان کے وجود اور جواز کی نفی قرار پاتا ہے۔

البتہ قانون کے غلط استعمال کی بات کسی حد تک قابلِ توجہ ہے اور ہمیں اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ دیگر قوانین کی طرح اس قانون کا بھی بہت جگہ غلط استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن یہ صرف اس قانون کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ حدود آرڈیننس کی طرح ملک میں رائج دیگر قوانین کا بھی اکثر و بیشتر غلط استعمال ہو رہا ہے۔ صرف قتل کے مقدمات کا جائزہ لے لیا جائے تو ان کی صورتحال بھی اس سے مختلف نہیں ہوگی کہ خاندانی جھگڑوں اور گروہی عصبیتوں کے ماحول میں بہت سے بے گناہ جیلوں میں نظر آئیں گے اور بہت سے گنہگار آزاد فضا میں دندناتے پھر رہے ہوں گے۔ اس لیے اس معاشرتی طرز عمل اور خرابی کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے سرے سے قانون ختم کر دینے کا مطالبہ کسی طرح بھی انصاف کا تقاضا نہیں ہے۔ بلکہ اس مہم کا اصل مقصد قانونی نظام کی صورتحال کی اصلاح

نہیں، بلکہ مغرب کے ایجنڈے کی تکمیل ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس مطالبہ کا بھی ایک نظر جائزہ لے لیا جائے کہ "خواتین کے بارے میں امتیازی قوانین کو ختم کیا جائے"۔ یہ مطالبہ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی ایک دفعہ کے پس منظر میں ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ "جنس کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا"۔ اس مختصر جملے کو اگر قانونی تعبیرات کے دائرہ میں دیکھا جائے تو ہمارے بیشتر قوانین و احکام اس کی زد میں آتے ہیں اور جنس کی بنیاد پر امتیاز قرار پاتے ہیں، مثلاً:

- اسلام میں حکمرانی کا منصب مرد کے لیے مخصوص ہے اور عورت حاکم نہیں بن سکتی، جو آج کے عالمی عرف اور قانون کی نظر میں جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔
- خاندانی نظام میں قرآن کریم کی رو سے خاوند کو خاندان کے سربراہ کی حیثیت حاصل ہے، یہ بھی جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔
- مرد کو طلاق کا حق براہ راست ہے، جبکہ عورت براہ راست طلاق دینے کا حق نہیں رکھتی، یہ بھی جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔
- معاملات کے مقدمات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے، یہ بھی جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔
- وراثت میں خواتین کا حصہ بہت سی صورتوں میں مردوں سے کم ہے، جو جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔
- عورتوں کو مردوں کی طرح کھلے بندوں باہر جانے، بازاروں میں گھومنے پھرنے، اور آزادانہ طور پر مجالس و محافل میں شرکت، حتیٰ کہ مساجد میں نماز وغیرہ کے لیے بھی مردوں کی طرح آزادانہ طور پر شریک ہونے کی اجازت نہیں ہے، جو جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔
- ملازمتوں میں عورتوں کو مردوں کی طرح ہر قسم کی ملازمت کرنے کا حق نہیں ہے، جو جنس کی بنیاد پر امتیاز ہے۔

اسی طرح زندگی کے کسی شعبہ میں اسلام نے عورت اور مرد کی خلقت، فطری صلاحیتوں اور معاشرتی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو الگ الگ احکام و ضوابط بیان کیے ہیں، وہ سب کے سب جنس کی بنیاد پر امتیاز کے فلسفہ کی روشنی میں آج کے مروجہ عالمی نظام اور اقوام متحدہ کے انسانی حقوق

کے چارٹر کے منافی قرار پاتے ہیں۔ اور جب کوئی این جی او اور تنظیم عورتوں کے بارے میں امتیازی قوانین کے خاتمے کا مطالبہ کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے تمام قوانین و احکام کو منسوخ کر کے ملک میں وہی نظام مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے جو اس وقت مغربی ممالک میں رائج ہے۔

جسٹس ماجدہ رضوی کے خواتین کمیشن کی طرف سے حدود آرڈیننس کی منسوخی کی سفارش کے بعد اسلامی احکام و قوانین اور اقدار و روایات کے خلاف این جی اوز کی مہم ایک بار پھر منظم ہو رہی ہے، اور اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے تیس کے قریب این جی اوز پر مشتمل جوائنٹ ایکشن کمیٹی کا یہ مظاہرہ ملک کے دینی حلقوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ ''متحدہ مجلسِ عمل'' کی ارکان اسمبلی نے اس سلسلہ میں اسلام آباد میں اسلامی قوانین کی حمایت میں جو مظاہرہ کیا تھا، اس کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ دینی جماعتوں کو اس بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے اور رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے مہم کو منظم کرنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں عوام کی بے خبری کو دور کرنا ہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔ اگر دینی حلقوں کی طرف سے عوام کو ان مطالبات کے پس منظر اور ان کے اصل مقاصد سے باخبر کرنے کا ہی اہتمام ہو جائے تو اگلا کام ان شاء اللہ مقامی پاکستان کے غیور عوام خود کر لیں گے۔

”حدود آرڈیننس“ اور خواتین کے حقوق

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۴ستمبر ۲۰۰۳ء)

قومی اسمبلی میں ایم ایم اے (متحدہ مجلس عمل) کی خواتین ارکان اسمبلی نے ویمن کمیشن کی سربراہ جسٹس ماجدہ کی طرف سے حدود آرڈیننس کو ختم کرنے کے مطالبہ پر احتجاج کیا ہے اور کہا ہے کہ شرعی قوانین کی منسوخی کا کوئی قدم برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ویمن کمیشن نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ملک میں نافذ ہونے والے حدود آرڈیننس کو یکسر منسوخ کر دیا جائے، کیونکہ یہ آرڈیننس کمیشن کے ارکان کے بقول ملک میں عورتوں کے ساتھ زیادتی اور ناانصافی کا باعث بن رہا ہے اور اس کی وجہ سے عالمی سطح پر پاکستان کی بدنامی ہو رہی ہے۔

”حدود“ کی اصطلاح اسلامی شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، جس کا اطلاق معاشرتی جرائم کی ان سزاؤں پر ہوتا ہے، جو قرآن وسنت میں حتمی طور پر طے شدہ ہیں۔ جرم ثابت ہونے کی صورت میں کسی عدالت کو ان سزاؤں میں کمی بیشی کا اختیار نہیں ہوتا اور عدالت ان سزاؤں کو اسی صورت میں نافذ کرنے کی پابند ہوتی ہے جس طرح قرآن وسنت اور اجماع امت کے ذریعے انہیں بیان کیا گیا ہے۔ یہ صرف چند جرائم کی سزائیں ہیں۔

ان کے علاوہ باقی جرائم کی سزائیں متعیّن کرنے کا اسلامی حکومت کو اختیار حاصل ہوتا ہے اور قاضی بھی موقع محل کی مناسبت سے ان سزاؤں میں کمی بیشی یا معافی کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ یہ سزائیں ”تعزیرات“ کہلاتی ہیں اور پانچ چھ جرائم کے سوا باقی تمام صورتوں میں اسلام نے حکومت اور عدالت کو سزا دینے یا نہ دینے، سزامیں کمی بیشی کرنے یا اپنے ماحول اور ضرورت کے مطابق سزا کی کوئی شکل طے کرنے کا اختیار دیا ہے۔

البتہ پانچ یا چھ جرائم ایسے ہیں جن کے عدالت کے نوٹس میں آجانے اور جرم ثابت ہوجانے کے بعد سزا کو معاف کرنے یا اس میں کمی بیشی کرنے کا اختیار عدالت کے پاس باقی نہیں رہتا اور وہ فقہ اسلامی کی وضاحت کے مطابق درج ذیل ہیں:

۱. چوری کی سزا قرآن کریم نے سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳۸ کے مطابق یہ طے کی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اور متعدّد روایات کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی عملاً یہی سزا دی ہے۔
۲. شراب پینا اسلامی شریعت میں حرام ہے اور اس کی سزا صحابہ کرامؓ کے اجماع کی رو سے اسی کوڑے ہے۔
۳. کسی پاکدامن مرد یا عورت پر بدکاری کی تہمت لگانا سنگین جرم ہے، جسے قذف کہا جاتا ہے اور اس کی سزا قرآن کریم نے سورۃ النور آیت نمبر ۴ کے مطابق اسی کوڑے متعیّن کی ہے۔
۴. زنا کی سزا قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تشریحات کے مطابق دو درجوں میں ہے۔ اگر بدکاری کرنے والا مرد یا عورت شادی شدہ ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اسے سنگسار کر دیا جائے، اور اگر وہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک غیر شادی شدہ ہو تو اسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔
۵. ڈکیتی کی سزا قرآن کریم نے سورۃ المائدہ آیت نمبر ۳۳ میں مختلف صورتوں میں ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹنا، سولی پر لٹکانا، یا جلاوطن کرنا بیان کی ہے۔
۶. ارتداد یعنی کسی مسلمان کا ایک اسلامی ریاست میں اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنا بھی اسلامی شریعت کی رو سے قابلِ دست اندازی پولیس جرم تصور ہوتا ہے، اور اس کی سزا خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارکہ کے مطابق یہ ہے کہ توبہ نہ کرنے کی صورت میں اسے قتل کر دیا جائے۔

قرآن و سنت کی بیان کردہ ان سزاؤں کو حدود کہا جاتا ہے اور جہاں بھی اسلامی نظام کی بات ہوتی ہے، فطری طور پر نفاذ اسلام کے مطالبات میں یہ بات بھی شامل ہوتی ہے کہ معاشرے میں جرائم کو کنٹرول کرنے کے لیے حدود شرعیہ کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔

ہمارے ہاں ۱۸۵۷ء تک پورے متحدہ ہندوستان میں جو قانونی نظام رائج تھا اس میں یہ حدود شامل تھیں، جو ملکی قانون کی صورت میں نافذ تھیں اور عدالتیں اسی کے مطابق فیصلے دیا کرتی تھیں۔ مگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد جب برطانوی حکومت نے دہلی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تو ''فتاویٰ عالمگیری'' کی صورت میں نافذ ان شرعی قوانین کو ختم کر کے برطانوی قوانین

کے مطابق قانونی نظام کا ایک نیا ڈھانچہ متحدہ ہندوستان کی عدالتوں میں ''تعزیرات ہند'' کے نام سے نافذ کر دیا جو ابھی تک باقی چلا آرہا ہے اور قیامِ پاکستان کے بعد اس کو ''تعزیرات پاکستان'' کا نام دے دیا گیا ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد ملک کے دینی حلقوں نے اس بنیاد پر کہ پاکستان اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا ہے اور قائداعظم محمد علی جناح نے متعدّد اعلانات میں واضح کیا تھا کہ پاکستان میں وہی قوانین نافذ ہوں گے جو قرآن و سنت نے بیان کیے ہیں، مسلسل یہ مطالبہ جاری رہا کہ قومی زندگی کے دیگر شعبوں کی طرح عدالتوں میں بھی اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے، اور اسی مطالبہ پر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے اپنے دور حکومت میں ''حدود آرڈیننس'' کے نام سے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کی روشنی میں ان سزاؤں کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ ان سزاؤں کا آج تک عملی نفاذ سامنے نہیں آیا، بلکہ چند شرعی قوانین کے نفاذ کے ساتھ بھی ان کے گرد مروجہ قانونی نظام کی بالادستی اور دیگر تحفظات کا ایک ایسا حصار قائم کر دیا گیا کہ کسی جرم پر شرعی سزا کا عملاً نفاذ نہ آج تک ممکن ہو سکا ہے اور نہ ہی مستقبل میں اس کی کوئی توقع ہے۔ مگر ان کے باوجود حدود شرعیہ کے اس برائے نام نفاذ پر بھی پوری دنیا میں شور بپا ہے۔ اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے حکومت پاکستان پر ان قوانین کی منسوخی کے لیے مسلسل دباؤ ڈالا جا رہا ہے اور ہمارے خیال میں ویمن کمیشن کی مذکورہ سفارش بھی اسی مہم کا حصہ ہے۔

حدود شرعیہ کے سلسلہ میں جو اعتراضات کیے جا رہے ہیں، ان میں سب سے بڑا اعتراض ہے کہ یہ قوانین آج کے مروجہ عالمی قانونی نظام سے متصادم ہیں۔ اور اقوام متحدہ کے منشور کی روشنی میں دنیا میں انسانی حقوق کی جو تشریح کی جا رہی ہے، اس کی رو سے معاشرتی جرائم کی یہ سزائیں متشددانہ اور ذہنی و جسمانی اذیت پر مشتمل ہیں، اس لیے انسانی حقوق کے منافی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض معاملات میں صرف سزاؤں کی سختی اور تشدد تک بات محدود نہیں رہتی، بلکہ کسی عمل کے جرم ہونے کا تصور و تعین بھی متنازعہ قرار پاتا ہے۔ مثلاً:

- زنا یعنی اپنی جائز بیوی کے سوا کسی اور عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا اسلام کی رو سے سنگین جرم ہے، جس کی انتہائی سزا موت ہے۔ مگر اقوام متحدہ کے منشور اور عالمی اداروں کی طرف سے کی گئی اس کی تشریحات کے مطابق کوئی مرد اور عورت نکاح کا تعلق نہ ہونے کے

باوجود اگر باہمی رضامندی سے جنسی تعلق قائم کرتے ہیں تو یہ سرے سے جرم ہی نہیں ہے۔

- اسی طرح مرد کا مرد کے ساتھ جنسی تعلق اسلام کی رو سے قطعی حرام ہے اور اس کی سنگین سزا بیان کی گئی ہے، مگر مروجہ عالمی قانونی نظام کے مطابق یہ کام جرم ہی متصور نہیں ہوتا، حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے زیر اہتمام عالمی خواتین کانفرنس میں قرارداد کے ذریعے دنیا بھر کی حکومتوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ملکوں میں ”متبادل جنسی عمل“ (یعنی لواطت) کو قانونی تحفظ فراہم کریں، جبکہ اکثر و بیشتر مغربی ملکوں میں اس لعنتی عمل کو قانونی تحفظ فراہم کیا جا چکا ہے۔

قوانین کے سخت ہونے یا نہ ہونے کی بحث ایک طرف، مگر یہ حقیقت ہے کہ حدود شرعیہ کے نفاذ پر مغربی فلسفہ و تہذیب اور مروجہ بین الاقوامی قانونی نظام کے پس منظر میں اعتراض کرنا، اور کسی مسلمان ملک میں نافذ شدہ اسلامی قوانین کی منسوخی کا مطالبہ کرنا اسلامی تہذیب و ثقافت اور مغربی ثقافت و معاشرت کے درمیان جاری کشمکش میں مغرب کی حمایت اور اس کا ساتھ دینے کے مترادف ہے۔ اس لیے ویمن کمیشن کی مذکورہ سفارش کو اس تہذیبی کشمکش اور ثقافتی محاذ آرائی کے اس پس منظر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کی حمایت یا مخالفت کرنے والوں کو اپنے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچ لینا چاہیے کہ وہ موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش کے حوالے سے کس کیمپ میں کھڑے ہیں۔

حدود آرڈیننس کے نفاذ کے حوالے سے جو دوسرا بڑا اعتراض کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کا غلط استعمال ہو رہا ہے اور اعتراض کرنے والوں کے بقول سینکڑوں خواتین غلط الزامات کے تحت جیلوں میں قید ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے اور اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی حجاب نہیں ہونا چاہیے کہ ان قوانین کا بہت جگہ غلط استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن یہ صرف ان قوانین کی بات نہیں، ان کے علاوہ باقی قوانین کا بھی یہی حال ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ملک میں نافذ اکثر و بیشتر قوانین کا ہر سطح پر غلط استعمال ہو رہا ہے، مگر اس کا تعلق قانون کی ضرورت و افادیت سے نہیں، بلکہ معاشرتی رویوں سے ہے اور ان معاشرتی اقدار سے ہے جو دور غلامی میں ہماری صفوں میں گھس آئی تھیں اور اب نیم غلامی کے دور میں مسلسل پروان چڑھ رہی ہیں اور انہوں نے پورے معاشرے کو کرپٹ کر دیا ہے۔

لہٰذا اگر قانون کے غلط استعمال کو دلیل کے طور پر قبول کر لیا جائے تو کوئی قانون اس کی زد سے نہیں بچتا اور اکثر و بیشتر مروجہ قوانین کو باقی رکھنے کا جواز مشکوک ہو جاتا ہے۔ مثلاً قتل ایک سنگین جرم

ہے، جس کی سزا ہمارے قانون میں موت ہے۔ اگر مذکورہ بنیاد پر ملک میں قتل کے جرم میں درج کیے گئے مقدمات اور ان کے تحت گرفتار شدہ حضرات کا اسی طرح سروے کیا جائے، جیسے ہماری این جی اوز حدود آرڈیننس کے مقدمات کا سروے کرتی رہتی ہیں، تو قتل کے قوانین کے غلط استعمال اور ان کے ذریعے ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کا تناسب اس سے کسی طرح کم نہیں ہو گا، جس کا نقشہ حدود آرڈیننس کے مقدمات کے حوالے سے قوم کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔

اس لیے اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ سرے سے قتل کی سزا کا قانون ہی ختم کر دیا جائے یا قتل کو جرم قرار دینے سے انکار کر دیا جائے، بلکہ اس کا اصل اور صحیح حل یہ ہے کہ قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں اور زیادتیوں کی روک تھام کی راہ نکالی جائے۔ کسی قانون کے غلط استعمال کی وجہ سے اس قانون کو ہی ختم کر دینے کا مطالبہ نہ تو مسئلے کا حل ہے اور نہ ہی انصاف کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

کار فنانسنگ اور اسلامی نظریاتی کونسل

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - دسمبر ۲۰۰۳ء)

روزنامہ جنگ لاہور ۳نومبر ۲۰۰۳ء میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت سے سفارش کی ہے کہ کار فنانسنگ اسراف کی حوصلہ افزائی ہے اس لیے حکومت اس پر پابندی لگائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا کہنا ہے کہ شریعت نے بلاضرورت قرض لینے سے منع کیا ہے جبکہ کنزیومر بینکنگ اور کار فنانسنگ کے پروگرام بلاضرورت قرضوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اس لیے حکومت کو چاہیے کہ وہ کنزیومر بینکنگ کو شخصی قرضوں کا ذریعہ بنانے کی بجائے ملکی صنعت کے فروغ کے لیے کام میں لائے۔

کار فنانسنگ کی اسکیم غالباً مغربی ملکوں بالخصوص امریکہ کے اس نظام سے لی گئی ہے جس کے تحت کوئی بھی شہری مکان، گاڑی یا کسی اور ضرورت کے لیے قرضہ لے سکتا ہے جو اسے آسانی سے مل جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اس کی زندگی ان قرضوں کی قسطیں ادا کرتے گزر جاتی ہے کیونکہ سود در سود کے سسٹم کے تحت وہ قرضہ مسلسل بڑھتا رہتا ہے اور ایک طویل عرصہ تک اس کی قسطوں کی ادائیگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

جہاں تک بنیادی ضروریات کا تعلق ہے ان کے لیے حکومت یا بینک کی طرف سے شہریوں کو قرضے کی فراہمی ایک اچھی بات ہے بشرطیکہ وہ غیر سودی ہو اور اس کی وصولی آسان اقساط میں کی جائے۔ مگر کار (گاڑی) بنیادی ضروریات میں شامل ہے یا نہیں، یہ بات بحث طلب ہے، اور ہمارے خیال میں اسے مطلقاً ضروریات سے خارج کرنا شاید مناسب نہ ہو کیونکہ اس کا انحصار حالات پر ہے۔ بعض حالات اور مواقع کے حوالہ سے یہ کسی شہری کی ضروریات میں شامل ہو گی اور بعض حالات میں یہ زائد از ضرورت اسراف کی مد میں شامل ہو جائے گی۔

البتہ اسلامی نظریاتی کونسل کی اس بات سے ہمیں اتفاق ہے کہ قرضوں کے اجرا میں شخصی قرضوں کی بجائے صنعت و تجارت کے حوالہ سے قرضوں کی پالیسی کو ترجیح دی جائے کیونکہ اس سے لوگوں کی ضروریات بھی پوری ہوتی رہیں گی اور رقوم کسی ترقیاتی کام میں بھی صرف ہوں گی، مگر یہ قرضے غیر

سودی ہونے چاہئیں۔ ویسے اسلامی نظام میں تو ان قرضوں کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ شرعی نظام میں شہریوں کی بنیادی ضروریات بیت المال کی ذمہ داری ہوتی ہیں، اور بیت المال ان ضروریات کو قرض کے ذریعہ نہیں بلکہ وظیفہ اور امداد کی صورت میں پوری کرتا ہے۔ مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی اصولوں کے مطابق بیت المال کا نظام قائم ہو، ملک میں دولت کے وسائل کی شریعت کے مطابق تقسیم ہو، طبقاتی معاشرت اور معیشت کا نظام ختم کیا جائے، اور زکوٰۃ و عشر کا مکمل نظام ایک نظریاتی اسلامی حکومت کے زیر انتظام قائم ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو شہریوں کو اپنی ضروریات کے لیے کسی سے قرض مانگنے کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ بیت المال خود بخود ان کی ضروریات پوری کرتا رہے گا۔

غیرت کے نام پر قتل اور اسلامی نظریاتی کونسل

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۳۱ اگست ۲۰۰۴ء)

وزیراعظم چودھری شجاعت حسین نے غیرت کے نام پر قتل اور الزام تراشی کے حوالے سے قومی اسمبلی میں بل پیش کرنے کا اعلان کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس سلسلہ میں جو قانون تجویز کیا جائے گا وہ اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی بھجوایا جائے گا۔

غیرت کے نام پر قتل اور "کاروکاری" کا معاملہ ایک عرصہ سے ہمارے قومی حلقوں میں زیر بحث ہے، خاص طور پر این جی اوز کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ غیرت کے نام پر قتل کو سنگین جرم قرار دیا جائے اور کاروکاری کے خاتمے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں۔ کاروکاری ہمارے ہاں ایک قبائلی روایت کو کہا جاتا ہے جس کے تحت بعض قبائل میں ایسی عورتوں کو جرگے کے فیصلے کے مطابق قتل کر دیا جاتا ہے جو بدکاری اور زنا کی مرتکب ہوئی ہوں۔ این جی اوز اسے ماورائے عدالت قتل قرار دے کر اس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کر رہی ہیں، جبکہ متعدّد قبائلی راہنماؤں نے اس کا دفاع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں نواب محمد اکبر خان بگٹی کا ایک بیان شائع ہوا ہے کہ کاروکاری میں صرف عورت کو ہی نہیں بلکہ مرد کو بھی قتل کیا جاتا ہے، اس لیے اسے صرف عورتوں کے خلاف اقدام قرار دینا درست نہیں۔ جبکہ اس سے قبل جناب محمد اجمل خٹک سے منسوب اس قسم کی بات بھی اخبارات میں شائع ہو چکی ہے کہ یہ ہماری روایت کا حصہ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کاروکاری کے عنوان سے اس وقت جو بحث ہمارے ہاں چل رہی ہے، اس میں این جی اوز کے خلاف دوسرا فریق ہمارے قبائل ہیں جو اپنی اس نوعیت کی روایات کا تحفظ چاہتے ہیں، جبکہ این جی اوز ان کے خاتمے کے لیے مصروف کار ہیں۔ اس سے قبل پنجاب کے بعض علاقوں میں "ونی" کی رسم کا تذکرہ بھی اخبارات میں اہتمام کے ساتھ ہو چکا ہے، جس کے تحت خاندانوں میں قتل و قتال اور دیگر دشمنیوں کو نمٹانے کے لیے معصوم بچیوں کے رشتے مخالف خاندانوں کو دلوا کر صلح کرا دی جاتی ہے، اور قبائل کے جرگے خاندانوں کی دشمنیاں ختم کرانے کے لیے چھوٹی چھوٹی بچیوں کو ونی کی رسم کے نام پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔

اس حوالے سے این جی اوز کا مطالبہ ہے کہ یہ رسم ظالمانہ ہے اور عورتوں کی حق تلفی ہے اس لیے ختم کیا جانا چاہیے۔ اسی طرح بہت سی قبائلی اور علاقائی رسموں اور روایات کے تحفظ یا خاتمے کے لیے کشمکش جاری ہے جو اب ملک کے قانون ساز اداروں تک پہنچ چکی ہے۔ چنانچہ گزشتہ دنوں قومی اسمبلی میں کاروکاری کے حوالے سے بات چلی تو حکومتی حلقوں کے بعض ذمہ دار حضرات نے اس رسم کا دفاع کیا اور کہا کہ ہم اپنی غیرت کو قربان نہیں کر سکتے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے میرے خیال میں وہ اس کشمکش کا فریق نہیں ہے اور نہ ہی اسے فریق بنانا چاہیے، کیونکہ تنازع رائج الوقت علاقائی اور قبائلی رسم و روایات اور ان کی جگہ آگے بڑھنے والی مغربی روایات و رسوم کے درمیان ہے۔ مغرب کا خاندانی نظام اور معاشرتی رسوم و روایات آگے بڑھ رہی ہیں، ذرائع ابلاغ اور این جی اوز ان کے لیے مسلسل مصروف کار ہیں۔ جبکہ مقامی، علاقائی اور قبائلی روایات ان کی راہ میں مزاحم ہیں اور ان کا راستہ روکنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ اسلام کہیں بھی رائج العمل نہیں ہے، نہ ہی ہمارے اجتماعی فیصلے کسی سطح پر بھی اس کی بنیاد پر ہو رہے ہیں، بلکہ اسے ہم نے صرف عقائد، عبادات اور اخلاقیات تک ہی محدود کر رکھا ہے۔

عدالتیں ہوں، قبائلی جرگے ہوں، یا خاندانی پنچایتیں ہوں، وہ فیصلے قرآن و سنت کی بجائے اپنی روایات کے مطابق کرتی ہیں اور اس کے لیے قرآن کریم اور سنتِ نبویؐ کے واضح فیصلوں کی پروا بھی نہیں کرتیں۔ دوسری طرف این جی اوز کے مطالبات کی بنیاد بھی قرآن و سنت پر نہیں بلکہ مغربی معاشرت اور فلسفہ و نظام پر ہے۔ اور وہ اپنے کسی مطالبے اور موقف کے لیے قرآن و سنت کی بجائے مغربی فلسفہ و ثقافت کی بنیاد پر مروجہ بین الاقوامی قوانین کا حوالہ دیتی ہیں۔ اس لیے عملی طور پر دیکھا جائے تو اس کشمکش میں اصل فریق علاقائی اور قبائلی روایات اور ان کے مقابل مغربی ثقافت اور مروجہ بین الاقوامی قوانین ہیں۔ اسلام کا تعلق اس سے صرف اتنا ہے کہ ان میں سے جس فریق کو اسلام کی کوئی بات اپنے حق میں ملتی ہے وہ اسے استعمال کر لیتا ہے۔

جہاں تک غیرت کے نام پر قتل کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں اسلام میں ملی جلی روایات ملتی ہیں:

۱۔ ایک طرف بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ جب قرآن کریم میں یہ حکم نازل ہوا کہ کوئی شخص کسی عورت پر زنا کا الزام لگائے تو اسے اس کے ثبوت میں اس عورت کی بدکاری کے چار گواہ پیش کرنا ہوں گے، اور اگر وہ چار گواہ پیش نہیں کر سکے گا تو اسے یہ الزام لگانے پر

قذف کے جرم میں ۸۰ کوڑوں کی سزا ملے گی۔ اس پر انصار مدینہ کے سردار حضرت سعد بن عبادہؓ نے جناب نبی اکرمؐ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں اگر اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو بدکاری میں مصروف دیکھوں تو کیا چار گواہ تلاش کرتا پھروں گا کہ تم بھی آ کر یہ منظر دیکھو؟ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا بلکہ تلوار کے ساتھ ان دونوں کی گردنیں اڑا دوں گا۔ اس پر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریب بیٹھے ساتھیوں سے کہا کہ "کیا تم سعدؓ کی غیرت دیکھ رہے ہو؟ بخدا میں اس سے زیادہ غیرت والا ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے بھی زیادہ غیور ہے"۔ محدثین کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی غیرت سب سے زیادہ ہے اور چونکہ چار گواہوں کا قانون اس نے نافذ کیا ہوا ہے اس لیے یہ غیرت کے خلاف نہیں، اور قانون کو ہاتھ میں لینے کی کسی کو اجازت نہیں۔

اس کے بعد قرآن کریم نے اس سلسلہ میں مزید ہدایات دیں کہ اگر بدکاری کے الزام کا معاملہ میاں بیوی کے درمیان ہو تو اس کے لیے چار گواہوں کی ضرورت نہیں بلکہ میاں بیوی عدالت میں پانچ پانچ قسمیں کھائیں گے۔ میاں چار مرتبہ کہے گا کہ میں نے اس پر بدکاری کا جو الزام لگایا ہے وہ درست ہے، اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت نازل ہو۔ جبکہ جواب میں بیوی اگر اس الزام کو درست تسلیم نہیں کرتی تو وہ بھی چار بار قسم اٹھائے گی کہ مجھ پر الزام لگانے میں یہ شخص جھوٹا ہے، اور اگر یہ سچا ہے تو مجھ پر خدا کا غضب نازل ہو۔ پھر قاضی ان دونوں میں تفریق کرا دے گا اور وہ میاں بیوی نہیں رہیں گے۔

چنانچہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشاد سے محدثین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگر کسی عورت پر بدکاری کا الزام ہو تو کاروائی قانون کے مطابق ہونی چاہیے اور کسی کو قانون کو ہاتھ میں لینے کا حق نہیں ہے۔

۲. لیکن دوسری طرف امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کے ساتھ بدکاری میں مصروف دیکھ کر دوسرے شخص کو قتل کر دیا۔ اور جب مقتول کے ورثاء قتل کا مقدمہ لے کر حضرت عمرؓ کے پاس گئے تو قاتل نے یہ موقف اختیار کیا کہ میں تو اپنی بیوی کی ٹانگوں کے درمیان تلوار چلائی تھی، اگر وہاں کوئی آدمی ہو گا تو مر گیا ہو گا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے یہ خون "ہدر" قرار دے دیا یعنی مزید کوئی کاروائی

کیے بغیر کیس داخل دفتر کر دیا۔

اس پس منظر میں اسلامی نظریاتی کونسل سے ہماری گزارش یہ ہے کہ وہ ان معاملات میں فریق نہ بنے بلکہ حکم اور ثالث کا کردار ادا کرے کہ ایسے معاملات میں موجودہ حالات میں اسلام کا اصل کردار یہی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اس تنازع کے دونوں فریقوں کے موقف اور اس کی فکری بنیادوں کا جائزہ لے اور دونوں کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے وسیع تر تناظر میں اس ثقافتی اور تہذیبی کشمکش کو دیکھے، پھر قرآن و سنت اور خلفاء راشدینؓ کے فیصلوں کی روشنی میں اسلام کے موقف کی وضاحت کرے، کیونکہ معروضی حالات میں اس کشمکش میں کسی ایک فریق کے ساتھ کھڑا ہونا اسلام کے موقف کو مسخ کرنے کے مترادف ہو گا۔

حسبہ ایکٹ اور اسلامی نظریاتی کونسل

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ستمبر ۲۰۰۴ء)

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے صوبہ سرحد کی حکومت کی طرف سے پیش کیے جانے والے ''حسبہ ایکٹ'' کو یہ کہہ کر ناقابلِ عمل قرار دے دیا ہے کہ اس سے ایک متوازی سسٹم وجود میں آجائے گا۔

صوبہ سرحد میں ایم ایم اے (متحدہ مجلس عمل) کی حکومت کی یہ کوشش ہے کہ حسبہ ایکٹ کے تحت صوبہ میں احتساب کا ایک ایسا خودکار نظام قائم کر دیا جائے جو معاشرہ میں معروفات کے فروغ اور منکرات کی روک تھام کے لیے کام کرتا رہے، تاکہ قرآن کریم نے ایک مسلم حکومت کے فرائض میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی جو ذمہ داری شامل کی ہے اس کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اسلامی تعلیمات کے مطابق معاشرہ کی اصلاح وتعمیر کی کوئی عملی صورت نکل آئے۔ مگر یہ حسبہ ایکٹ مسلسل اعتراضات کی زد میں ہے، پہلے گورنر سرحد نے اسے صوبائی حکومت کو واپس کیا اور اب اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اس پر اعتراض کر دیا ہے۔

ہمارے خیال میں اسلامی نظریاتی کونسل کا یہ اعتراض دو حوالوں سے محلِ نظر ہے:

۱. ایک اس وجہ سے کہ اگر حسبہ ایکٹ کے نفاذ کی صورت میں بالفرض صوبائی سطح پر کسی دائرہ میں متوازی نظام قائم ہوتا ہے تو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ ہم فوجی عدالتوں کی صورت میں متعدد بار متوازی سسٹم کے تجربات سے گزر چکے ہیں، بلکہ اب بھی ملک بھر میں ایک ایسے متوازی نظام سے دوچار ہیں جو ملک کے دستور سے مطابقت نہیں رکھتا لیکن اس کے باوجود اسے نہ صرف تسلیم کیا جا رہا ہے بلکہ ملک کی عدالتیں حتیٰ کہ خود اسلامی نظریاتی کونسل بھی اسی کے تحت کام کر رہی ہے۔ اس لیے جب پورے ملک میں دستور کی موجودگی میں ایک متوازی سسٹم کو قبول کیا جا رہا ہے اور اس پر عمل بھی ہو رہا ہے تو صوبہ سرحد میں ایک محدود دائرہ میں اسلامی تعلیمات پر عملدرآمد کے لیے کوئی متوازی سسٹم وجود میں آ بھی جائے تو اس سے کوئی قیامت نہیں بپا ہو جائے گی۔

۲. دوسرا اس وجہ سے کہ ہمارے خیال میں اسلامی نظریاتی کونسل کا قیام موجودہ سسٹم کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس سسٹم کی خامیوں کی نشاندہی اور ان کی اصلاح کے لیے اقدامات تجویز کرنے کے لیے عمل میں لایا گیا ہے۔ اس لیے حسبہ ایکٹ کو موجودہ سسٹم کے تحفظ کی خاطر قابلِ اعتراض قرار دے کر اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے مقصدِ قیام کے خلاف کام کیا ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل کو اپنی اس سفارش پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

جہاں تک موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل کا تعلق ہے، اپنے قیام کے بعد سے بجائے خود وہ دینی حلقوں کی تنقید کا نشانہ بنی ہوئی ہے اور مختلف مکاتبِ فکر کی ذمہ دار قیادت اسے غیر نمائندہ قرار دے کر اس کے خلاف عدمِ اعتماد کا اظہار کر چکی ہے۔ اس لیے سرحد حکومت کے حسبہ ایکٹ کے خلاف اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ رائے اصولی اور واقعاتی دونوں حوالوں سے قابل توجہ نہیں ہے۔

چودھری شجاعت حسین کا شکریہ

(روزنامہ پاکستان، لاہور-۳۰ دسمبر ۲۰۰۴ء)

......حدود آرڈیننس کے بارے میں بھی یہی صورت حال ہوئی۔ اس سلسلے میں دباؤ تو خاصے عرصے سے ہے۔ اگرچہ عملی طور پر اس آرڈیننس کی کوئی مؤثر حیثیت نہیں ہے اور اس کے تحت کسی کو آج تک سزا نہیں ہوئی، مگر رسمی طور پر اس کی موجودگی بھی بہت سے لوگوں کو گوارہ نہیں ہے۔ خاص طور پر عالمی سیکولر لابیاں اور ادارے حدود شرعیہ کے نفاذ کو ختم کرانے کے لیے مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں گزشتہ دنوں دباؤ میں اچانک اضافہ ہو گیا اور پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ایسی فضا پیدا کر دی گئی کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک آدھ روز میں حدود آرڈیننس کا جھٹکا ہونے والا ہے۔ اس وقت چودھری شجاعت حسین خود عبوری وزیراعظم تھے، جنہوں نے کمال حکمت عملی سے کام لیا اور حدود آرڈیننس کو دوبارہ اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس بھجوا کر اس کے خلاف بڑھتے ہوئے دباؤ کے غبارے سے ہوا نکال دی۔......

حدود شرعیہ کے قوانین اور نیا حکومتی مسودہ قانون

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ فروری ۲۰۰۵ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۳ جنوری ۲۰۰۵ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سیکرٹری محترم ڈاکٹر امین نے انکشاف کیا ہے کہ وفاقی وزیر قانون جناب وصی ظفر صاحب نے گزشتہ دنوں دانشوروں کے ایک اجلاس میں حدود آرڈیننس کے حوالہ سے جس نئے مجوزہ مسودہ قانون کا تعارف کرایا ہے اس کے مطابق زنا کو ناقابلِ دست اندازئ پولیس جرم قرار دیا جا رہا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک کوئی شکایت لے کر نہ پہنچے کہ میرے ساتھ یہ ہوا ہے، مقدمہ نہیں بن سکے گا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ وزیر قانون نے اپنی تقریر میں تو نہیں کہا مگر اپنے ساتھ بیٹھے خواتین و حضرات سے کہہ رہے تھے کہ ہم نے ”حدود لاز“ کو ختم کر دیا ہے۔ مذکورہ رپورٹ میں اس نئے اور مجوزہ مسودہ قانون کی متعلقہ دفعات کا متن بھی شامل کیا گیا ہے جو حدود آرڈیننس کے حوالہ سے جلد نفاذ پذیر ہونے والا ہے۔

ملک میں رسمی طور پر نافذ شرعی حدود کے قوانین کے خلاف ایک عرصہ سے بین الاقوامی سطح پر اور اندرون ملک سیکولر لابیوں کی طرف سے یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ انہیں ختم کر دیا جائے اور ہمارے موجودہ حکمران بھی ان حدود کے خلاف اپنے جذبات کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہتے ہیں، لیکن معاملہ چونکہ شرعی قوانین کا ہے اور ان حدود کا تعلق براہ راست قرآن و سنت سے ہے اس لیے وہ حدود کے ان قوانین کو ختم کرنے کے اعلانیہ اظہار کی صورت میں عوام کے ردعمل کا خوف محسوس کرتے ہیں اور اسی وجہ سے حدود کو ظاہراً ختم کرنے کی بجائے انہیں عملاً غیر مؤثر بنانے کی یہ تکنیک اختیار کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون کو غیر مؤثر بنانے کے لیے اسی تکنیک پر عمل کیا گیا ہے کہ قانون کو ختم کرنے کی بجائے توہین رسالتؐ کے کسی بھی جرم کے وقوع پر مقدمہ کے اندراج کا طریق کار اس قدر پیچیدہ اور مشکل بنا دیا گیا ہے کہ کسی گستاخ رسولؐ کے خلاف عام حالات میں مقدمہ درج کرانا ممکن ہی نہیں رہا۔ اسی طرح حدود آرڈیننس کو ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر انہیں عملاً غیر مؤثر بنانے کی حکمت عملی اختیار کی جا رہی ہے جس کی رو سے وفاقی وزیر قانون کے

بقول "حدود لاز" عملاً ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی مغربی ملکوں کی طرح اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی زنا کی صرف وہی صورت جرم متصور ہوگی جس میں جبر کا پہلو موجود ہوگا اور جس میں ایک فریق شکایت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مقدمہ کے اندراج کی طرف پیشرفت کرے گا جبکہ "رضامندی کا زنا" مجوزہ قانون کے نفاذ کے بعد پاکستان میں سرے سے جرم ہی نہیں رہے گا۔

دوسری طرف روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ۵ جنوری ۲۰۰۵ء کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز نے حدود آرڈیننس کو غیر اسلامی قرار دے کر اس کے بارے میں قرار داد سینٹ میں جمع کرادی ہے، یہ قرار داد سینیٹر فرحت اللہ بابر نے سینٹ میں جمع کرائی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حدود آرڈیننس امتیازی قانون ہے جس کا حدود اللہ سے کوئی تعلق نہیں اور یہ بنیادی انسانی حقوق اور مروجہ قوانین کے خلاف ہے۔

گویا حدود آرڈیننس کے خاتمہ کی اس مہم میں پیپلز پارٹی بھی موجودہ حکومت کی اس مہم میں شریک ہوگئی ہے بلکہ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر حدود کے قوانین کو اللہ تعالیٰ کے حدود کے منافی اور غیر اسلامی بھی قرار دے دیا ہے۔ یہ صورتحال ملک بھر کے دینی حلقوں، جماعتوں اور مراکز کی سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے اور تمام مکاتبِ فکر کی دینی قیادت سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس مسئلہ کا نوٹس لے اور حدود قوانین کے بارے میں مختلف حلقوں کی طرف سے پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کے ازالہ اور نافذ شدہ چند شرعی قوانین کے تحفظ کے لیے مؤثر آواز اٹھانے کا اہتمام کرے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۰۵ء)

روزنامہ جنگ لندن ۲۲ جون ۲۰۰۵ء کی ایک خبر کے مطابق سینٹ آف پاکستان کے چیئرمین جناب محمد میاں سومرو نے اسلامی نظریاتی کونسل کی ۱۹۹۷ء کے بعد تیار ہونے والی رپورٹوں کو قومی اسمبلی اور سینٹ کی لائبریری میں رکھوانے کی ہدایت کی ہے تاکہ ممبران پارلیمنٹ اس کا مطالعہ کر سکیں۔ انہوں نے یہ رولنگ متحدہ مجلسِ عمل کے سینیٹر پروفیسر محمد ابراہیم خان کی جانب سے پیش کی جانے والی تحریک استحقاق نمٹاتے ہوئے دی۔ اس تحریک کے محرک نے تحریک استحقاق پیش کرتے ہوئے کہا کہ وفاقی وزیر مذہبی امور محمد اعجاز الحق نے وقفہ سوالات کے دوران ایک ضمنی سوال کے جواب میں سینٹ سے یہ کہا تھا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی ۲۰۰۳ء کی رپورٹیں ایوان میں پیش کر دی گئی ہیں، یہ بیان حقائق کے منافی ہے جس سے ایوان کا استحقاق مجروح ہوا ہے لہٰذا تحریک استحقاق کو کمیٹی کے سپرد کیا جائے۔ وفاقی وزیر برائے مذہبی امور محمد اعجاز الحق نے وضاحت کی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی ۱۹۹۶ء تک کی تمام عبوری اور حتمی رپورٹیں ۱۹۹۷ء میں پیش کر دی گئی تھیں، اس کے بعد رپورٹیں ایوان میں پیش کرنا آئینی تقاضہ نہیں ہے۔

چیئرمین سینٹ کی مذکورہ بالا رولنگ اور وفاقی وزیر مذہبی امور کی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے قیام سے اب تک اسلامی قوانین کی تدوین و تشریح اور ملکی قوانین کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جو مسلسل کام کیا ہے اور ہزاروں صفحات پر مشتمل وقیع علمی رپورٹیں تیار کی ہیں، ان کا مصرف صرف یہ ہے کہ انہیں قومی اسمبلی اور سینٹ کی لائبریری میں رکھوا دیا جائے تاکہ ارکان ان سے استفادہ کر سکیں۔ ہمارے خیال میں ایسی بات نہیں ہے اس لیے کہ ۱۹۷۳ء کے دستور میں ملک کے تمام قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی ضمانت دیتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل اس مقصد کے لیے قائم کی گئی کہ وہ اس سلسلہ میں ضروری رپورٹیں پیش کرے اور قانون کے مسودات تیار کرے تاکہ انہیں وفاقی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کی جائے اور ملک کے مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کی دستوری

ضمانت کی تکمیل کی طرف پیشرفت کی جائے۔

ہم چیئرمین سینٹ اور وفاقی وزیر مذہبی امور دونوں سے گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ اس سلسلہ میں دستورِ پاکستان کی منشااور اس کے صریح وعدوں کا ادراک حاصل کریں اور اسلامی نظریاتی کونسل کی مذکورہ رپورٹوں کو محض لائبریری کی زینت بنانے کی بجائے انہیں قانون سازی کے لیے وفاقی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کرنے کا اہتمام کریں تاکہ ملکی قوانین کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالنے کے دستوری وعدے کی تکمیل کی راہ ہموار ہو۔

اجتہاد کے حوالہ سے نوجوان نسل کے ساتھ ایک مذاکرہ کی روئیداد

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ یکم جولائی ۲۰۰۶ء)

اسلامی نظریاتی کونسل نے ۲۶ جون کو اسلام آباد میں اجتہاد کے حوالہ سے نوجوان نسل کے ساتھ ایک مذاکرہ کا اہتمام کیا جس کی صدارت جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے کی اور اس میں نوجوانوں کے سوالات کا جائزہ لینے اور ان پر رائے کا اظہار کرنے کے لیے ماہرین کے پینل میں راقم الحروف کو بھی شامل کیا گیا۔ جبکہ پینل میں محترم جاوید احمد غامدی اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر منظور احمد شامل تھے۔ نوجوانوں کی نمائندگی کے لیے اسلامی یونیورسٹی، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، نمل یونیورسٹی، فاطمہ جناح یونیورسٹی اور جامعہ فریدیہ اسلام آباد کے طلبہ وطالبات نے مذاکرہ میں حصہ لیا۔ کمپیئرنگ کے فرائض جناب خورشید احمد ندیم اور جناب سید احمد مسعود نے سرانجام دیے اور اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جناب ڈاکٹر خالد مسعود نے میزبان کے طور پر مقصد اور پروگرام پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مذاکرہ کا عنوان تھا ''نوجوان کیا سوچ رہے ہیں؟ جدید مسائل اور اجتہاد''۔ اور اس عنوان کی وضاحت مذاکرہ کے لیے جاری کیے جانے والے دعوت نامہ میں یوں کی گئی تھی:

> ''امتِ مسلمہ اس وقت بہت سے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی مسائل سے دوچار ہے جن کے بارے میں ہم اکثر دانشوروں کے خیالات سنتے رہتے ہیں۔ ان مسائل کے بارے میں نوجوان کیا سوچتے ہیں، اس پر گفتگو بہت کم سننے کو ملتی ہے۔ اس نشست میں دانشوروں اور نوجوان طبقہ کے درمیان اس بات پر مذاکرہ ہوگا کہ ان مسائل کے حل کے لیے کیا طریق کار اپنایا جائے۔ عالم اسلام میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد سے ممکن ہے، اور اس اجتہاد کو عملی جامہ پہنانے کی کیا شکل ہوگی؟ ماہرین کا ایک پینل جس میں ڈاکٹر منظور احمد، جناب جاوید احمد غامدی، مولانا زاہد

الراشدی اور جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال شامل ہیں ان سوالات پر اظہارِ خیال کریں گے۔ نوجوان جن میں یونیورسٹی اور مدارس کے طلبہ شامل ہیں اس موضوع پر اپنی آراء پیش کریں گے اور سوالات اٹھائیں گے، بعد میں ماہرین ان آراء کا تجزیہ کریں گے اور ان پر تبصرے پیش کریں گے۔"

مذاکرہ کے آغاز پر چند منٹ کا ایک ویڈیو پروگرام دکھایا گیا جس میں مختلف حضرات اور خواتین سے اسلام کے بارے میں ان کے جذبات و تاثرات مختصراً شامل کیے گیے ہیں۔ اس کے بعد نوجوانوں کو اس سوال پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی کہ ان کے خیال میں اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟ مختلف طلبہ اور طالبات نے اس پر اظہارِ خیال کیا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- اسلام کا امیج خراب کیا جارہا ہے اور اسلام کے بارے میں منفی تاثر پھیلایا جارہا ہے۔
- مسلمان اسلام سے دور ہوگئے ہیں اور جب تک وہ اسلام کے قریب نہیں آئیں گے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تاثرات درست نہیں ہوں گے۔
- مسلم نوجوانوں کو اسلام سے دور رکھنے کے لیے منظم اور شعوری کوشش کی جارہی ہے۔
- ہر شعبہ میں کرسیوں پر بونے لوگ بیٹھے ہیں، اہلِ علم و دانش کو دور رکھا جارہا ہے اور اجتہاد کی اہلیت رکھنے والوں کو ان کا صحیح مقام نہیں مل رہا۔
- مسائل کا حل صرف قرآن وسنت کو اپنانے میں ہے۔
- ہمارے پاس صحیح علم نہیں ہے اور ہم صرف سطحی اور عام قسم کی معلومات رکھتے ہیں۔
- ہم اخلاقیات سے دور ہٹ گئے ہیں۔
- ہم مسائل کو نظر انداز کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔
- اسلام کے بارے میں نوجوانوں کا تصور واضح نہیں ہے۔
- مسلم امہ کی ثقافت ختم ہوگئی ہے اور غیروں کی ثقافتیں ہم پر غالب ہوتی جارہی ہیں۔
- ہم صرف اپنے حوالہ سے سوچ رہے ہیں جبکہ ہمیں پوری انسانیت کے حوالہ سے سوچنا چاہیے۔
- مغرب بہت سے معاملات میں ہمارے اصولوں کو اپنائے ہوئے ہے اور ہم نے اپنے اصول چھوڑ رکھے ہیں۔ وغیر ذلک۔

مختلف نوجوانوں کی طرف سے اس قسم کے خیالات کے اظہار کے بعد ان میں سے چند سوالات کا انتخاب کر کے ماہرین کے پینل کو اظہارِ خیال کے لیے دعوت دی گئی۔ ماہرین کے پینل میں جناب جاوید احمد غامدی تشریف نہیں لائے تھے، جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال، جناب ڈاکٹر منظور احمد اور راقم الحروف نے اظہارِ خیال کیا۔ راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

سب سے پہلے تو میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کا رابطہ ملک کی رائے عامہ اور عمومی ماحول کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک اچھی پیشرفت ہے ورنہ اس سے قبل یہ صورتحال تھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل ملک کے قوانین کے بارے میں جو رائے قائم کرتی تھی اور ان کے حوالہ سے جو سفارشات پیش کرتی تھی ہماری ان رپوٹوں تک رسائی نہیں ہوتی تھی اور ان پر ''صرف سرکاری استعمال کے لیے'' کا لیبل چسپاں کر کے انہیں فریزر میں منجمد کر دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے اسلامی نظریاتی کونسل کی بند کھڑکیاں کھول کر اچھا قدم اٹھایا ہے، اس سے ہمیں کونسل کے کام سے استفادہ کا موقع ملے گا اور کونسل کی محنت کا بھی عمومی حلقوں میں تعارف ہو گا۔ میں اس بات پر بھی ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے نوجوان نسل کے نمائندوں کے ساتھ ہماری اس نشست کا اہتمام کیا ورنہ عام طور پر ان نوجوانوں کے ساتھ ہمیں ملی مسائل پر گفتگو اور ان کے خیالات معلوم کرنے کا کم ہی موقع ملتا ہے۔

اس کے بعد اس سوال پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام کے بارے میں ہمارے نوجوانوں کا تصور واضح نہیں ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے لیکن ہمیں اس کے اسباب کا جائزہ لینا ہو گا، میرے خیال میں اس کے تین اسباب ہیں:

۱. کسی چیز کے بارے میں تاثرات اور تصورات اس کے بارے میں معلومات کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں، اور یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے ہاں نوجوانوں کو عمومی سطح پر اسلام کے حوالہ سے صحیح معلومات مہیا کرنے کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نوجوانوں کو اسلام کے بارے میں جس قسم کی معلومات میسر آئیں گی ان کا اسلامی تصور بھی اسی دائرے میں تشکیل پائے گا۔

۲. عمومی ماحول بھی ذہنوں میں تصور کی تشکیل اور تاثر کے وجود میں آنے کا سبب بنتا ہے اور

اسلامی تعلیمات کے حوالہ سے ہمارا موجودہ معاشرتی ماحول ایسا نہیں ہے کہ اسے دیکھ کر اسلام کے بارے میں کوئی اچھا تاثر ذہنوں میں قائم ہو۔ ہماری نوجوان نسل جس ماحول میں پرورش پاتی ہے اور اپنے اردگرد تضادات اور منافقت کا جو تسلسل دیکھتی ہے اس سے وہی کنفیوژن جنم لیتا ہے جس کی ہم اپنے نوجوانوں کے حوالہ سے شکایت کر رہے ہیں۔

۳۔ نئی نسل کو اسلام کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کرنے، مناسب فکری ماحول مہیا کرنے اور ان کے لیے مثالی راہنمائی کا اہتمام کرنے میں مذہبی قیادت اور مذہب کی نمائندگی کرنے والوں کا کردار تسلی بخش نہیں ہے اور وہ ان ضروریات اور ان تقاضوں کو پورا نہیں کرتے جو اس کے لیے ناگزیر ہیں، اس لیے اگر اسلام کے بارے میں ہماری نئی نسل کا تصور واضح نہیں ہے اور وہ کنفیوژن کا شکار ہے تو میں اسے زیادہ قصوروار نہیں سمجھتا۔ ہمیں اس کے اسباب کا جائزہ لینا ہوگا اور انہیں دور کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنا ہوگی۔

دوسرا سوال جس پر کچھ گزارشات کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے اور ہمارے بعض نوجوانوں نے آج بھی کہا ہے کہ قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل کیے بغیر ہم اپنی مشکلات پر قابو نہیں پاسکتے اور اپنے مسائل حل نہیں کرسکتے۔ یہ بات درست ہے اور ہمارے عقائد کا حصہ ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ قرآن وسنت کے بعد اجتہاد بھی ہماری رہنمائی اور مسائل کے حل کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے اور اس کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے۔ اجتہاد کا عمل اسلام میں چودہ سو سال سے جاری ہے اور آج بھی اس کی اہمیت اور ضرورت مسلمہ ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک فرق ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جب تک مسلمان اقتدار میں رہے ہیں اجتہاد کا عمل اجتماعی طور پر رہا ہے جس کی ایک مثال خلافت عثمانیہ کے دور میں "مجلة الاحکام الاسلامیه" کی ترتیب اور اورنگزیب عالمگیرؒ کے دور میں "فتاویٰ ہندیه" کی تدوین کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ لیکن جب ہم اقتدار سے محروم ہوگئے اور کوئی ملی ادارہ موجود نہ رہا تو اجتہاد کے اس عمل نے انفرادی حیثیت اختیار کرلی۔ آج بھی اجتہاد ہو رہا ہے اور ہر علاقے میں ہو رہا ہے لیکن انفرادی سطح پر شخصیات یا اداروں کے ذریعہ ہو رہا ہے۔ اس عمل کو حکومتی تحفظ یا سرپرستی حاصل نہیں ہے اور اس میں اجتماعیت نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے اجتہاد کے عمل کا خلا محسوس ہو رہا ہے۔

آج اس شعبہ میں سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عالم اسلام کے مختلف حلقوں میں ہونے والے اجتہادی عمل میں ربط پیدا کیا جائے، باہمی مشاورت کی کوئی صورت نکالی جائے اور ایک دوسرے کے کام سے استفادہ کیا جائے۔ اس سے بھی اجتماعیت کی ایک صورت پیدا ہوگی اور ضروری تقاضوں کی تکمیل کی طرف پیشرفت ہوگی۔ مجھے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کے اس اعلان سے خوشی ہوئی ہے کہ کونسل "اجتہاد" کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ کے اجراء کا اہتمام کر رہی ہے جس کا مقصد عالم اسلام میں ہونے والی مختلف اور متنوع اجتہادی کوششوں سے پاکستان کے علمی حلقوں اور رائے عامہ کو باخبر کرنا اور اس سلسلہ کے اہم مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے۔

مذاکرہ کم و بیش تین گھنٹے جاری رہا اور اس میں متعدّد امور زیر بحث آئے مگر اس کی صرف ایک جھلک قارئین کی خدمت میں پیش کر سکا ہوں جس سے اسلامی نظریاتی کونسل کے آئندہ عزائم اور ایجنڈے کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''نوجوان کیا سوچ رہے ہیں؟ جدید مسائل اور اجتہاد''

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲ جولائی ۲۰۰۶ء)

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جسے اس غرض سے تشکیل دیا گیا تھا کہ دستورِ پاکستان میں ملک کے تمام مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی جو ضمانت دی گئی ہے اس کی تکمیل کے لیے حکومت پاکستان کی مشاورت کرے۔ اس کی عملی شکل یہ ہے کہ جدید قانون کے ممتاز ماہرین اور جید علماء کرام پر مشتمل ایک کونسل تشکیل دی جاتی ہے جو حکومت کے استفسار پر یا اپنے طور پر ملک میں رائج کسی بھی قانون کا اس حوالے سے جائزہ لیتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور اگر وہ اس قانون کو اسلامی تعلیمات کے منافی تصور کرتی ہے تو اس کی خامیوں کی نشاندہی کرتی ہے اور اس کے متبادل قانون کا مسودہ ایک سفارش کی صورت میں مرتب کر کے حکومت کے سپرد کر دیتی ہے۔ دستور کی رو سے حکومت اس بات کی پابند ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی یا صوبائی اسمبلی میں پیش کر کے اس کے مطابق قانون سازی کرے۔

۱۹۷۳ء کے دستور سے قبل یہ ادارہ ''اسلامی مشاورتی کونسل'' کے نام سے اور اس سے پہلے ''تعلیمات اسلامیہ بورڈ'' کے نام سے قائم رہا ہے، اور ملک کے بہت سے سرکردہ ماہرین قانون اور ممتاز علماء کرام مختلف اوقات میں اس میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے قیام کے بعد سے اب تک سینکڑوں قوانین کا جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی تجاویز اور سفارشات مرتب کر کے حکومت پاکستان کے سامنے پیش کی ہیں، جن کے حوالے سے دستور کا یہ تقاضہ، کہ انہیں متعلقہ اسمبلیوں میں پیش کر کے قانون سازی کے مرحلے سے گزارا جائے، ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔ بلکہ اب تک یہ صورتحال رہی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور اس کے مرتب کردہ مسودہ ہائے قوانین کی پیشانی پر ''صرف سرکاری استعمال کے لیے'' کا لیبل چسپاں کر کے اس کی اشاعت کو شجر ممنوعہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔

لیکن جب سے ڈاکٹر خالد مسعود اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین بنے ہیں یہ صورتحال قدرے تبدیل ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف جھنگ کے رہنے والے ہیں اور روزنامہ جنگ کراچی کے

ریزیڈنٹ ایڈیٹر محمود شام صاحب کے بھائی ہیں۔ ان کے والد بزرگوار کا تعلق جمعیۃ علماء اسلام سے تھا اور وہ ضلع کی سطح پر جمعیۃ کے متحرک حضرات میں شامل رہے ہیں۔ ڈاکٹر خالد مسعود کا شمار ممتاز اسلامی سکالروں میں ہوتا ہے، وہ قدیم و جدید دونوں قسم کے علوم پر دسترس رکھتے ہیں، مختلف علمی اداروں میں کام کرتے رہے ہیں اور متعدّد کتابوں کے مصنف ہیں۔ وہ ان ارباب دانش میں سے ہیں جو اسلامی تعلیمات واحکام کو جدید اسلوب میں ڈھالنے اور آج کی زبان میں دنیا کے سامنے پیش کرنے کی خواہش اور جذبہ رکھتے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں توسع بھی رکھتے ہیں، جس کے بارے میں دینی حلقے کسی حد تک تحفظات کا شکار ہیں، جبکہ جدت پسند طبقے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔

ڈاکٹر خالد مسعود جب سے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین بنے ہیں، کونسل کو عوامی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، نیز کونسل سے ہٹ کر علماء کرام اور دانشوروں کے وسیع حلقے کو اپنی مشاورت کے دائرے میں شامل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ ۲۶ جون کو انہوں نے اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ہال میں اسی مقصد کے لیے ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس کا عنوان تھا ''نوجوان کیا سوچ رہے ہیں؟ جدید مسائل اور اجتہاد''۔ اس میں انہوں نے یونیورسٹیوں اور مدارس کے طلبہ کو جمع کیا اور ایک پینل کے سامنے بٹھا دیا، جس میں جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال، اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر ڈاکٹر منظور احمد کے ساتھ راقم الحروف کو بھی شامل کر لیا۔ ڈاکٹر خالد مسعود اس مذاکرے کے میزبان تھے جبکہ جناب خورشید احمد ندیم اور سید احمد مسعود صاحب نے ماڈریٹر کی ذمہ داری سنبھال رکھی تھی اور بعض دیگر اساتذہ اور اصحاب دانش بھی شریک گفتگو تھے۔

اسلامی یونیورسٹی، قائداعظم یونیورسٹی، فاطمہ جناح یونیورسٹی، نمل یونیورسٹی اور جامعہ فریدیہ کے متعدّد طلبہ موجود تھے اور انہی کے سوالات مذاکرے کا موضوع گفتگو تھے۔ ان طلبہ اور طالبات نے اس سوال پر، کہ ان کے خیال میں آج مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے، جن خیالات کا اظہار کیا وہ عمومی نوعیت کے تھے، مثلاً یہ کہ

- اسلام کا تاثر اور تصویر آج کی دنیا کے سامنے مجروح کی جا رہی ہے،
- مسلمان اسلام سے دور ہو رہے ہیں،
- مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام سے دور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے،
- نوجوانوں کے سامنے اسلام کا تصور اور پیٹرن واضح نہیں اور وہ اس حوالے کنفیوژن کا شکار

ہیں،

- فرقہ واریت نے مسلمانوں کونقصان پہنچایا ہے،
- اور اسلام کی بات کرنے والے انسانیت کے حوالے سے وسیع تناظر میں بات نہیں کررہے۔

اس پر محترم ڈاکٹر منظور احمد صاحب نے قدرے مایوسی کا اظہار کیا، ان کا خیال تھا کہ یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات اس گفتگو میں ان جدید مسائل کی نشاندہی کریں گے جن پر اجتہاد کی ضرورت ہے، اور وہ اپنے تاثرات پیش کریں گے، لیکن انہوں نے وہی عام سی باتیں کی ہیں جو کم و بیش ہر مجلس میں ہوتی ہیں۔

میں نے گزارش کی کہ میرے خیال میں اس میں مایوسی کی بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ اس طرح کے نوجوانوں کے ساتھ ہماری پہلی نشست ہے اور پہلی ملاقات میں اسی طرح کی باتیں ہوتی ہیں، البتہ اگر ایسی نشستوں کا تسلسل جاری رہا اور ہمارے درمیان بے تکلفی کا ماحول پیدا ہوا تو یہ نوجوان اس سے اگلی باتیں بھی کریں گے، اور جن مسائل پر ان سے گفتگو کی توقع کی جارہی ہے وہ ان پر بھی ضرور اظہارِ خیال کریں گے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے حسب معمول وہی باتیں کیں جو وہ ایک عرصہ سے اس سلسلہ میں کرتے چلے آرہے ہیں۔ میں نے جب عرض کیا کہ اجتہاد کا عمل تو ہر دور میں جاری رہا ہے، البتہ فرق صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں یہ اجتہاد اجتماعی صورت میں ہوتا تھا جس کی ایک مثال عثمانی خلافت کی طرف سے مرتب ہونے والا ''مجلۃ الاحکام الاسلامیہ'' اور دوسری مثال مغل حکمران اورنگزیب عالمگیر کے دور میں سرکاری سطح پر تدوین پانے والا ''فتاوی ہندیہ'' ہے۔ مگر اقتدار سے مسلمانوں کی محرومی کے بعد اجتہاد کا یہی عمل انفرادی دائروں میں چلا گیا ہے۔ تو ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اس سے اختلاف کیا اور فتاوی عالمگیری اور المجلہ کو اجتہادی عمل تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے اس کے بعد اظہارِ خیال کا موقع نہ مل سکا ورنہ یہ ضرور عرض کرتا کہ دراصل آج اجتہاد کا ایک ہی مطلب اور مقصد سمجھ لیا گیا ہے کہ شرعی احکام کو کسی نہ کسی طرح تبدیل کر دیا جائے۔ جبکہ صرف ماحول اور تعامل کی تبدیلی کے ساتھ شرعی قوانین کے بنیادی ڈھانچے کو قائم رکھتے ہوئے ان کی نئی تعبیر و تشریح اور نئے حالات کے ساتھ ان کی ایڈجسٹمنٹ کا عمل بھی اجتہاد ہی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے، جس کی عملی مثال کے طور پر میں نے فتاوی عالمگیری اور مجلۃ الاحکام کا حوالہ دیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس موقف کو دہرایا کہ آج کے دور میں اجتہاد صرف پارلیمنٹ کر سکتی ہے، لیکن اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ موجودہ پارلیمنٹ اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتی، بلکہ اب تک پاکستان میں کوئی ایسی پارلیمنٹ وجود میں نہیں آئی جو اجتہاد کی صلاحیت سے بہرہ ور ہو۔ ان کا خیال ہے کہ اجتہاد کے لیے ایسے وکلاء کی ضرورت ہے جو اسلامی تعلیمات سے بھی ضرورت کے مطابق روشناس ہوں۔ انہیں شکوہ ہے کہ ایل ایل بی کے نصاب میں اسلامی قانون کی ضروری تعلیم و مہارت کا پرچہ شامل نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے وکلاء بھی اجتہاد کی ذمہ داری کو پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ اس بات پر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کا اصرار قائم ہے کہ علماء کرام بہر حال اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

میں نے گزارش کی کہ آج کے دور میں اجتہاد کی جو ضروریات ہیں، ان میں سے کچھ ایسی ہیں جنہیں علماء کرام پورا نہیں کرتے، اور کچھ تقاضے ایسے ہیں جنہیں جدید قانون کے ماہرین پورا نہیں کر پاتے، اس کا یہ عمل دونوں کو مل کر کرنا ہوگا۔ چنانچہ میرے خیال میں اسلامی نظریاتی کونسل میں رہنما اصول کو اپنایا گیا ہے کہ جدید قانون کے ماہرین اور علماء کرام مل بیٹھ کر اسلامی قوانین کی تدوین نو کریں اور جدید پیش آمدہ مسائل کا جائزہ لیں، یہی اس مسئلہ کا صحیح حل ہے اور ہم سب کو اس عمل کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے بتایا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے ''اجتہاد'' کے نام سے سہ ماہی مجلہ کا اجرا کیا جا رہا ہے، جس کا مقصد عالم اسلام کے مختلف اطراف میں اجتہاد کے حوالے سے ہونے والی علمی کاوشوں سے پاکستان کے دینی و علمی حلقوں کو متعارف کرانا، اور اس طرح باہمی ربط و مشاورت کا ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید مسائل کے بارے میں اجتہادی ضروریات سے انہیں آگاہ کرنا ہے۔

اس سیمینار میں بہت سے دیگر امور بھی زیر بحث آئے جن کا احاطہ بلکہ تذکرہ اس کالم میں بہت مشکل ہے۔ البتہ یہ اطمینان ہوا کہ دینی، علمی و ملی مسائل پر باہمی تبادلۂ خیالات اور مکالمہ کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے، اور اس کے ساتھ ہی اسلامی نظریاتی کونسل جیسے اداروں کی ذمہ داریوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب ایک عملی آدمی ہیں اور میرا خیال ہے کہ وہ اس سمت میں پیشرفت کے جذبہ، حوصلہ اور صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، مگر ان کے لیے آزمائش کا یہ مرحلہ بہت کٹھن ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سربراہی کے منصب پر خود کو کس کے نمائندہ کے طور پر

متعارف کراتے ہیں۔ حکومتی حلقوں، جدت پسند طبقوں اور روایتی دینی وعلمی حلقوں کی نظریں ان پر لگی ہوئی ہیں۔ میرے خیال میں اگر وہ خود کو ان میں سے کسی کھاتے میں ڈالنے کی بجائے ان تینوں کے درمیان اعتماد کا توازن قائم رکھ سکیں تو یہ ان کی بڑی کامیابی ہوگی، اور اسلامی نظریاتی کونسل کے لیے بھی یہ بات یقیناً نیک فال ثابت ہوگی۔

قائداعظمؒ کا تصورِ پاکستان

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۱۹ جولائی ۲۰۰۶ء)

......گزشتہ دنوں جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک سیمینار کے موقع پر ایک نوجوان نے سوال کیا کہ قائداعظمؒ کا تصور اسلام کیا تھا؟ میں بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ قائداعظمؒ یہ سمجھتے تھے کہ (۱) قانون کی حکمرانی (۲) انسانی حقوق اور (۳) جمہوریت اسلام سے متصادم نہیں ہیں اور یہی ان کا تصور اسلام تھا۔

میرے خیال میں یہ کہہ کر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے قائداعظمؒ کے تصور اسلام کی صحیح ترجمانی کی ہے، کیونکہ ان کے بیانات، تقاریر، خطوط اور پیغامات سے یہی بات جھلکتی ہے اور اسلام کے بارے میں قائداعظمؒ کی یہ اپروچ خلافِ واقعہ بھی نہیں:

- قانون حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ فائنل اتھارٹی فرد کی بجائے قانون ہو، اور ملک کے تمام ادارے اور افراد کسی فرد کی بجائے قانون کے تابع ہوں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلام نے ہی فرد اور شخصیت کی بجائے دلیل اور قانون کی حکمرانی کا تصور پیش کیا اور خلفائے راشدینؓ تک کو قانون کا پابند بنا کر فرد کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔
- انسانی حقوق کا تفصیل کے ساتھ تصور بھی سب سے پہلے اسلام نے پیش کیا، اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کے عنوان سے حقوق کا ایک متوازن نظام دنیا کو دیا جس میں تمام ضروری سیاسی، معاشرتی، معاشی اور شہری حقوق شامل ہیں۔
- اسی طرح جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفۂ اول کے انتخاب میں عوام کی رائے کو بنیاد بنا کر اسلام نے دنیا کو بتا دیا کہ اس کے نزدیک آئیڈیل نظام وہی ہے جس میں حکومت کی تشکیل عوام کی مرضی سے ہو۔ اور یہ تصور پیش کرنے اور اس پر عمل کرنے میں اسلام کو مغرب پر ایک ہزار سال کی سبقت حاصل ہے۔

اس لیے اگر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے بقول قائداعظمؒ کے تصور اسلام کی یہی تین بنیادیں ہیں تو اس میں کوئی بات نئی نہیں بلکہ یہ اصل میں قدیم اسلامی روایات اور تعلیمات ہی کی ترجمانی ہے۔......

حدود آرڈیننس کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رپورٹ پر چند گزارشات

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۷ اگست ۲۰۰۶ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے حدود آرڈیننس کے بارے میں کونسل کی نئی عبوری رپورٹ اخبارات کے لیے جاری کر دی ہے جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ حدود آرڈیننس میں ترامیم سے مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ اس پر تفصیلی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

اس رپورٹ کو ہم نے ''نئی'' اس لیے کہا ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ سے قبل بھی اسلامی نظریاتی کونسل نے اس پر غور کیا تھا اور ایک تفصیلی رپورٹ دی تھی جسے اس آرڈیننس کی تدوین میں بنیاد بنایا گیا تھا، لیکن اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل نو کے بعد اس رپورٹ پر قناعت کی بجائے ایک نئی رپورٹ پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور اس حوالہ سے عبوری رپورٹ، کونسل کے نئے چیئرمین نے گزشتہ روز جاری کر دی ہے۔ اخبارات میں اس کے بارے میں ڈاکٹر خالد مسعود کے حوالے سے جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں، ان کے مطابق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

- موجودہ نافذ شدہ حدود آرڈیننس کس طرح بھی قرآن و سنت کے مطابق نہیں ہے۔
- چند ترامیم سے بات نہیں بنے گی، بلکہ اس پر تفصیلی نظر ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اسے نہ صرف قرآن و سنت کے مطابق بنایا جا سکے بلکہ جدید عدالتی نظام میں بھی اسے مؤثر بنایا جا سکے۔
- حدود آرڈیننس میں حدود کی تعریف و تشریح ''فقہی تعریف'' کے تحت کی گئی ہے جبکہ ان کی قرآن و سنت کی روشنی میں صحیح طور پر تشریح کرنا ضروری ہے۔
- حدود آرڈیننس کے نفاذ سے جرائم میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہوا ہے۔
- اگر اس آرڈیننس میں عبوری ترامیم لائی جاتی ہیں تو اس سے قرآن و سنت کی روح پر پوری طرح عملدرآمد ممکن نہیں ہوگا۔

ہم ان میں سے ایک دو نکات پر کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے حدود آرڈیننس کو قرآن و سنت کے منافی قرار دینے کی بات ہے، اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ چونکہ حدود آرڈیننس میں حدود کی تعریف اور قوانین کی ترتیب میں فقہی تشریحات و تعبیرات کو بنیاد بنایا گیا ہے، اس لیے وہ قرآن و سنت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ گویا قرآن و سنت اور فقہ اسلامی کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا گیا ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل نے فقہ اسلامی اور فقہائے اسلام کی تعبیرات و تشریحات کو قرآن و سنت سے الگ اور منافی قرار دے دیا ہے۔ جو ایک بڑا مغالطہ اور بڑی گمراہی کی بات ہے، اس لیے کہ فقہ اسلامی قرآن و سنت کے مقابل کوئی درآمدی سسٹم نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت ہی سے مستنبط احکام و قوانین کا نام ہے جو مختلف ادوار میں فقہائے اسلام نے مستنبط کیے ہیں، اور انہیں ہر دور میں قرآن و سنت کی قانونی تشریح کا درجہ حاصل رہا ہے۔

مگر یہ ہمارے جدید دانشوروں کی ستم ظریفی ہے کہ وہ برطانوی دور کے نوآبادیاتی عدالتی نظام و قوانین کو تو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے ہیں اور اسے قرآن و سنت کے نفاذ کی بنیاد بنانے کے خواہش مند ہیں جو خالصتاً ایک درآمدی سسٹم ہے جسے برطانوی استعمار نے اپنے نوآبادیاتی مقاصد کے لیے سمندر پار سے لا کر ہمارے ہاں نافذ کیا تھا، اور جو ابھی تک ہمارے عدالتی نظام میں نوآبادیاتی ماحول اور مزاج کو باقی رکھے ہوئے ہے، لیکن خود قرآن و سنت سے مستنبط کیے جانے والے قوانین و احکام کو "فقہی تعبیر" قرار دے کر انہیں قرآن و سنت کے منافی بلکہ ان سے متصادم قرار دینے کے درپے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ پرانی فقہی تعبیرات و تشریحات کو مسترد کر کے وہ اپنی طرف سے قرآن و سنت کی روشنی میں جو نئی تعریفات اور تشریحات طے کریں گے، ان کا غلط اور صحیح ہونا اپنی جگہ پر، لیکن وہ بھی "فقہی تعبیرات" ہی ہوں گی، کیونکہ قرآن کریم اور سنت میں کسی جگہ بھی حدود شرعیہ کی ایسی قانونی تعریف متعیّن نہیں کی گئی ہے جس کی ڈاکٹر خالد مسعود کو تلاش ہے۔ یہ تعریف جو بھی طے کرے گا، قرآن و سنت سے استنباط کر کے کرے گا اور وہ فقہی تعریف و تعبیر ہی کہلائے گا، البتہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب قدیم فقہاء کی تشریحات و استنباطات کی نفی کر کے اور حدود کی نئی قانونی تعریف طے کر کے اسے حدود آرڈیننس کی بنیاد بنانے کا مطالبہ کریں گے تو گویا وہ عملاً اس بات کا تقاضا کر رہے ہوں گے کہ حدود قوانین کی تعبیر و تشریح میں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر فقہائے اسلام کی تعبیرات و تشریحات کو بنیاد بنانے کی بجائے امام جاوید اقبال، امام خالد مسعود اور امام

جاوید غامدی کی تعبیرات وتشریحات کو معیار قرار دیا جائے۔ لیکن یہ بات کہنے کا حوصلہ اور اخلاقی جرات نہ رکھتے ہوئے وہ اسے اس گمراہ کن تعبیر کی صورت میں پیش کر رہے ہیں کہ چونکہ حدود آرڈیننس میں تعریفات وتعبیرات کے حوالے سے فقہ کو بنیاد بنایا گیا ہے، اس لیے وہ قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بات قرآن وسنت یا فقہی تعبیرات کی نہیں ہے بلکہ فقہ اسلامی کے چودہ سو سالہ علمی ذخیرے کی نفی کر کے اس کے مقابل نئی فقہ تشکیل دینے کی ہے، کیونکہ جن احکام و قوانین کو اسلامی نظریاتی کونسل میں بیٹھ کر ڈاکٹر خالد مسعود صاحب، جاوید احمد غامدی صاحب اور ان کے رفقاء طے کریں گے، وہ بھی فقہ ہی کہلائے گی، اور اسے صرف اس لیے قرآن وسنت کا درجہ حاصل نہیں ہو جائے گا کہ وہ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب اور ان کے رفقاء کی سوچ کا نتیجہ ہے۔ اس پس منظر میں ہم ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے یہ گزارش کریں گے کہ وہ اپنی تعبیرات اور سوچ کو قرآن وسنت کا درجہ دینے کی بجائے اخلاقی جرات سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو اصل بات بتائیں کہ وہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے فقہاء کی فقہوں کی نفی کرتے ہوئے ان کے مقابل ایک نئی فقہ مرتب کرنا چاہ رہے ہیں، اس لیے امت کو چاہیے کہ وہ چودہ سو سالہ فقہی ذخیرے سے دستبردار ہو کر ان نئے اماموں اور ان کی جدید فقہ کے سامنے سرنڈر ہو جائے۔

ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے اس عبوری رپورٹ میں یہ بھی کہا ہے کہ حدود آرڈیننس کے نافذ ہونے کے بعد ملک میں حدود سے متعلقہ جرائم میں کمی نہیں ہوئی بلکہ اضافہ ہوا ہے اور انہوں نے اس سلسلے میں اعداد وشمار بھی پیش کیے ہیں۔ ہم ڈاکٹر صاحب کی اس بات کی تائید کرتے ہیں اور ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد جرائم میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب محترم سے ہمارا سوال یہ ہے کہ حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد ان پر عملدرآمد کب ہوا ہے؟ اور کیا موجودہ عدالتی سسٹم میں ان حدود یا کسی بھی شرعی قانون پر عملدرآمد ممکن ہے؟ ڈاکٹر صاحب اچھی طرح جانتے ہیں کہ معاشرے میں حدود شرعیہ کے نفاذ کے ثمر آور نہ ہونے کی اصل وجہ حدود کے قوانین نہیں بلکہ عدالتی سسٹم ہے، کیونکہ حدود آرڈیننس کو نوآبادیاتی عدالتی سسٹم کی پیچیدگیوں میں اس طرح الجھا دیا گیا ہے کہ اس کی کسی ایک دفعہ پر بھی عمل ممکن نہیں رہا، ورنہ یہی حدود شرعیہ سعودی عرب میں نافذ ہیں اور ان کے ذریعے سے وہاں جرائم کنٹرول میں ہیں۔ ہماری ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے

گزارش ہے کہ جس طرح انہوں نے حدود آرڈیننس کے نفاذ کے بعد جرائم میں اضافہ کے حوالہ سے پاکستان کی صورتحال پر اعداد و شمار پیش کیے ہیں، اسی طرح تقابلی طور پر سعودی عرب میں حدود شرعیہ کے نفاذ سے قبل جرائم کی صورتحال اور ان کے نفاذ کے بعد سے اب تک جرائم کی شرح کے بارے میں بھی اعداد و شمار کی ایک رپورٹ مرتب کرائیں تاکہ پاکستان کے عوام اس فرق کی وجہ جان سکیں کہ شرعی حدود جب سعودی عرب میں نافذ ہوتی ہیں تو صورتحال تبدیل ہو جاتی ہے اور یہ قوانین جرائم میں کمی اور کنٹرول کا ذریعہ بنتے ہیں، لیکن وہی حدود پاکستان میں نافذ ہوتی ہیں تو جرائم میں کمی کے بجائے اضافہ ہو جاتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ پھر حدود شرعیہ کے لیے قوانین ہمارے پڑوسی افغانستان میں طالبان کی حکومت کے دور میں نافذ ہوئے تھے تو وہ بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق جرائم میں کمی اور کنٹرول کا باعث بنے تھے۔ اگر اس کے بارے میں ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کو براہ راست معلومات نہ ہوں تو محترم ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے دریافت کر لیں جو طالبان کے دور میں خود افغانستان گئے تھے اور واپسی پر انہوں نے قومی پریس کے ذریعے سے اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ طالبان کی حکومت میں شرعی قوانین پر عمل ہو رہا ہے اور ان کے ثمرات و نتائج بھی سامنے آرہے ہیں۔

حدود آرڈیننس کو موجودہ عالمی عدالتی نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بات بھی خوب ہے۔ اگر پاکستان کو آج کے عالمی عدالتی نظام اور قوانین کے ساتھ ہی ہم آہنگ ہونا تھا تو پھر اس کے لیے الگ ملک کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور یہ کام متحدہ ہندوستان میں زیادہ بہتر طور پر ہو سکتا تھا، مگر تحریکِ پاکستان کے قائدین بالخصوص قائداعظم محمد علی جناحؒ نے واضح طور پر کہا تھا کہ پاکستان اسلامی قوانین کے نفاذ اور اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے بنایا جا رہا ہے، اور اگر اس مقصد کو الگ کر دیا جائے تو ایک الگ ملک کے طور پر پاکستان کے الگ وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ پھر حدود آرڈیننس ہی کے پس منظر میں ہم ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے سوال کرنا چاہیں گے کہ مروجہ عالمی عدالتی نظام اور قوانین تو

۱. رضامندی کے زنا کو سرے سے جرم ہی تصور نہیں کرتے،
۲. ہم جنس پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں، اور
۳. شادی کے بغیر مرد اور عورت کے اکٹھے رہنے اور جنسی تعلقات قائم کرنے کو قانونی تحفظ فراہم کرتے ہیں،

کیاڈاکٹر خالد مسعود صاحب اور ان کے رفقاء اسی عالمی عدالتی نظام اور بین الاقوامی قوانین کے لیے قرآن وسنت کی چودہ سوسالہ فقہی تعبیرات کو کند چھری سے ذبح کر دینا چاہتے ہیں؟

تحفظِ حقوقِ نسواں بل اور خصوصی علماء کمیٹی

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۴ ستمبر ۲۰۰۶ء)

میرے لیے یہ خبر افسوس اور رنج کا باعث بنی ہے کہ محترم جاوید احمد غامدی صاحب نے اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت سے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا ہے۔ غامدی صاحب علوم عربیہ کے ممتاز ماہرین میں شمار ہوتے ہیں اور دینی لٹریچر پر بھی ان کی گہری اور وسیع نظر ہے، اسلامی نظریاتی کونسل میں ایسے فاضلین کی موجودگی بہت سے معاملات میں راہنمائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کی فقہی مجلس میں، جہاں بحث و مباحثہ اور مشترکہ فکری کاوش کے ساتھ مسائل کا فقہی حل تلاش کیا جاتا تھا، مختلف اور متنوع علوم وفنون کے ماہرین شریک ہوتے تھے اور ان کی موجودگی اس بات کی ضمانت سمجھی جاتی تھی کہ مسئلہ کے تمام علمی اور فنی پہلوؤں پر غور و خوض کے بعد اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔ محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب نے ایک مستقل کتابچے میں امام ابوحنیفہؒ کی اس فقہی مجلس کا تعارف کرایا ہے، جو آج کے دور میں اجتماعی اجتہاد کو آگے بڑھانے کے لیے خاصی راہنمائی مہیا کرتا ہے۔ البتہ محترم جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنے احتجاجی استعفیٰ کی جو وجوہ بیان کی ہیں ان کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے اپنے استعفیٰ کی دو وجوہ بیان فرمائی ہیں:

۱. ایک یہ کہ ”تحفظ حقوق نسواں بل“ پر مشاورت کے لیے حکومت نے علماء کرام کی جو کمیٹی بنائی تھی، غامدی صاحب کے نزدیک وہ اسلامی نظریاتی کونسل کو بائی پاس کرنے کی ایک صورت تھی، جس سے ان کے خیال میں ایک آئینی ادارے کا وقار مجروح ہوا ہے، اور وہ اس کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت برقرار رکھنے میں کوئی افادیت نہیں سمجھتے۔

۲. دوسری وجہ انہوں نے یہ بیان کی ہے کہ صدر جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے نافذ کردہ حدود آرڈیننس کے بارے میں وہ یعنی غامدی صاحب گزشتہ پچیس تیس سال سے جو کچھ فرماتے آ رہے ہیں اس کو قبول نہیں کیا جا رہا۔ اس ضمن میں انہوں نے متعدّد مسائل کی نشاندہی بھی کی ہے جس میں ان کی رائے باقی علماء کرام سے مختلف ہے اور انہیں شکایت ہے کہ ان کی رائے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے، میں چونکہ اس ''خصوصی علماء کمیٹی'' کا ایک ممبر ہوں اس لیے اس وضاحت کا حق رکھتا ہوں کہ اسے خواہ مخواہ مسئلہ بنا لیا گیا ہے۔ اس سے قبل ایم کیو ایم اور بعض دیگر حلقوں نے علماء کی خصوصی کمیٹی کو قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے متوازی قرار دے کر یہ موقف اختیار کیا تھا کہ اس کمیٹی کے ذریعے قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کو بائی پاس کیا گیا ہے، جو جمہوری اصولوں کے منافی ہے۔ خود ہمارے ساتھ مذاکرات کے دوران ایم کیو ایم کے رہنماؤں جناب فاروق ستار اور ان کے دیگر رفقاء نے یہی بات کی تو ہم نے ان سے عرض کیا کہ علماء کی یہ کمیٹی قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کی متبادل یا اس کے متوازی نہیں ہے، اور نہ ہی اس کے اختیارات اور پراسیس کی نفی کر رہی ہے۔ بلکہ اس کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل پر باہمی تنازعہ اور کشمکش کے حوالے سے پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور متحدہ مجلسِ عمل کے سیکرٹری جنرل مولانا فضل الرحمٰن کے درمیان ملاقات ہوئی تو مولانا فضل الرحمٰن نے چودھری صاحب سے کہا کہ تحفظ حقوق نسواں بل کی بعض شقوں کے بارے میں متحدہ مجلسِ عمل کے علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ وہ قرآن و سنت کے صریح احکام سے متصادم ہے، اس لیے ان کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر چودھری شجاعت حسین صاحب اور حکومتی حلقے مناسب سمجھیں تو ایسے علماء سے بھی رائے لے لیں جن کے بارے میں انہیں اطمینان ہو کہ وہ اس مسئلہ سے واقفیت رکھتے ہیں اور موجودہ سیاسی کشمکش میں فریق نہیں ہیں، تاکہ ان کو اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ متحدہ مجلسِ عمل کے علماء کرام تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سیاسی مخاصمت کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ علمی اور دینی حوالے سے ہے۔

اس پر چودھری شجاعت حسین صاحب نے فیصلہ کیا کہ ایسا کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے چند علماء کرام کے نام اس مقصد کے لیے تجویز کیے جن سے مولانا فضل الرحمٰن نے بھی اتفاق کر لیا۔ اس طرح اس غرض کے لیے (۱) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (۲) مولانا حسن جان (۳) مولانا مفتی منیب الرحمٰن (۴) مولانا مفتی غلام الرحمٰن (۵) مولانا قاری محمد حنیف جالندھری (۶) مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی (۷) اور راقم الحروف ابو عمار زاہد الراشدی پر مشتمل خصوصی علماء کمیٹی وجود میں آئی۔ جو صرف اس مقصد کے لیے قائم کی گئی کہ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ چودھری شجاعت حسین اور ان کے رفقاء اس بات کی تسلی کر لیں کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں متحدہ مجلسِ عمل کے علماء

کرام کی طرف سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی علمی اور دینی حیثیت کیا ہے؟

چنانچہ اس کمیٹی کے سامنے چودھری صاحب نے یہی بات کی کہ آپ حضرات کو صرف اس لیے زحمت دی گئی ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں جو یہ کہا جا رہا ہے کہ اس میں قرآن و سنت کے منافی باتیں بھی شامل ہیں، اس کے بارے میں آپ حضرات رائے دیں، اور اگر آپ کے نزدیک بھی اس بل میں قرآن و سنت سے متصادم کوئی بات ہو تو اس کی نشاندہی کر کے ہمیں سمجھا دیں، کیونکہ یہ بات ہم نے طے کر رکھی ہے اور یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ قرآن و سنت کے منافی کوئی بات ہم قطعاً نہیں کریں گے۔

سچی بات یہ ہے کہ چودھری شجاعت حسین صاحب اور ان کے ساتھ چودھری پرویز الٰہی صاحب اور ان کے دیگر رفقاء کے اس جذبہ کی قدر کرتے ہوئے ہم نے یہ ذمہ داری قبول کی اور باہمی مشاورت میں طے کیا کہ ہم اپنے غور و خوض اور رائے کو صرف اسی اصول تک محدود رکھیں گے، باقی تفصیلات میں جب تک ہمیں دوبارہ نہ کہا جائے، نہیں جائیں گے۔ اور پوری دیانتداری اور شرح صدر کے ساتھ اپنی رائے دیں گے۔

اس سلسلہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ ۶ ستمبر کو عشاء کے بعد جب قومی اسمبلی کے کمیٹی روم میں پہلا اجلاس ہوا تو چودھری شجاعت حسین صاحب وفاقی وزراء کی ایک ٹیم کے ساتھ موجود تھے، ایم ایم اے کے علماء کرام بھی شریک تھے، کمیٹی کے بیشتر ارکان بھی حاضر تھے۔ اس کے علاوہ ہمارے دو اور فاضل دوست محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب اور ڈاکٹر محمد فاروق صاحب آف مردان (جو غامدی صاحب محترم کے رفیق خاص ہیں) بھی تشریف فرما تھے، جنہیں خاص اس مقصد کے لیے زحمت دی گئی تھی کہ علماء کرام اگر اس بل کی بعض شقوں پر بات کریں تو موقع پر ہی ان کے ساتھ مباحثہ بھی ہو جائے۔ ہمارے یہ دونوں محترم دوست اس مباحثے کے لیے باقاعدہ تیاری کر کے آئے تھے، حتیٰ کہ محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب تو روایتی مناظرین کی طرح کتابوں کی گٹھڑی بھی ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے بعض مسائل پر بحث شروع کرنے کی کوشش بھی کی، مگر ہم اس وقت اس قسم کے مباحثے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک تو اس لیے کہ تحفظ حقوق نسواں بل اور اس کے بارے میں قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ہمیں اسی مجلس میں دی گئی تھی جو ہم نے اس سے قبل نہیں دیکھی تھی، اور ہم اسے پوری طرح پڑھے بغیر کوئی رائے نہیں دے سکتے تھے۔ دوسرا اس لیے کہ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مجلس میں بلکہ

اس وقت ملک میں ہی موجود نہیں تھے، اور چونکہ وہ اپنے علم اور تجربہ دونوں حوالے سے اس مسئلہ سے زیادہ گہری واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے ہم ان کی غیر موجودگی میں کوئی رائے قائم نہیں کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ ہم نے دوٹوک کہہ دیا کہ ہم بل اور سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ کو پڑھے بغیر کوئی رائے نہیں دیں گے، اور چونکہ مولانا محمد تقی عثمانی ۹ ستمبر کو بیرون ملک سے واپس آرہے ہیں، اس لیے ہم اس بل پر بات کرنے کے لیے ۱۱ ستمبر پیر کو بیٹھ سکیں گے، اس وقت تک ہمیں مہلت دی جائے، ہم رائے بھی دیں گے اور اگر کسی علمی مباحثہ کی نوبت آئی تو اس میں بھی شریک ہوں گے، کیونکہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ باہمی افہام وتفہیم اور مکالمہ و مباحثہ کے ذریعے اتفاق رائے کی کوئی صورت اگر ہو سکتی ہو تو پیدا کر لی جائے۔ مگر اس وقت محترم ڈاکٹر محمد فاروق صاحب نے ایک ایسی بات فرما دی جو ہمارے لیے تو حیرت کا باعث بنی ہی، مجلس کے دوسرے شرکاء بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد تھا کہ اس مسئلہ پر اتفاق رائے نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ قرآن وسنت کی تعبیرات وتشریحات اپنی اپنی ہیں اور ان الگ الگ تعبیرات وتشریحات کے ہوتے ہوئے متفقہ رائے قائم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مجلس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر برخواست ہوگئی۔

لیکن جب ہم دوبارہ اس مقصد کے لیے ۱۰ ستمبر کو اسلام آباد کے پنجاب ہاؤس میں مل بیٹھے تو ہمارے سامنے محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب اور ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب تشریف فرما نہیں تھے، بلکہ وزارت قانون کے اعلیٰ افسران ہمارے ساتھ گفتگو کے لیے موجود تھے۔ جبکہ چودھری شجاعت حسین صاحب، چودھری پرویز الٰہی صاحب، اور اس مسئلہ پر قائم ہونے والی قومی اسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے سربراہ سردار نصر اللہ دریشک بعض دیگر رفقاء کے ہمراہ شریک محفل تھے۔ ہم اس تبدیلی کی وجہ دریافت نہیں کر سکے، ویسے بھی ہمیں رائے دینے کے لیے بلایا گیا تھا، مباحثہ و مناظرہ ہمارے ایجنڈا میں شامل نہیں تھا۔ البتہ میرا خیال ہے کہ پہلی نشست میں ڈاکٹر محمد فاروق صاحب کا مذکورہ ارشاد گرامی اس تبدیلی کا باعث بنا اور ہم ان دوستوں کے ساتھ اس مقصد کے لیے دوبارہ مل بیٹھنے کے موقع سے محروم ہوگئے، البتہ ان کی نمائندگی مسلسل ہوتی رہی۔ چنانچہ وزارت قانون کے افسران کے ساتھ طویل گفتگو اور مباحثہ کے دوران ان کی طرف سے جو کچھ کہا جاتا رہا وہ محترم ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب اور ڈاکٹر محمد فاروق خان صاحب، یا بالفاظ دیگر محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے نقطۂ نظر کی ترجمانی پر

ہی مشتمل تھا۔

مثال کے طور پر ایک مسئلہ یہ تھا کہ تحفظ حقوق نسواں بل میں حد شرعی کے نفاذ کے حوالے سے زنا بالجبر اور زنا بالرضا کے حکم میں فرق کیا گیا ہے، اور زنا بالجبر کو حد شرعی کے دائرے سے نکال کر تعزیرات میں شامل کیا گیا ہے، جو ہمارے نزدیک قرآن و سنت کے اصولوں سے متصادم ہے۔ اس لیے کہ حد شرعی کے نفاذ کے حوالے سے قرآن و سنت نے جبری زنا اور رضامندی کے زنا میں کوئی فرق نہیں کیا، بلکہ احادیث میں یہ روایت موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح رضامندی کے زنا پر حد شرعی جاری کی ہے، اسی طرح جبری زنا کے ایک کیس میں بھی مجبور کی جانے والی خاتون کو بری کر کے جبر کرنے والے مرد پر شرعی حد جاری کی تھی۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عملی فیصلے کے بعد اس سلسلہ میں مزید کسی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

جبکہ وزارت قانون کے ایک اعلیٰ افسر کا اصرار تھا کہ رضامندی کے زنا اور جبری زنا میں حد کے نفاذ کے سلسلہ میں فرق موجود ہے۔ ہم نے حوالہ پوچھا تو فرمایا کہ حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے ''تدبر قرآن'' میں یہ فرق کیا ہے۔ اس پر میں نے ہی ان سے دریافت کیا کہ کیا ان سے پہلے بھی امت میں کسی نے یہ کہا ہے؟ فرمانے لگے کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مولانا فراہیؒ، مولانا اصلاحیؒ اور محترم غامدی صاحب تو ایک ہی ہیں، میں ان سے پہلے امت کے فقہی مذاہب کی بات کر رہا کہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، ظاہری، بلکہ جعفری اور زیدی میں سے کسی فقہی مکتبِ فکر نے یہ قبول کیا ہو تو غور کیا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ خاموش رہے تو میں نے عرض کیا کہ جن فقہی مذاہب پر امتِ مسلمہ کا تیرہ سو سال سے عمل چلا آ رہا ہے، مولانا فراہیؒ یا مولانا اصلاحیؒ کے ایک تفرد پر یہ سب کچھ قربان نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری یہ گزارش مجلس کے شرکاء کی سمجھ میں آ گئی اور طے ہو گیا کہ حد کے بارے میں رضامندی اور جبر کے زنا کا فرق ختم کر دیا جائے، اور زنا بالجبر پر بھی شرعی ثبوت کی صورت میں حد جاری کرنے کے قانون کو بحال کیا جائے۔ یہ میں نے صرف ایک مثال دی ہے، ورنہ دو تین روز کی اس محفل میں اس طرح کی اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں جنہیں کسی اور موقع پر قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس پس منظر میں محترم جاوید احمد غامدی صاحب کے اس ارشاد سے میں اختلاف کر رہا ہوں کہ

علماء کی خصوصی کمیٹی کو مشورے کے لیے بلانے سے اسلامی نظریاتی کونسل کے دائرہ کار یا اختیارات پر کوئی اثر پڑا ہے، اس لیے کہ جیسے ہماری کمیٹی قومی آسمبلی کی سلیکٹ کمیٹی کے متوازن یا متبادل نہیں ہے، اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل کے متوازی اور متبادل بھی نہیں ہے۔ ہم نے چودھری شجاعت حسین صاحب کے کہنے پر صرف ایک نکتہ پر اپنی رائے دی ہے اور انہی کے کہنے پر وزارت قانون کے اعلیٰ افسران کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم جو رائے دے رہے ہیں قرآن و سنت کی تعلیمات کا منشا وہی ہے۔ اس سے زیادہ ہمارا کوئی کردار نہیں ہے اور نہ ہماری رائے کو کوئی آئینی اور قانونی درجہ حاصل ہے۔ یہ بل ہماری رائے سمیت دوبارہ سلیکٹ کمیٹی میں جا سکتا ہے، بلکہ قومی آسمبلی میں قائد حزب اختلاف مولانا فضل الرحمٰن کا یہ مطالبہ اخبارات میں آ چکا ہے کہ تحفظ حقوق نسواں بل کو علماء کمیٹی کی سفارشات کے ساتھ سلیکٹ کمیٹی میں دوبارہ بھیجا جائے۔ اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل بھی اس پر غور کر سکتی ہے، اور میری معلومات کے مطابق کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ حکومت اس کے پاس بل نہ بھی بھیجے تو وہ اپنے کسی رکن کی تحریک پر ایسا کر سکتی ہے۔ اس لیے اس کمیٹی کو اسلامی نظریاتی کونسل کے متوازی قرار دے کر اسے احتجاجی استعفیٰ کی بنیاد بنانا میرے خیال میں درست طریق کار نہیں ہے اور محترم جاوید احمد غامدی صاحب کو اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

باقی رہی بات کسی تعبیر و تشریح کو قبول کرنے یا نہ کرنے کی، تو میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ غامدی صاحب سے عرض کرنا چاہوں گا کہ اس کے لیے صرف کسی صاحبِ علم کا اسے پیش کر دینا اور اس پر اپنے خیال میں دلائل قائم کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ امت میں اسے قبولیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ امت میں حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، لیث بن سعدؒ اور امام بخاریؒ کے درجے کے بیسیوں فقہائے کرام موجود ہیں، جن کے علم و فضل اور کردار و تقویٰ کے تمام تر احترام کے باوجود ان کی فقہی آرا اور تعبیرات و تشریحات کو امت نے قبول نہیں کیا، اسی لیے ان پر عمل ہی نہیں ہو رہا۔ تو آج بھی کسی صاحبِ علم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کی تعبیر و تشریح کو امت میں قبولیت کا درجہ حاصل ہوئے بغیر واجب العمل سمجھ لیا جائے گا۔

تحفظ حقوق نسواں بل اور اسلامی نظریاتی کونسل

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳ دسمبر ۲۰۰۶ء)

اسلامی نظریاتی کونسل نے گزشتہ روز صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت اجلاس میں ''تحفظ نسواں بل'' کی حمایت کی ہے اور اسے عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی طرف اہم قدم قرار دیا ہے۔ جبکہ اس سے قبل کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود نے ایک بیان میں بتایا تھا کہ تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل نے کوئی باقاعدہ رائے قائم نہیں کی البتہ انہوں نے اور کونسل کے بعض ارکان نے ذاتی طور پر صدر جنرل پرویز مشرف کو اس بل کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اس نوعیت کی کوئی خبر اخبارات میں نہیں آئی کہ حکومت نے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' اسلامی نظریاتی کونسل کو رائے کے لیے بھجوایا ہے یا اسلامی نظریاتی کونسل نے اس بل پر غور کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ اجلاس منعقد کیا ہے۔

ہمارے خیال میں اس سارے خلا کو پر کرنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کا اجلاس براہ راست صدر جنرل پرویز مشرف کی صدارت میں منعقد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ لیکن کیا اس طرح کونسل کسی مسئلہ کے لیے رائے دینے کے حوالے سے ان اخلاقی اور قانونی تقاضوں کو ''کور'' کر سکے گی جو آئینی اور قانونی طور پر اس عمل کے لیے ضروری ہیں؟ ہمارے خیال میں کونسل نے یہ طرز عمل اختیار کر کے اپنی پوزیشن کو مزید مشکوک بنا لیا ہے کیونکہ کونسل میں جو چند ارکان علمائے دین ہیں وہ پہلے ہی اس سے کنارہ کشی اختیار کر چکے ہیں اور جو باقی ہیں انہیں بل پر معمول کے مطابق غور کا موقع دیے بغیر صدر مملکت کے سامنے بٹھا کر ان کی تائید حاصل کر لی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاوید احمد غامدی صاحب کو یہ وضاحت جاری کرنا پڑی ہے کہ وہ کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو چکے ہیں لیکن چونکہ ان کا استعفیٰ ابھی منظور نہیں ہوا اس لیے وہ اسلامی نظریاتی کونسل کے اس اجلاس میں شریک ہوئے ہیں جو صدر جنرل پرویز مشرف کی صدارت میں منعقد ہوا، البتہ غامدی صاحب نے اجلاس کے دوران تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی، گویا اجلاس میں ان کی شرکت کا تعلق بل سے نہیں بلکہ جنرل پرویز مشرف کی صدارت سے تھا اس لیے وہ اجلاس میں خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر

واپس آ گئے ہیں۔

اس پس منظر میں تحفظ حقوق نسواں بل کی حمایت میں اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے کو حکمران طبقہ اپنے لیے مفید سمجھ رہا ہے تو اسے اس سمجھنے کے حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمارے خیال میں اس مشکوک حمایت نے حکومت کے موقف کو پہلے سے بھی زیادہ کمزور کر دیا ہے۔ اس کے برعکس اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رائے اور سفارشات کو ایک نظر دیکھ لیا جائے جو "حدود آرڈیننس" کا مسودہ طے کرنے کے لیے کونسل نے ۱۹۷۹ء میں پیش کی تھیں تو دونوں مواقع کا فرق واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے طویل اجلاسوں میں مسودہ قانون کی ایک ایک شق پر تفصیلی غور کیا تھا، ملک کے سرکردہ علماء کرام اور ماہرین قانون سے مشاورت کا اہتمام کیا تھا اور دیگر مسلم ممالک کے علمائے کرام بالخصوص شام کے سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد معروف الدوالیبی کو بھی پاکستان تشریف آوری کی زحمت دی گئی تھی اور طویل بحث و مباحثہ کے بعد ان سفارشات کی منظوری دی گئی تھی جن پر حدود آرڈیننس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ مگر موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل کو تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے ان سارے مراحل سے گزرنے کی زحمت سے بچا لیا گیا ہے اور "سلوک" کے سارے منازل "قرب" کی ایک ہی جست میں طے کر کے تحفظ حقوق نسواں بل کو سند جواز فراہم کر دی گئی ہے۔ ہم ارباب فکر و دانش کو دعوت دیتے ہیں کہ ان دونوں مواقع یعنی ۱۹۷۹ء میں حدود آرڈیننس کے مسودہ کی ترتیب کے لیے اس وقت کی اسلامی نظریاتی کونسل کی علمی و فقہی تگ و دو، اور تحفظ حقوق نسواں بل کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے موجودہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سنجیدگی اور محنت کا موازنہ کر لیں۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ حدود آرڈیننس کی بنیاد کس قدر سنجیدہ علمی محنت پر تھی اور تحفظ حقوق نسواں بل کے لیے بحث و مباحثہ اور تحقیق و تجزیہ کی کیا صورت اختیار کی گئی ہے۔

بہرحال اسلامی نظریاتی کونسل نے تحفظ حقوق نسواں بل کو عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی طرف اہم قدم قرار دے کر اپنی رائے دے دی ہے جبکہ دوسری طرف ملک کے تمام دینی حلقے اور علمی مراکز دوسری طرف کھڑے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں دینی اور علمی طور پر چار مکاتبِ فکر تسلیم کیے جاتے ہیں: (۱) دیوبندی (۲) بریلوی (۳) اہلِ حدیث (۴) اور اہل تشیع۔ حکومت بھی جب کسی مسئلہ پر اہل دین کی رائے چاہتی ہے تو ان مکاتبِ فکر کو مسلمہ قرار دے کر ان کی نمائندگی کا اہتمام کرتی ہے اور

پرائیویٹ طور پر جب کسی مسئلہ پر اجتماعی دینی رائے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان مکاتبِ فکر کی نمائندگی کو ضروری تصور کیا جاتا ہے۔ ان مکاتبِ فکر کی مسلمہ اور معروف علمی و دینی قیادتیں موجود ہیں جن پر امت دینی معاملات میں اعتماد کرتی ہے اور جب کسی مسئلہ پر ان مکاتبِ فکر کے ذمہ دار رہنما مل بیٹھ کر کوئی رائے دیتے ہیں تو اسے دینی حلقوں کی اجتماعی رائے سمجھا جاتا ہے۔ اور جب ان مکاتبِ فکر کے رہنما کسی مسئلہ پر متحد ہو جاتے ہیں تو قوم یہ تصور کر لیتی ہے کہ دینی حلقے متحد ہو گئے ہیں۔

ان زمینی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو صورتحال یہ ہے کہ ان مکاتبِ فکر کی علمی و دینی قیادتیں الگ الگ طور پر بھی اور مجتمع ہو کر بھی واضح رائے دے چکی ہیں کہ ''تحفظ حقوق نسواں بل'' اپنے مقاصد اور بعض مشتملات دونوں حوالوں سے قرآن و سنت سے متصادم ہے اور اس پر ہر مکتبِ فکر کے ممتاز اہلِ علم کی تفصیلی نگارشات اخبارات میں قوم کے سامنے آچکی ہیں۔ ۲۷ نومبر کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں سب مکاتبِ فکر کے قائدین نے جمع ہو کر اجتماعی طور پر یہ رائے دی ہے جبکہ جامعہ نعیمیہ لاہور کے اجتماع میں بریلوی مکاتبِ فکر کے زعماء نے اس رائے کی تائید کی ہے اور اہلِ حدیث مکتبہ فکر کی ممتاز علمی شخصیات نے تحفظ حقوق نسواں بل کا بالتفصیل تنقیدی جائزہ لے کر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اہل تشیع کے علمی رہنماؤں نے جامعہ اشرفیہ لاہور کے کنونشن میں بھرپور وفد کی صورت میں شریک ہو کر اس اجتماعیت کی حمایت کی ہے اور الگ طور پر بھی وہ اس موقف کی مسلسل تائید کر رہے ہیں۔ اس کے بعد موجودہ صورتحال کے بارے میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ پورے ملک کے اہل دین ایک طرف ہیں جبکہ حکومت اپنے بل اور موقف کی حمایت میں کسی معروف اور مسلمہ مذہبی مکتبِ فکر کی کسی ممتاز شخصیت کو سامنے نہیں لا سکی اور ایسے دانشوروں کا سہارا تلاش کر رہی ہے جو قرآن و سنت کو من مانی تشریحات کے ذریعے حکمرانوں کے مطلوبہ معانی پہنا کر انہیں یہ تسلی دے سکیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ قرآن و سنت کی منشا کے مطابق ہے اور ملک بھر کے علمائے کرام بلاوجہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔

ہمارے خیال میں اس صورتحال کا اکبر بادشاہ کے دور سے موازنہ کر لیا جائے تو اسے زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کو بھی یہ خیال سوجھا تھا کہ دین و شریعت کی پرانی تعبیر و تشریح کو ختم کر کے ایسی نئی تعبیر و تشریح اختیار کی جائے جو مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے لیے بھی قابلِ قبول ہو اور دین کے تصور کو محدود رکھنے کی بجائے وسیع تر مفہوم

میں پیش کیا جائے۔ مغل اعظم نے اپنے اس خیال کو عملی اور قانونی شکل دے دی تھی اور اسی نوعیت کی بہت سی اصلاحات حکومتی طاقت کے زور سے نافذ کر دی تھیں جس طرح کی اصلاحات اب ''روشن خیالی'' کے عنوان سے لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ارباب علم و دانش اگر آج کی روشن خیالی کے عملی ایجنڈے اور جلال الدین اکبر کی اصلاحات کا موازنہ کریں تو انہیں کچھ زیادہ فرق دکھائی نہیں دے گا۔ ان اصلاحات کو حکومتی طاقت کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی اور طاقت کے بل پر انہیں نافذ کیا گیا تھا لیکن چونکہ عام مسلمانوں کے معتقدات اور دینی رجحانات سے ان اصلاحات کی مطابقت نہیں تھی اس لیے جلال الدین اکبر کے تمام تر جاہ و جلال اور حکومت و قانون کی تمام تر قوت کے باوجود اکبر بادشاہ کی یہ اصلاحات ایک نسل سے آگے نہ بڑھ سکیں اور ایک مرد درویش حضرت مجدد الف ثانیؒ کی قیادت میں علمائے حق کی جدوجہد کے سامنے اکبر کے دین الٰہی کو سپر انداز ہونا پڑا تھا۔ دینی علم رکھنے والے بہت سے دانشور اکبر بادشاہ کے ساتھ بھی تھے جنہیں اس کے درباری ہونے کا شرف حاصل تھا اور وہ اکبر بادشاہ کی اصلاحات کو درست ثابت کرنے کے لیے اسی طرح کے دلائل اور تاویلات پیش کرتے تھے لیکن ایسی باتوں کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ پانی میں زور سے پتھر پھینکیں تو وقتی طور پر ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور پانی کی سطح پر لہریں کچھ دیر تک حرکت بھی کرتی رہتی ہیں لیکن جلد ہی نارمل پوزیشن پر واپس آجاتی ہیں۔ دین کے حوالے سے اس امت کی نارمل پوزیشن وہی ہے جس پر یہ امت چودہ سو سال سے چلی آرہی ہے، اس میں روشن خیالی کا کوئی پتھر پھینک کر وقتی ارتعاش تو پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن کیا اس طرح کی حرکتوں سے امت کو اس کی نارمل دینی پوزیشن سے محروم کیا جاسکتا ہے؟ اب تک کی تاریخ کا جواب اس کی نفی میں ہے۔

مجلسِ تحفظِ حدود اللہ کا قیام اور متحدہ مجلسِ عمل کی ریلی

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۴ دسمبر ۲۰۰۶ء)

"تحفظ حقوق نسواں بل" کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی حالیہ رائے، مختلف مکاتبِ فکر کے علمائے کرام کی طرف سے "مجلس تحفظ حدود اللہ پاکستان" کے قیام کے ساتھ اس بل کے خلاف جدوجہد کے اعلان اور متحدہ مجلسِ عمل کی لاہور سے گجرات تک ریلی کے بعد اس سلسلہ میں صورتحال خاصی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے، مگر اس حوالے سے کچھ عرض کرنے سے قبل ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

تحفظ حقوق نسواں بل کی منظوری کے فوراً بعد ۱۸ نومبر کو شائع ہونے والے اپنے اسی کالم میں راقم الحروف نے لکھا تھا کہ اس بل کے ذریعے "زنا بالرضا" کی صورت میں شرعی حد (سنگسار یا سو کوڑے) ختم کر دی گئی ہے اور اس طرح زنا کے جرم میں شرعی حد کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ اسی کالم میں یہ وضاحت بھی موجود تھی کہ ابھی تک بل کا اصل متن سامنے نہیں ہے اور اس تاثر کی بنیاد صدر جنرل پرویز مشرف کی نشری تقریر کا یہ جملہ ہے کہ زنا بالرضا کے معاملے میں چار گواہوں کی شرط ختم کر دی گئی ہے اور ماہرین قانون اور پاکستان مسلم لیگ کے ارکان اسمبلی نے غور و خوض کے بعد ۴۹۶۔ بی کی دفعہ متعارف کرائی ہے جس کے تحت زنا بالرضا پر پانچ سال سزا ہو سکتی ہے۔ صدر محترم کے اس ارشاد سے نہ صرف ہم نے، بلکہ موقر معاصر "نوائے وقت" کے اداریہ نگار نے بھی یہی مفہوم سمجھا کہ زنا بالرضا پر شرعی حد ختم کر کے پانچ سال قید کی سزا مقرر کر دی گئی ہے، لیکن بعد میں بل کا متن سامنے آنے پر معلوم ہوا کہ یہ تاثر درست نہیں ہے اور اس نئے قانون میں زنا بالرضا کی صورت میں مکمل شرعی ثبوت فراہم ہونے پر حد شرعی (سنگسار یا سو کوڑے) کی سزا بحال رکھی گئی ہے، البتہ زنا کا مکمل ثبوت فراہم نہ ہونے کی صورت میں اس سے نچلے درجے کے جرائم کو فحاشی کا عنوان دے کر ان پر پانچ سال تک قید کی سزا مقرر کی گئی ہے۔

اس وضاحت کے بعد اب اسلامی نظریاتی کونسل کی اس رائے کی طرف آتے ہیں جو گزشتہ روز صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت منعقد ہونے والے کونسل کے اجلاس میں دی گئی ہے اور اس

میں اسلامی نظریاتی کونسل نے اخباری رپورٹ کے مطابق ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کی حمایت کر دی ہے۔ اس سے قبل کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کا یہ بیان اخبارات کی زینت بن چکا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے تحفظ حقوق نسواں بل پر باقاعدہ طور پر غور نہیں کیا اور ان سمیت کونسل کے بعض ارکان نے ذاتی طور پر اپنی رائے دی ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق اس کے بعد بھی ''تحفظ حقوق نسواں بل'' باقاعدہ رائے کے لیے کونسل کو نہیں بھجوایا گیا اور کونسل کی رائے اس بل کے حق میں شو کرنے کے لیے صدر جنرل مشرف کی صدارت میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس کا اہتمام ضروری سمجھا گیا۔ جبکہ اجلاس میں شریک ہونے والے کونسل کے ایک رکن محترم جاوید احمد غامدی کی طرف سے یہ وضاحت آئی ہے کہ وہ کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو چکے ہیں اور صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت منعقد ہونے والے اجلاس میں انہوں نے اس لیے شرکت کی ہے کہ ان کا استعفیٰ ابھی منظور نہیں ہوا مگر اجلاس میں انہوں نے اس بل کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔

اس پس منظر میں اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے ''تحفظ حقوق نسواں بل'' کی حمایت کی ہے تو اس کی اخلاقی اور قانونی حیثیت کے بارے میں مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، البتہ کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود کی رائے اور پوزیشن اس سے ضرور واضح ہو گئی ہے۔ ہم نے کچھ عرصہ قبل ایک کالم میں ان سے گزارش کی تھی کہ وہ ملک کے دینی و سیکولر حلقوں کے درمیان اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح کے بارے میں جاری کشمکش میں فریق بننے کی بجائے توازن اور اعتدال کا راستہ اختیار کریں، مگر انہوں نے درمیان میں رہنے کی بجائے ان دانشوروں کی صف میں کھڑا ہونا پسند کر لیا ہے جو عورت کے بارے میں مغرب اور مسلمانوں کے درمیان موجودہ فکری و تہذیبی تنازع میں مغرب کو اس کی غلطیوں کی طرف توجہ دلانے کی بجائے قرآن و سنت کے احکام و قوانین میں ردوبدل کر کے انہیں مغرب کے سانچے میں ڈھالنے کا راستہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل اور اس کے چیئرمین کی موجودہ پوزیشن کا تعلق ہے، اسے دیکھ کر صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں قائم ہونے والا ''ادارہ تحقیقات اسلامی'' یاد آنے لگا ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن تھے اور انہوں نے بھی دین کی تعبیر و تشریح کے بارے میں یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا جو اب ڈاکٹر خالد مسعود اور ان کے رفقاء نے اپنایا ہے۔ اس وقت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی شخصیت اپنے تمام جاہ و جلال کے ساتھ ان کی پشت پر تھی اور تمام سرکاری وسائل ان کے ساتھ تھے،

لیکن ملک کے دینی حلقوں اور عوام کو ان کا یہ رویہ برداشت نہیں ہوا تھا اور جب عوام سڑکوں پر آگئے تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو ہی میدان چھوڑنا پڑا تھا۔......

آل پاکستان مینارٹیز الائنس کی ریلی اور چارٹر آف ڈیمانڈ

(روزنامہ پاکستان، لاہور – ۱۸ اگست ۲۰۰۷ء)

......لاہور کے ایک روزنامہ نے چند روز قبل مینار پاکستان کے سبزہ زار میں منعقد ہونے والی ایک ریلی کی رپورٹ تفصیل کے ساتھ شائع کی ہے جو ’’آل پاکستان مینارٹیز الائنس‘‘ کے زیر انتظام ’’قومی یکجہتی ریلی‘‘ کے عنوان سے منعقد ہوئی۔ رپورٹ کے مطابق اس میں مختلف اقلیتوں کے ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ ریلی سے آل پاکستان مینارٹیز الائنس کے سربراہ جناب شہباز بھٹی اور دیگر اقلیتی رہنماؤں فادر بونی مینڈس، ایم پرکاش ایڈووکیٹ، سردار رام سنگھ، بھجن داس تجوانی اور بیربل رام چوہان کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل جناب جہانگیر بدر اور جناب قاسم ضیاء نے بھی خطاب کیا۔ قومی یکجہتی ریلی کے موقع پر ۳۰ نکاتی مطالبات کا ایک مشترکہ اعلامیہ بھی منظور کیا گیا اور چیف جسٹس آف پاکستان سے اپیل کی گئی کہ وہ اس ۳۰ نکاتی ’’چارٹر آف ڈیمانڈ‘‘ پر فوری اور سنجیدہ توجہ دیں۔ چارٹر آف ڈیمانڈز میں دیگر بہت مطالبات کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب کے گورنر کا منصب دستوری طور پر ہمیشہ کے لیے اقلیتوں کے لیے مختص کر دیا جائے۔......

چارٹر آف ڈیمانڈز میں شامل دیگر بہت سے مطالبات بھی اس ایک بنیادی نکتے کے گرد گھومتے ہیں کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کو ختم کر دیا جائے، اور اس کے دستور میں شامل ایسی تمام دفعات حذف کر دی جائیں جو پاکستان کے جداگانہ اسلامی اور تہذیبی تشخص و امتیاز کی نشاندہی کرتی ہیں، مثلاً یہ کہ

- تعزیرات پاکستان سے دفعہ ۲۹۵ بی اور ۲۹۵ سی کو ختم کیا جائے۔
- اقلیتوں اور خواتین کے خلاف حدود قوانین اور اس جیسے دیگر امتیازی قوانین کو ختم کیا جائے۔
- اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کر کے ملک میں بسنے والے تمام مذاہب کے افراد پر مشتمل ’’بین المذاہب کونسل‘‘ تشکیل دی جائے۔
- مذہبی برداشت کا قومی کمیشن تشکیل دیا جائے جو ملک کے معاشرے میں اکثریتی اور اقلیتی

آبادی کے فرق کو ختم کرے، وغیرہ وغیرہ۔

لطف کی بات یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد پر تفریق کو سرے سے ختم کرنے اور دستور و قانون میں اس کے تمام نشانات و اثرات کو محو کر دینے کے ان مطالبات کے ساتھ ساتھ اس چارٹر آف ڈیمانڈز میں ایسے مطالبات بھی شامل کیے گئے ہیں جن کی خود اپنی بنیاد مذہبی تفریق پر ہے، مثلاً:

- پنجاب کا گورنر ہمیشہ کے لیے غیر مسلم مقرر کیا جائے۔
- قومی اسمبلی کی طرح سینٹ میں بھی اقلیتوں کے لیے سیٹیں مخصوص کی جائیں۔
- قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کی نشستیں ان کی آبادی میں اضافے کے حساب سے بڑھائی جائیں۔
- اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی ماہرین کی مشاورت سے پرسنل لاز کا از سر نو تعین کیا جائے، وغیرہ۔

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہمیں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اقلیتوں کے جائز حقوق کے تحفظ اور ان کے جائز مطالبات کو منظور کرنے سے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ ہم خود ان کی حمایت کرتے ہیں، لیکن اس کی آڑ میں پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت سے انکار، اور دستورِ پاکستان کی اسلامی نظریاتی اساس کو مسترد کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، کیونکہ یہ بات پاکستان کے قیام اور بقا کے جواز کو چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے ہم آل پاکستان مینارٹیز الائنس کے قائدین سے اس انتہا پسندانہ موقف پر نظر ثانی کی اپیل کرتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں جناب جہانگیر بدر اور جناب قاسم ضیاء کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرانا چاہیں گے کہ ان کی موجودگی میں بلکہ ان کی حمایت سے دستورِ پاکستان کی جن دفعات کو ختم کرنے کا اس اقلیتی ریلی میں مطالبہ کیا گیا ہے وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے ملک کے دستور میں شامل کی تھیں۔ ہمارا ان سے سوال ہے کہ کیا پاکستان پیپلز پارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے نظریات و افکار سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے؟

اسلامی نظریاتی کونسل کی علمی اشاعتیں

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۳۰ اگست ۲۰۰۷ء)

......ایک مجلس کا اہتمام اسلام آباد میں ۲ اگست کو اسلامی نظریاتی کونسل نے کیا، اسی روز بھوربن مری کے مدرسہ تعلیم القرآن میں پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا، اس لیے وہاں جاتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کی اس نشست میں حاضری کا موقع مل گیا۔ یہ علمی اور فکری نشست دو حوالوں سے تھی۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے ''اجتہاد'' کے عنوان سے ایک علمی و فکری سہ ماہی مجلہ کا اجرا کیا ہے جس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ جبکہ خواتین کے حقوق کے حوالے سے نامور عرب عالم دین اور دانشور الاستاذ عبد الحلیم محمد ابو شقہؒ کی ایک معرکۃ الآرا کتاب کا اردو ترجمہ اسلامی نظریاتی کونسل نے شائع کیا ہے۔ یہ تقریب مجلہ ''اجتہاد'' اور ''خواتین کی آزادی عصر رسالتؐ میں'' کے نام سے شائع ہونے والی اس کتاب کی رونمائی کے لیے منعقد ہوئی۔ کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود نے مجھے بطور خاص اس میں شرکت کی دعوت دی۔ دونوں موضوع میری خصوصی دلچسپی کے ہیں اس لیے حاضری ضروری تھی۔

اجتہاد کی ضرورت اور حدود کار پر گزشتہ ربع صدی سے مسلسل لکھتا آ رہا ہوں۔ مذکورہ مجلہ میں بھی مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کے تصور اجتہاد پر میرا ایک مضمون شامل اشاعت ہے، اور شاید میری اسی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے سہ ماہی ''اجتہاد'' کی مجلس مشاورت میں بھی میرا نام شامل کر لیا گیا ہے۔

اجتہاد کے بارے میں ہم اس وقت دو انتہا پسندانہ رویوں سے دوچار ہیں:

- ایک طرف سرے سے اجتہاد کی ضرورت سے انکار کیا جا رہا ہے،
- اور دوسری طرف اجتہاد کے نام پر امت کے چودہ سو سالہ علمی مسلمات اور اجماعی اصولوں کا دائرہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

جبکہ حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان میں ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ امتِ مسلمہ کے اجماعی اصولوں اور علمی مسلمات کے دائرے میں رہتے ہوئے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں امتِ مسلمہ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جائے، خاص طور پر نئے پیش آمدہ مسائل کے

قابلِ قبول دینی وعلمی حل کی کوئی صورت نکالی جائے۔

عصرِ حاضر میں دنیا کے مختلف اسلامی ممالک میں اس پر مسلسل کام ہو رہا ہے اور بہت سے تحفظات کے باوجود اس سلسلے میں پیشرفت جاری ہے۔ میں خود اس امر کی ضرورت محسوس کر رہا تھا کہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں اجتہاد کے عنوان سے ہونے والے کام سے پاکستان کے اہلِ علم و دانش کا آگاہ ہونا ضروری ہے، ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے واقفیت کے ساتھ ساتھ مختلف جہات سے ہونے والی اجتہادی کاوشوں کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہونے چاہئیں، اتفاق یا اختلاف اس سے بعد کا مرحلہ ہے کہ ہم کس بات کو قبول کرتے ہیں اور کون سی ہمارے نزدیک قبولیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی، مگر اس سے پہلے ان کاوشوں سے اور ان کے دلائل و نتائج سے واقفیت ناگزیر ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی کسی بات سے اتفاق یا اختلاف کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے سہ ماہی مجلہ اجتہاد کا دائرہ کار یہی طے کیا ہے اور اس کی ادارتی ذمہ داری ہمارے ایک فاضل دوست خورشید احمد ندیم کے سپرد کی ہے، جو بعض مسائل میں اختلاف و اتفاق کے تحفظات سے قطع نظر اپنی استعداد، اہلیت اور ذوق کے حوالے سے اس کام کے لیے موزوں ہیں اور اسے بہتر طریقے سے آگے بڑھا سکتے ہیں۔

الاستاذ عبد الحلیم محمد ابو شقہؒ کی کتاب ''تحریر المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' میں نے کوئی دس برس قبل لندن میں ورلڈ اسلامک فورم کے سیکرٹری جنرل مولانا مفتی برکت اللہ کی لائبریری میں دیکھی تھی، اور صرف دیکھی ہی نہیں بلکہ پڑھی بھی تھی، اور پھر فورم کے چیئرمین کی حیثیت سے حق صدارت استعمال کرتے ہوئے ضبط بھی کر لی تھی، اب ورلڈ اسلامک فورم کے چیئرمین مولانا محمد عیسیٰ منصوری ہیں اور مجھے ان دوستوں نے سرپرست کا درجہ دے رکھا ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے اور اس میں مصنف نے اس بات پر بحث کی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے معاشرے میں عورتوں کے حقوق اور آزادی کے حوالے سے کیا عملی تبدیلیاں پیدا کی تھیں، اور جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے اسلامی معاشرے میں عورتوں کو کون کون سے شعبوں میں کیا کیا آزادیاں حاصل تھیں؟ مصنف نے اس کتاب میں قرآن کریم کے بعد احادیث نبویؐ کی دو مستند ترین کتابوں بخاری شریف اور مسلم شریف کو حوالوں کے لیے بنیاد بنایا ہے اور تمام معلومات قرآن کریم، بخاری شریف اور مسلم شریف کے دائرے میں رہتے ہوئے پیش کی ہیں۔ ان کے بعض استدلال اور نتائج فکر

سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن مصنف کی یہ محنت واقعتا قابلِ داد ہے کہ انہوں نے عورتوں کے حقوق اور آزادی کے حوالے سے مباحثہ و مکالمہ کے لیے قرآن و سنت کا مستند ترین مواد یکجا کر دیا ہے۔

میری ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ ہو جائے تاکہ پاکستان کے دینی حلقے بھی اس سے استفادہ کر سکیں، اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ کام کر دیا ہے اور اپنے وسائل اور دائرہ کار کی مناسبت سے وہی یہ کام بہتر طور پر کر سکتی تھی، جس پر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی موجودہ ہیئت سے ملک کے روایتی دینی حلقوں کو بہت سی شکایات ہیں، جبکہ کونسل کا غیر متوازن ڈھانچہ اور بعض فیصلے ان شکایات کا جواز بھی فراہم کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود سہ ماہی مجلہ ''اجتہاد'' کا آغاز اور ''تحریر المرأة فی عصر الرسالة'' کے اردو ترجمہ کی اشاعت کو اسلامی نظریاتی کونسل کی اچھی کوششوں میں ہی شمار کیا جانا چاہیے۔......

حدود و تعزیرات سے متعلق
اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

(۷ ستمبر ۲۰۰۷ء)

(محمد عمار خان ناصر کی تصنیف ”حدود و تعزیرات: اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا جائزہ“ کے دیباچے کے طور پر لکھا گیا۔)

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جسے اس غرض سے تشکیل دیا گیا تھا کہ دستورِ پاکستان میں ملک کے تمام مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کی جو ضمانت دی گئی ہے، وہ اس کی تکمیل کے لیے حکومت پاکستان کی مشاورت کرے۔ اس کی عملی شکل یہ ہے کہ جدید قانون کے ممتاز ماہرین اور جید علمائے کرام پر مشتمل ایک کونسل تشکیل دی جاتی ہے جو حکومت کے استفسار پر یا اپنے طور پر ملک میں رائج کسی قانون کا اس حوالے سے جائزہ لیتی ہے کہ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں، اور اگر وہ اس قانون کو اسلامی تعلیمات کے منافی تصور کرتی ہے تو اس کی خامیوں کی نشان دہی کرتی ہے اور اس کے متبادل قانون کا مسودہ سفارش کی صورت میں مرتب کر کے حکومت کے سپرد کر دیتی ہے۔ دستور کی رو سے حکومت اس بات کی پابند ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی یا صوبائی اسمبلی میں پیش کر کے اس کے مطابق قانون سازی کرے۔

۱۹۷۳ء کے دستور سے قبل یہ ادارہ ”اسلامی مشاورتی کونسل“ کے نام سے اور اس سے پہلے ”تعلیمات اسلامیہ بورڈ“ کے نام سے قائم رہا ہے اور ملک کے بہت سے سرکردہ ماہرین قانون اور ممتاز علمائے کرام مختلف اوقات میں اس میں خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنے قیام کے بعد سے اب تک سینکڑوں قوانین کا جائزہ لیا ہے اور ان کے بارے میں اپنی تجاویز اور سفارشات حکومت پاکستان کے سامنے پیش کی ہیں، جن کے حوالے سے دستور کا یہ تقاضا کہ انہیں متعلقہ اسمبلیوں میں پیش کر کے قانون سازی کے مرحلہ سے گزارا جائے، ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے۔ بلکہ

اب تک یہ صورتحال رہی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور اس کے مرتب کردہ مسودہ ہائے قانون کی پیشانی پر "صرف سرکاری استعمال کے لیے" کا لیبل چسپاں کر کے اس کی اشاعت کو شجرۂ ممنوعہ قرار دیا جاتا رہا ہے، لیکن جب سے ڈاکٹر خالد مسعود اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین بنے ہیں، یہ صورتحال قدرے تبدیل ہو رہی ہے۔ وہ کونسل کو عوامی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور کونسل سے ہٹ کر علماء اور دانشوروں کے وسیع حلقے کو اپنی مشاورت کے دائرے میں شامل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ ان کی سربراہی کے دور میں کونسل کی طرف سے اسلامی احکام و قوانین کے حوالے سے مختلف سیمینارز کے انعقاد اور متعدد سفارشات پیش کرنے کے علاوہ "اجتہاد" کے نام سے ایک سہ ماہی مجلہ کا اجرا بھی کیا گیا ہے، جس کا مقصد عالم اسلام کے مختلف اطراف میں اجتہاد کے حوالے سے ہونے والی علمی کاوشوں سے پاکستان کے دینی و علمی حلقوں کو متعارف کرانا اور اس طرح باہمی ربط و مشاورت کا ماحول پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ جدید مسائل کے بارے میں اجتہادی ضروریات سے انہیں آگاہ کرنا ہے۔

اجتہاد کے بارے میں ہم اس وقت دو انتہا پسندانہ رویوں سے دوچار ہیں۔ ایک طرف سرے سے اجتہاد کی ضرورت سے انکار کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف اجتہاد کے نام پر امت کے چودہ سو سالہ علمی مسلّمات اور اجماعی اصولوں کا دائرہ توڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جبکہ حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ امتِ مسلمہ کے اجماعی اصولوں اور علمی مسلّمات کے دائرے میں رہتے ہوئے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں امتِ مسلمہ کے مسائل و مشکلات کا حل پیش کیا جائے، اور خاص طور پر نئے پیش آمدہ مسائل کے قابلِ قبول دینی و علمی حل کی کوئی صورت نکالی جائے۔

اس وقت اسلامی قوانین، دستوری دفعات اور عدالتی فیصلوں پر نظر ثانی کے تقاضے مختلف حلقوں کی طرف سے سامنے آ رہے ہیں اور دھیرے دھیرے ایسی فضا قائم ہو رہی ہے کہ اگر ان تقاضوں کے حوالہ سے اصولی ترجیحات کا ابھی سے تعین نہ کیا گیا تو اسلامائزیشن کے حوالہ سے سپریم کورٹ آف پاکستان، وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کا اب تک کا پورے کا پورا عمل نظر ثانی کی زد میں آ جائے گا۔ یہ ادارے اس سلسلہ میں مزید کسی پیشرفت کی بجائے اپنے سابقہ کام کی صفائیاں پیش کرنے اور ان میں ردوبدل کرنے میں ہی مصروف رہیں گے اور یہ "ریورس گیئر"

پاکستان میں اسلامائزیشن کے عمل کو ایک بار پھر ''زیرو پوائنٹ'' تک واپس لے جائے گا۔

ہمیں اسلام کے نام پر نافذ ہونے والے قوانین پر نظر ثانی کی ضرورت سے انکار نہیں ہے اور اگر کسی مسودہ قانون میں کوئی فنی سقم رہ گیا ہے یا اس پر عملدرآمد کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود ہے تو قرآن و سنت کے اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس پر نظر ثانی سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ عمل ہمارے داخلی تقاضوں اور ضروریات کے حوالہ سے ہونا چاہیے اور اس سلسلہ میں بیرونی عوامل اور دباؤ کو قبول کرنے کا کسی سطح پر بھی تاثر قائم نہیں ہونا چاہیے، ورنہ ضروری اور جائز نظر ثانی بھی شکوک و شبہات کا شکار ہو کر اس عمل پر عوام اور دینی حلقوں کے اعتماد کو مجروح کرنے کا باعث بن جائے گی۔ اس لیے میں اسلامائزیشن کی راہ میں حائل داخلی مشکلات اور اسلامی قوانین پر نظر ثانی کے دونوں حوالوں سے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' کے سامنے مندرجہ ذیل تجاویز رکھنا چاہوں گا:

۱. اسلامی قوانین پر نظر ثانی کے خارجی دباؤ یعنی بین الاقوامی تقاضوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک الگ ''ورکنگ گروپ'' قائم کرنے کی ضرورت ہے جو بین الاقوامی قوانین اور تقاضوں کے ساتھ شرعی قوانین کے تضادات کی نشاندہی کرے، ان تضادات کے اسباب اور پس منظر کی وضاحت کرے اور ان کے حوالہ سے شرعی قوانین کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کو واضح کرتے ہوئے اس سلسلہ میں عالمی سطح پر اٹھائے جانے والے اعتراضات اور شکوک و شبہات کا جدید اسلوب اور خالصتاً علمی انداز میں جواب دے۔

ہم اس وقت اس معاملہ میں قومی سطح پر ''تذبذب'' کا شکار ہیں اور اسلامی قوانین کے بارے میں عالمی تقاضوں اور دباؤ کو نہ پوری طرح قبول کر رہے ہیں اور نہ ہی مسترد کر رہے ہیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں ہے اور اس سے پاکستان میں اسلامائزیشن کے بارے میں ابہام اور کنفیوژن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہمیں علمی انداز میں ان سوالات کا سامنا کرنا چاہیے اور علم و دانش کی اعلیٰ ترین سطح پر ان سوالات کا جائزہ لیتے ہوئے شکوک و شبہات کا علمی جواب دینا چاہیے۔ ہمارے نزدیک اس کام کے لیے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' سب سے بہتر فورم ہے البتہ کونسل اس کام کے لیے حسب معمول دوسرے اہلِ علم کا تعاون بھی حاصل کر سکتی ہے۔

۲. داخلی تقاضوں، ضروریات اور مشکلات کا جائزہ لینے اور اسلامی قوانین کے مسودات کی

خامیوں کی نشاندہی کے لیے ''ورکنگ گروپ'' قائم ہونا چاہیے جس میں سیشن کورٹس کی سطح کے جج صاحبان، دینی مدارس میں فقہ و حدیث کا کم از کم بیس سالہ تجربہ رکھنے والے مدرسین اور اسی سطح کے وکلاء صاحبان کو شامل کیا جائے جو متعلقہ قوانین کا تفصیلی اور شق وار جائزہ لے کر انہیں مؤثر بنانے کے لیے تجاویز دیں۔ آزاد کشمیر میں چونکہ سیشن جج اور ضلع قاضی مل کر مقدمات کا فیصلہ کرتے ہیں، اس لیے ان کا عملی تجربہ زیادہ ہے اور ورکنگ گروپ میں ایسے جج صاحبان اور قاضی حضرات کی شمولیت زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔

۳. دور جدید میں اسلامی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح کے حوالے سے دنیا کے مختلف اسلامی ممالک میں مسلسل کام ہو رہا ہے اور بہت سے تحفظات کے باوجود اس سلسلے میں پیشرفت جاری ہے۔ اس امر کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں ''اجتہاد'' کے عنوان سے ہونے والے کام سے پاکستان کے اہلِ علم و دانش کو آگاہ کیا جائے۔ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر سے واقفیت کے ساتھ ساتھ مختلف جہات سے ہونے والی اجتہادی کاوشوں کے نتائج بھی ہمارے سامنے ہونے چاہئیں۔ اتفاق یا اختلاف اس سے بعد کا مرحلہ ہے کہ ہم کس بات کو قبول کرتے ہیں اور کون سی بات ہمارے نزدیک قبولیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی، مگر اس سے پہلے ان کاوشوں سے اور ان کے دلائل و نتائج سے واقفیت ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بعد ہی کسی بات سے اتفاق یا اختلاف کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

۴. جہاں تک کسی تعبیر و تشریح کو قانون سازی کے دائرے میں عملاً قبول کرنے یا نہ کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے صرف کسی صاحبِ علم یا مکتبِ فکر کا اسے پیش کر دینا اور اس پر اپنے خیال میں دلائل قائم کر دینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ امت میں اسے قبولیت حاصل ہونا بھی ضروری ہے۔ امت میں حسن بصریؒ، سفیان ثوریؒ، لیث بن سعدؒ اور امام بخاریؒ کے درجے کے بیسیوں فقہائے کرام موجود ہیں جن کے علم و فضل اور کردار و تقویٰ کے تمام تر احترام کے باوجود ان کی فقہی آرا اور تعبیرات و تشریحات کو امت نے اجتماعی طور پر قبول نہیں کیا، اسی لیے ان پر عمل بھی نہیں ہو رہا۔ تو آج بھی کسی صاحبِ علم کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ان کی تعبیر و تشریح کو امت میں قبولیت کا درجہ حاصل ہوئے بغیر واجب العمل سمجھ لیا جائے

گا۔

صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں عائلی قوانین کے نام سے نکاح، طلاق اور وراثت کے شرعی قوانین کو ردوبدل کا نشانہ بنایا گیا تھا اور حکومت نے دینی و علمی حلقوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے قانون اور حکومت کے زور پر عائلی قوانین ملک میں نافذ کر دیے تھے، مگر ساری دنیا اس حقیقت کا مشاہدہ کر رہی ہے کہ نصف صدی کے قریب عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ قوانین اب بھی قوم میں متنازعہ ہیں۔ جہاں تک قانون کا جبر کام کرتا ہے اس سے زیادہ عائلی قوانین کا کوئی اثر معاشرے میں نہیں ہے۔ لوگ اب بھی نکاح، طلاق اور وراثت کے معاملات میں مسائل علمائے کرام ہی سے پوچھتے ہیں اور انہی پر عمل کرتے ہیں۔ قوم نے ان قوانین کو آج تک سنجیدگی سے نہیں لیا اور نہ ہی انہیں ذہنی طور پر قبول کیا ہے۔

اس کے اسباب پر نظر ڈالی جائے تو دو باتیں بطور خاص سامنے آتی ہیں۔ ایک کی طرف ہم سطور بالا میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ شرعی احکام و قوانین میں ردوبدل کی کوئی بات سرکاری حلقوں کی طرف سے سامنے آئے تو اس کا داعیہ داخلی ضروریات نہیں بلکہ خارجی دباؤ اور مغرب کے مطالبات ہوتے ہیں، اور یہ بات کسی بھی مسلمان کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ جبکہ دوسری وجہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر شرعی احکام و قوانین کی تعبیر و تشریح میں عام مسلمانوں اور جمہور اہلِ علم کے مسلّمات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر حدود و تعزیرات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی زیر نظر سفارشات کو ہی دیکھ لیا جائے۔ کونسل نے ان سفارشات میں صرف قرآن کریم کو بنیاد بنایا ہے اور شرعی احکام کے باقی تینوں مسلمہ مآخذ (۱) سنت، (۲) اجماع اور (۳) قیاس سے صرف نظر کیا ہے۔ چنانچہ رجم کے شرعی حد ہونے اور ارتداد کی شرعی سزا سے انکار اور متعلقہ سفارشات میں شامل دیگر بہت سی باتوں کا ہمارے نزدیک پس منظر یہی ہے۔ جبکہ معروضی صورتحال یہ ہے کہ ملک کی آبادی کی غالب اکثریت اہل السنۃ والجماعۃ پر مشتمل ہے جن کا تعارف ہی سنت اور جماعت کے حوالہ سے ہے کہ وہ قرآن کریم کی تشریح اور احکام شرعیہ کی تعبیر میں سنت رسولؐ اور جماعت صحابہؓ کو معیار سمجھتے ہیں۔ اور اہل السنۃ والجماعۃ

کے جمہور اہلِ علم کے نزدیک احکام شرعیہ اور اسلامی قوانین کی بنیاد چار مآخذ پر ہے: (۱) قرآن کریم، (۲) سنت رسولؐ، (۳) اجماع اور (۴) قیاس۔ مگر اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات میں قرآن کریم کو بطور ماخذ اپنایا گیا ہے اور اس کی تشریح و تعبیر میں قیاس محض یعنی عقل عام کو ذریعہ کے طور پر اختیار کیا گیا ہے جس سے سنت رسولؐ، اجماع اور قیاس شرعی تینوں اس معاملہ سے بے دخل ہو گئے ہیں۔

سنت رسولؐ کے اسلامی قوانین کا بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کونسل اس بات کو بھی بھول گئی ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سنت رسولؐ کی اس حیثیت کا بعض حلقوں کی طرف سے شدومد کے ساتھ انکار ہوا تھا اور اس پر بہت دیر تک بحث و مباحثہ کا بازار گرم رہا تھا مگر ملک کی رائے عامہ نے اسے سختی کے ساتھ مسترد کر دیا اور قوم کے منتخب نمائندوں نے جب ۱۹۷۳ء کا دستور ترتیب دیا تو اس میں صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد نہیں بنایا بلکہ سنت کو اس کے ساتھ شامل کر کے قرآن و سنت کو دستور اور قانون کے معاملات میں مشترکہ معیار اور ماخذ قرار دیا تھا۔

ان تحفظات کے ساتھ ساتھ بہر حال یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ دینی، علمی اور ملی مسائل پر باہمی تبادلۂ خیالات اور مکالمہ کی ضرورت کا احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ اور اس پس منظر میں عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلّمہ اللہ تعالیٰ نے حدود و تعزیرات کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کا فقہی اصول اور دلائل کی روشنی میں جائزہ لیا ہے جو اس بحث و مباحثہ کو علمی انداز میں آگے بڑھانے کی ایک مفید کوشش ہے۔ آج کے ایسے نوجوان اصحاب علم کو جو علمی استعداد اور وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ معروضی حالات و مسائل اور پیش آمدہ علمی و فکری مشکلات کا کسی حد تک ادراک بھی رکھتے ہیں، فکری و فقہی جمود اور مطلق آزادئ فکر کی دو انتہاؤں کے درمیان متوازن راستہ تلاش کرنے میں جن دشواریوں کا سامنا ہے، مجھے پوری طرح ان کا احساس ہے، اس لیے اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلّمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کے لیے آزادانہ بحث و مباحثہ اور تحقیق و تمحیص کا حق تسلیم کرتا ہوں اور ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ اس کی کچھ جھلک اس جائزہ میں بھی قارئین کو نظر آئے گی مگر میرے نزدیک یہ علمی مباحثہ و مکالمہ کا ناگزیر حصہ ہے اور ان مراحل سے گزرے بغیر کسی مسئلہ کے صحیح حل تک پہنچنا عام طور پر ممکن نہیں ہوتا۔

ضروری نہیں ہے کہ اس جائزہ کی ہر بات سے اتفاق کیا جائے لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کا توجہ کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور دور حاضر کے وسیع عالمی تناظر میں اسلامی احکام وقوانین کی تعبیر وتشریح کے حوالہ سے جو مشکلات وضروریات اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات اور ان پر عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلّمہ کے اس تبصرہ سے ظاہراً یا بین السطور جھلکتی دکھائی دے رہی ہیں، علمی رسوخ و اعتماد سے بہرہ ور شخصیات اور ادارے ان کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہو کر اس سلسلے میں امتِ مسلمہ کی راہنمائی کا فرض ادا کریں کہ یہی وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

کیا اسلام مکمل ضابطۂ حیات نہیں؟

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۲۰۰۷ء)

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۷ نومبر ۲۰۰۷ء کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر خالد مسعود نے کہا ہے کہ اسلام مکمل دین ہے مگر مکمل ضابطۂ حیات نہیں ہے، اسلام میں چہرے کا پردہ ہے نہ سر کا، یہ محض معاشرتی رواج ہے، جبکہ حجاب صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے لیے تھا۔ ڈاکٹر خالد مسعود نے یہ بھی کہا ہے کہ حدود اللہ کا کوئی تصور قرآن میں موجود نہیں ہے، یہ تصور فقہاء حضرات کا ہے کہ مخصوص جرائم کی سزا کو حدود اللہ کہا جائے، وغیرہ ذٰلک۔

ڈاکٹر خالد مسعود کا تعلق ایک ٹھیٹھ مذہبی گھرانے سے ہے، ان کے والد محترم حضرت صوفی شیر محمد صاحبؒ حضرت شاہ عبد القادر رائے پوریؒ کے مجازین میں سے تھے اور جمعیۃ علماء اسلام ضلع جھنگ کے نائب امیر رہے ہیں، جھنگ شہر میں ان کی قائم کردہ مسجد تقوٰی آج بھی اہل حق کی سرگرمیوں کا مرکز ہے اور مجھے وہاں وقتاً فوقتاً دینی پروگراموں کے لیے حاضری کا موقع ملتا رہتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ڈاکٹر خالد مسعود کا فکری تعلق ڈاکٹر فضل الرحمٰن سے ہے جنہوں نے اسلام کی تحقیق و مطالعہ مستشرقین کی نگرانی میں کیا اور پھر انہی کے رنگ میں رنگے گئے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن کو صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور حکومت میں سرکاری طور پر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کا سربراہ بنایا گیا تھا اور انہوں نے اسلام کی جدید تعبیر و تشریح کے نام سے اسی قسم کے ”اجتہادات“ کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جس کا تسلسل دوبارہ قائم کرنے کی ڈاکٹر خالد مسعود صاحب کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن عوامی حلقوں کے شدید غیظ و غضب کے باعث حکومت کو انہیں اس منصب سے الگ کرنا پڑا تھا اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ان ”اجتہاد نما تحریفات“ پر صدر ایوب خان مرحوم بھی عوام کی نفرت کا نشانہ بنے تھے۔

ہم ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے افکار جو بھی ہوں، انہیں ذاتی طور پر اپنا فکر خود طے کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن چونکہ اس قسم کے افکار پاکستان کے جمہور مسلمانوں اور جمہور اہلِ علم کی نمائندگی نہیں کرتے اس لیے انہیں ایسے افکار کے اظہار اور ان کی اشاعت کے لیے سرکاری حیثیت اور سرکاری وسائل کو استعمال کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ وہ

اگر ایک سرکاری منصب پر بیٹھ کر ملک کے جمہور اہلِ علم اور جمہور مسلمانوں کے معتقدات اور دینی جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتے یا کم از کم ان کا لحاظ نہیں کر سکتے تو انہیں اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس منصب سے الگ ہو کر اپنے ذاتی افکار کو ذاتی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے، کیونکہ قوم کے خزانے کو قوم کی اکثریت کے جذبات و عقائد کے خلاف استعمال کرنا کسی طرح بھی دیانت و اخلاق کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

جہاں تک اسلام کے مکمل ضابطۂ حیات ہونے کا تعلق ہے، ہم ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے کہیں گے کہ وہ صرف بخاری شریف کی فہرست مضامین پر ایک نظر ڈال لیں اور پھر بتائیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا وہ کون سا پہلو ہے جو جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور راہنمائی سے خالی ہے؟ اسی طرح بخاری شریف میں آنحضرتؐ کا یہ ارشاد گرامی بھی ملاحظہ کر لیں جس میں آقائے نامدارؐ نے چوری کے جرم میں ایک ملزم کی شفاعت کرنے پر حضرت اسامہ بن زیدؓ کو یہ کہہ کر ڈانٹا تھا کہ "اتشفع فی حدمن حدو د اللہ" کیا تم اللہ تعالیٰ کی حدود کے معاملہ میں سفارش کر رہے ہو؟

ہاں! اگر ڈاکٹر خالد مسعود صاحب اور ان کے دیگر ہمنوا قرآن کریم کی تشریح اور اس کے کسی حکم کا مصداق طے کرنے میں جناب نبی اکرمؐ کا حق تسلیم نہیں کرتے اور یہ اتھارٹی خود اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہیں تو الگ بات ہے، ورنہ جرائم کی سزاؤں کو "حدود" آنحضرتؐ نے قرار دیا ہے اور انسانی نسل کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں آپؐ کی ہدایات و راہنمائی اس قدر تفصیل اور جامعیت کے ساتھ حدیث و سیرت کے ریکارڈ میں محفوظ ہے کہ آج کا کوئی بھی نظام جامعیت میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

شریعت بِل پر ایک نظر

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۱ جنوری ۲۰۰۸ء)

...... شریعت بِل کئی سال تک سینیٹ میں زیر بحث رہا، اسے اسلامی نظریاتی کونسل کے سپرد کیا گیا، جس نے تفصیل کے ساتھ جائزہ لے کر اس کی نوک پلک سنواری اور اس کی دفعات کی درجہ بندی کر کے اسے آئینی ترامیم اور قانونی دفعات کی صورت میں از سر نو مرتب کیا۔ سینیٹ کی قائمہ کمیٹی نے اس کا جائزہ لیا اور اسے اپنے طور پر ایک نئی شکل دی، جبکہ متحدہ شریعت محاذ نے بھی تمام اعتراضات و شکوک کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں اصلاحات و ترامیم تجویز کیں۔ دینی حلقوں میں سے ابتدا میں جمعیۃ علماء اسلام فضل الرحمٰن گروپ اور تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ نے اس کی مخالفت کی، لیکن بعد میں مولانا فضل الرحمٰن نے اس کی حمایت کا اعلان کیا اور راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل میں شریعت بِل کی تائید میں ہونے والی کل جماعتی کانفرنس کی ایک نشست کی صدارت کرتے ہوئے اس بل کی حمایت کا اعلان کیا۔ فلیش مین ہوٹل کی اس کانفرنس میں میاں نواز شریف نے بھی شرکت کی، جو اس وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے۔

چنانچہ ایک طویل جدوجہد اور کشمکش کے بعد سینیٹ نے اس بل کو منظور کر لیا، لیکن پارلیمانی ضوابط کے مطابق سینیٹ سے منظور ہونے کے بعد نوے روز کے اندر اس شریعت بِل نے قومی اسمبلی میں پیش ہو کر منظوری حاصل کرنا تھی اور اس کے بعد اسے دستوری حیثیت ملنا تھی، مگر نوے روز کی مدت کے اندر قومی اسمبلی توڑ دی گئی، جس کی وجہ سے یہ شریعت بل سینیٹ میں منظور ہو جانے کے باوجود قومی اسمبلی میں بروقت پیش نہ ہوسکنے پر از خود ختم ہو گیا۔ نئے انتخابات کے بعد میاں نواز شریف کی حکومت قائم ہوئی تو ان پر مختلف اطراف سے دباؤ تھا کہ وہ اس شریعت بِل کو قومی اسمبلی میں لائیں۔ چنانچہ ان کے دور میں یہ شریعت بِل قومی اسمبلی میں لایا گیا اور باقاعدہ طور پر قومی اسمبلی نے اسے منظور کیا، مگر اس میں قرآن وسنت کی بالادستی کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا گیا کہ اس سے "سیاسی نظام اور حکومتی ڈھانچہ" متاثر نہیں ہو گا۔......

اسلامی شریعت کی تعبیر وتشریح: علمی وفکری سوالات

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ۔اکتوبر ۲۰۰۸ء)

(محمد عمار خان ناصر کی تصنیف ''حدود وتعزیرات: چند اہم مباحث''
کے دیباچہ کے طور پر لکھا گیا۔)

نحمده تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آله واصحابه واتباعه اجمعین۔

مسلم ممالک میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور اسلامی احکام وقوانین کی عمل داری کا مسئلہ جہاں اپنی نوعیت واہمیت کے حوالے سے ہمارے ملی فرائض اور دینی ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے، وہاں اس کی راہ میں حائل متنوع مشکلات اور رکاوٹوں کے باعث وہ ایک چیلنج کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور مسلم معاشروں میں اس سے نمٹنے کے لیے مختلف اطراف سے کوششیں جاری ہیں۔

ان مشکلات اور رکاوٹوں میں سیاسی، تہذیبی، اقتصادی اور عسکری امور کے ساتھ ساتھ یہ علمی رکاوٹ بھی نفاذ اسلام کی راہ روکے کھڑی ہے کہ آج کے بین الاقوامی حالات اور جدید عالمی تہذیبی ماحول میں اسلامی احکام وقوانین کی مقامی وبین الاقوامی سطح پر تطبیق کی عملی صورتیں کیا ہوں گی، اور گلوبلائزیشن کی اس فضا میں جبکہ دنیا کی کوئی قوم دوسری اقوام کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور اقوام عالم میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے اور ایک دوسرے کا اثر قبول کرنے کا دائرہ دن بدن وسیع اور ناگزیر ہوتا جارہا ہے، اسلامی احکام وقوانین کی اس کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کی قابلِ قبول اور قابلِ عمل شکل کیا ہوسکتی ہے؟

مسلم ممالک میں اس حوالے سے تین رجحانات عام طور پر پائے جاتے ہیں اور ان کے درمیان امتیاز بلکہ کشاکش دن بدن واضح ہوتی جارہی ہے:

- آج کے عالمی ماحول، جدید ثقافتی فضا اور بین الاقوامی مطالبات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے اسلامی احکام وقوانین کو اس علمی ورثے اور فقہی ذخیرے کی بنیاد پر بالکل اسی طرح نافذ کردیا

جائے جس طرح وہ ترکی کی خلافت عثمانیہ اور جنوبی ایشیا کی مغل سلطنت میں نافذ تھے اور جن کی اس وقت تک کی ارتقائی شکل ہمارے پاس "مجلة الاحكام العدليه" اور "فتاویٰ عالمگیری" کی صورت میں موجود ہے۔

- اس علمی ورثے اور فقہی ذخیرے کو ایک طرف رکھتے ہوئے جدید عالمی تقاضوں اور بین الاقوامی مطالبات کو سامنے رکھ کر قرآن و سنت بلکہ بعض حلقوں کے نزدیک صرف قرآن کریم کی بنیاد پر نئی فقہ تشکیل دی جائے اور اسے مسلم ممالک میں قانون سازی کی اساس قرار دیا جائے۔
- گزشتہ چودہ سو سال کے علمی ورثے اور فقہی ذخیرے سے ترک تعلق اور اس سے براءت کا اظہار کرنے کی بجائے اسی کی بنیاد پر اور اس کے مسلمہ اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے نئے مسائل کا حل تلاش کیا جائے، جدید قانون سازی کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے اور جن بین الاقوامی مطالبات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی عملی صورتیں اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے نکالی جا سکتی ہیں، ان سے گریز نہ کیا جائے۔

پورے عالم اسلام میں ان تین حوالوں سے علمی کام جاری ہے اور ہر حلقہ اپنی سوچ کو آگے بڑھانے کے لیے تگ و تاز میں مصروف ہے۔ راقم الحروف خود کو اس تیسرے حلقے میں شمار کرتا ہے اور پورے شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ پہلی دونوں صورتیں غیر متوازن اور غیر عملی ہیں، اس لیے کہ نہ تو یہ ممکن ہے کہ ہم آج کے عالمی ماحول کو کلیتاً نظر انداز کر دیں اور جدید بین الاقوامی تمدنی تقاضوں سے آنکھیں بند کرتے ہوئے دو سو سال قبل کے اجتہادی فیصلوں اور عمل کو آج کے لیے بھی مکمل طور پر واجب العمل قرار دے دیں، اور نہ ہی یہ ہو سکتا ہے کہ ہم امتِ مسلمہ کے چودہ سو سالہ اجماعی تعامل، فقہائے امت کی علمی کاوشوں اور دنیا بھر کے مسلم معاشروں میں اسلامی احکام و قوانین کی حکمرانی کے کم و بیش ایک ہزار سالہ تسلسل کو بین الاقوامیت کے جدید ماحول کی بھینٹ چڑھاتے ہوئے قرآن کریم یا قرآن و سنت کی نئی تعبیر و تشریح کرنے بیٹھ جائیں، کیونکہ ایسا کوئی بھی عمل مسلمہ اسلامی اصولوں کے منافی ہونے کے ساتھ ساتھ امتِ مسلمہ کی غالب ترین اکثریت کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں ہوگا اور اس کا عملی نتیجہ مسیحیت میں مارٹن لوتھر کی پراٹسٹنٹ تحریک کی طرح سوسائٹی کو دین سے کلیتاً لاتعلق کر دینے کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوگا۔ اس لیے راقم الحروف کے نزدیک اسلامی قوانین و

احکام کی تعبیر وتشریح کے لیے صحیح، قابلِ عمل اور متوازن راستہ یہ ہے کہ:

- امتِ مسلمہ کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کے دائرہ کی بہرحال پابندی کی جائے۔
- امتِ مسلمہ کی غالب اکثریت کی فقہی وابستگیوں کا احترام کرتے ہوئے ہر ملک میں وہاں کی اکثریت کے فقہی رجحانات کو قانون سازی کی بنیاد بنایا جائے، البتہ قانون سازی کو صرف اسی دائرے میں محدود رکھنے کی بجائے دوسری فقہوں سے استفادہ یا بوقت ضرورت قرآن و سنت سے براہ راست استنباط کا دروازہ بھی کھلا رکھا جائے۔ مثلاً انڈونیشیا میں شوافع کی اکثریت ہے تو اس اکثریت کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ ان کے ملک میں قانون سازی کی بنیاد فقہ شافعی پر ہو، کیونکہ یہ ایک اصولی اور معقول بات ہونے کے علاوہ وہاں کی اکثریتی آبادی کا جمہوری حق بھی ہے۔
- جدید عالمی ثقافتی ماحول اور گلوبلائزیشن سے پیدا ہونے والے مسائل اور بین الاقوامی مطالبات اور تقاضوں کو نہ تو حق اور انصاف کا معیار تصور کیا جائے کہ ہم ہر تقاضے کے سامنے سپر انداز ہوتے چلے جائیں اور اس کے لیے اسلامی اصولوں اور احکام سے دست برداری یا ان کی مغرب کے لیے قابلِ قبول توجیہ وتعبیر ہی ہماری علمی کاوشوں کا ہدف بن کر رہ جائے، اور نہ ہی ہم انہیں یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نفاذِ اسلام کے لیے اپنی پیشرفت کا راستہ خود ہی روکے کھڑے رہیں۔ بلکہ جن مطالبات اور تقاضوں کو ہم قرآن و سنت کی تعلیمات، اہل سنت کے علمی مسلمات اور اجتہاد شرعی کے دائرے میں قبول کر سکتے ہیں انہیں کھلے دل سے قبول کریں، اور جو امور قرآن و سنت کی نصوص صریحہ اور اجتہاد شرعی کے مسلمہ اصولوں سے متصادم ہوں ان کے بارے میں کسی قسم کا معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیے بغیر پوری دلجمعی کے ساتھ ان پر قائم رہیں۔

اس پس منظر میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذِ شریعت اور اسلامی قوانین واحکام کی تعبیر وتشریح کے حوالے سے مختلف اطراف میں جو کام ہو رہا ہے، اس کے بارے میں بھی کچھ اصولی گزارشات ضروری سمجھتا ہوں:

۱. صرف قرآن کریم کو قانون سازی کی بنیاد بنانا اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو قانون سازی

کا ماخذ تسلیم نہ کرنا قطعی طور پر نا قابلِ قبول اور خود قرآنی تعلیمات کے منافی ہے۔

۲. سنت رسول سے مراد وہی ہے جو امتِ مسلمہ چودہ سو سال سے اس کا مفہوم سمجھتی آ رہی ہے اور اس سے ہٹ کر سنت کا کوئی نیا مفہوم طے کرنا اور جمہور امت میں اب تک سنت کے متوارث طور پر چلے آنے والے مفہوم کو مسترد کر دینا بھی عملاً سنت کو اسلامی قانون سازی کا ماخذ تسلیم نہ کرنے کے مترادف ہے۔

۳. ایک رجحان آج کل عام طور پر یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سنت مستقل ماخذ قانون نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ثانوی ہے، اور قرآن کریم کے ساتھ اس کی مطابقت کی صورت میں ہی اسے احکام و قوانین کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ بظاہر بہت خوبصورت بات ہے لیکن اس صورت میں اصل اتھارٹی سنت نہیں بلکہ مطابقت تسلیم کرنے یا نہ کرنے والے کا ذہن قرار پاتا ہے کہ وہ جس سنت کو قرآن کریم کے مطابق سمجھ لے وہ قانون کی بنیاد بن سکتی ہے، اور جس سنت کو اس کا ذہن قرآن کریم کے مطابق قرار نہ دے وہ احکام و قوانین کی بنیاد نہیں بن سکتی۔

یہاں ایک بات یہ بھی مغالطہ کا باعث بنتی ہے کہ قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں مطابقت کے لیے عقل عام کو معیار تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ قرین قیاس ہو جاتا ہے، مگر یہ سراسر مغالطہ ہے، اس لیے کہ عقل عام کی بنیاد میسر معلومات، مشاہدات اور تجربات پر ہوتی ہے جن کے دائرے زمان و مکان دونوں حوالوں سے تغیر پذیر رہتے ہیں، اس لیے عقل عام کو قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح یا ان کے درمیان تطبیق و توفیق کا حتمی معیار قرار دینے کا مطلب قرآن و سنت کو کسی ایک دور یا علاقہ کی عقل عام کا پابند بنا دینے یا ہر زمانہ اور علاقہ کے لیے الگ الگ تعبیر و تشریح کا دروازہ کھول دینے کے مترادف ہوگا، اس لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ سنت کو ثانوی درجہ کا ماخذ قانون قرار دینے کی بجائے اسلامی قانون سازی کا مستقل ماخذ اور قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کا حتمی معیار تسلیم کیا جائے، جیسا کہ حضرات صحابہ کرامؓ کے دور میں ہوتا تھا اور اسی پر امتِ مسلمہ کا اجماعی تعامل چلا آ رہا ہے۔

البتہ ان حدود کی پابندی کی یہ بات فیصلہ کے مراحل کی ہے اور میرے نزدیک علامہ محمد اقبالؒ کی طرف سے قانون سازی کے لیے منتخب پارلیمنٹ کو حتمی اتھارٹی قرار دینے کی تجویز کا ایک افادی پہلو یہ

بھی ہے کہ رائے عامہ کو مسترد کر کے کسی ایک گروہ کی رائے کو مسلط کر دینے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں جس کا تجربہ ہم پاکستان میں اس طرح کر چکے ہیں کہ ہمارے ہاں ایک عرصہ تک سنتِ نبویؐ کو نظر انداز کر کے صرف قرآن کریم کو قانون سازی کا ماخذ قرار دینے کی تحریک چلتی رہی اور اس کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بہت محنت کی گئی، لیکن جب عوام کی منتخب دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۷۳ء میں قانون سازی کی دستوری بنیادیں طے کیں تو اس کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ موجود نہیں تھا کہ وہ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے قرآن و سنت، دونوں کو قانون سازی کی بنیاد کے طور پر تسلیم کرے، بلکہ اگر کسی معاملے میں پارلیمنٹ نے بھی عوام کی جمہوری رائے اور رجحانات کو نظر انداز کیا ہے تو رائے عامہ نے اسے قبول نہیں کیا، جیسا کہ مروجہ عائلی قوانین کو اگرچہ پارلیمنٹ نے قبول کر رکھا ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی قرآن و سنت سے متصادم شقوں کے بارے میں آج بھی عوام کی غالب اکثریت اپنے سابقہ رجحانات پر قائم ہے اور ذہنی طور پر انہیں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اس لیے مجھے اس بارے میں کوئی شبہہ یا پریشانی نہیں ہے کہ جب بھی حتمی فیصلہ کا مرحلہ آئے گا، عوام کے جمہوری اور اکثریتی رجحانات کو نظر انداز کر دینا کسی کے بس میں نہیں ہو گا اور نہ ہی ان سے ہٹ کر کیا جانے والا کوئی فیصلہ امتِ مسلمہ کو باور کرایا جا سکے گا، البتہ کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے علمی بحث و مباحثہ کا میدان محدود نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی ماضی میں اہلِ علم کے ہاں اس کا دائرہ کبھی تنگ رہا ہے۔ ہماری علمی روایت یہ چلی آ رہی ہے کہ کسی بھی مسئلہ پر بحث و مباحثہ ہمیشہ کھلے دل و دماغ سے کیا گیا ہے، مسئلہ کے ہر پہلو پر بات ہوئی ہے، تجزیہ و تنقیح کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا اور استدلال و استنباط کی کوئی گنجائش ادھوری نہیں رہنے دی گئی، کیونکہ جس طرح کسی مقدمے میں صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے تفتیش کے کسی امکانی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح کسی علمی مسئلے میں صحیح نتیجے تک رسائی کے لیے اس کے تمام امکانی پہلوؤں کو کھنگالنا بھی ضروری ہوتا ہے اور اسی وجہ سے میں اہلِ علم میں بحث و مباحثہ کے لیے کھلے ماحول کو پسند کرتا ہوں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہوں۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے جب حدود و تعزیرات کے حوالے سے اپنی کاوش اس کتابچہ کی صورت میں پیش کی جو اسلامی نظریاتی کونسل نے شائع کیا ہے تو مجھے اس کے تمام مندرجات سے اتفاق نہیں تھا، لیکن اس نوعیت کے مسائل میں علمی بحث و مباحثہ کے کھلے ماحول کو میں نے ہمیشہ نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ اسے ضروری بھی سمجھتا ہوں، جیسا کہ مجھ سے مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ

کے ''خطبہ اجتہاد'' کے بارے میں پوچھا جاتا ہے تو میرا جواب یہ ہوتا ہے کہ بطور موقف اور فیصلے کے میں اسے قبول نہیں کرتا، لیکن بحث ومباحثہ کی بنیاد اور ایجنڈے کے طور پر اس کا احترام کرتا ہوں اور اس میں اٹھائے گئے نکات پر سنجیدہ علمی بحث ومباحثہ کی حمایت کرتا ہوں۔

آج کے نوجوان اہلِ علم جو اسلام کے چودہ سو سالہ ماضی اور جدید گلوبلائزیشن کے ثقافتی ماحول کے سنگم پر کھڑے ہیں، وہ نہ ماضی سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور نہ مستقبل کے ناگزیر تقاضوں سے آنکھیں بند کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اس کوشش میں ہیں کہ ماضی کے علمی ورثہ کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے قدیم وجدید میں تطبیق کی کوئی قابلِ قبول صورت نکل آئے۔ مگر انہیں دونوں جانب سے حوصلہ شکنی کا سامنا ہے اور وہ بیک وقت 'قدامت پرستی' اور 'تجدد پسندی' کے طعنوں کا ہدف ہیں۔ مجھے ان نوجوان اہلِ علم سے ہمدردی ہے، میں ان کے دکھ اور مشکلات کو سمجھتا ہوں اور ان کی حوصلہ افزائی کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھتا ہوں، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ امت کے اجماعی تعامل اور اہل السنۃ والجماعۃ کے علمی مسلمات کا دائرہ کراس نہ ہو، کیونکہ اس دائرے سے آگے بہر حال گمراہی کی سلطنت شروع ہو جاتی ہے۔

عزیزم حافظ محمد عمار خان ناصر سلمہ نے اسی علمی کاوش کا سلسلہ آگے بڑھایا ہے اور زیادہ وسیع تناظر میں حدود وتعزیرات اور ان سے متعلقہ امور ومسائل پر بحث کی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے ہر پہلو سے اتفاق کیا جائے، البتہ اس علمی کاوش کا یہ حق ضرور بنتا ہے کہ اہلِ علم اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیں، بحث ومباحثہ کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر اظہارِ خیال کریں اور جہاں کوئی غلطی محسوس کریں، اسے انسانی فطرت کا تقاضا تصور کرتے ہوئے علمی مواخذہ کا حق استعمال کریں تاکہ صحیح نتیجے تک پہنچنے میں ان کی معاونت بھی شامل ہو جائے۔

میں دعاگو ہوں کہ اللہ رب العزت عزیزم عمار سلمہ کی اس کاوش کو حق تک رسائی کا ذریعہ بنائیں اور آج کے دور میں نفاذ اسلام کے حوالے سے درپیش علمی وفکری چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے ہم سب کو اپنا اپنا کردار صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

وفاقی وزیر مذہبی امور کی وضاحت کا خیر مقدم

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۲۰۰۸ء)

روزنامہ اسلام لاہور ۱۹ نومبر ۲۰۰۸ء میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق وفاقی وزیر مذہبی امور صاحبزادہ سید حامد سعید کاظمی نے قومی اسمبلی میں مولانا عطاء الرحمٰن اور صاحبزادہ حاجی فضل کریم کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراض پر کہا ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف ملک میں کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا، اور اسلامی نظریاتی کونسل نے حال ہی میں نکاح وطلاق کے قوانین میں جن ترامیم کی سفارش کی ہے انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کی تکمیل کے بعد کونسل میں ہی نظر ثانی کے لیے دوبارہ پیش کیا جائے گا۔ اس سے قبل اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے عائلی قوانین میں بارہ نئی ترامیم کی سفارش کی ہے جن میں:

۱۔ عورت کی طرف سے طلاق کے مطالبہ پر خاوند کو ۹۰ دن کے اندر طلاق دینے کا پابند بنانے،

۲۔ اور رجسٹرڈ کرائے بغیر زبانی طلاق کو مؤثر تسلیم نہ کرنے کی سفارش بھی شامل ہے۔

اس پر ملک بھر میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام نے شدید احتجاج کیا ہے اور اسلامی نظریاتی کونسل کی ان سفارشات کو قرآن وسنت کے صریح احکام کے منافی قرار دیا ہے۔ جبکہ ۲۰ نومبر کو روزنامہ پاکستان لاہور میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے ڈائریکٹر جنرل ریسرچ ڈاکٹر سید ناصر زیدی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ کونسل کی یہ سفارشات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کی گئی ہیں اور ان پر نظر ثانی نہیں کی جائے گی۔ اخباری خبروں کے مطابق دستوری طور پر اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان کی تعداد بیس تک ہو سکتی ہے جبکہ اس وقت اس کے صرف ۹ ارکان ہیں اور ملک کے مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام میں سے کوئی معروف نام اس میں شامل نہیں ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی موجودہ ہیئت کے بارے میں دینی حلقے اس سے قبل بھی تحفظات کا اظہار کر چکے ہیں، خاص طور پر حدود آرڈیننس میں "تحفظ حقوق نسواں ایکٹ" کے نام سے کی جانے والی ترامیم کے حوالہ سے کونسل کی کارکردگی ملک کے دینی حلقوں میں متنازعہ سمجھی گئی ہے۔ اور اس حوالہ

سے دینی جماعتوں کا اعتراض چلا آرہا ہے کہ کونسل کے موجودہ ارکان ملک کے عوام اور دینی حلقوں کی غالب اکثریت کے دینی رجحانات اور مسلمات کو نظر انداز کر کے دینی احکام کے بارے میں اپنی خود ساختہ تعبیرات وتشریحات کو ملک پر مسلط کرنے کے درپے ہیں اور اس کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کا دستوری فورم استعمال کر رہے ہیں۔

وفاقی وزیر مذہبی امور صاحبزادہ سید حامد سعید کاظمی نے قومی اسمبلی میں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل میں جید علماء کرام کو شامل کر کے اسے مکمل کیا جائے گا اور اس کے بعد ان سفارشات کو نظر ثانی کے لیے دوبارہ کونسل میں لایا جائے گا۔ ہم وفاقی وزیر مذہبی امور کی اس وضاحت اور یقین دہانی کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کے موجودہ ارکان اور چیئرمین سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ کسی مسئلہ پر سفارشات مرتب کرتے ہوئے ملک کے عام مسلمانوں اور دینی حلقوں کے مسلمات کو ملحوظ رکھیں اور اپنی ذاتی تعبیرات وتشریحات کے لیے کونسل کا فورم استعمال کرنے سے گریز کریں کیونکہ اس سے بے اعتمادی اور خلفشار میں اضافہ ہوتا ہے اور دینی مسلمات سے انحراف کا راستہ کھلتا ہے۔

طلاق کا حق۔ دین اسلام کیا کہتا ہے؟

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۱۳ تا ۱۵ دسمبر ۲۰۰۸ء)

اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک حالیہ سفارش ملک کے علمی حلقوں میں زیر بحث ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ خلع کو عورت کا مساوی حقِ طلاق قرار دیا جائے اور یہ قانون بنا دیا جائے کہ اگر عورت خاوند سے طلاق کا تحریری مطالبہ کرے تو خاوند ۹۰ روز کے اندر اسے طلاق دینے کا پابند ہوگا، اور اگر وہ اس دوران طلاق نہ دے تو ۹۰ روز گزر جانے پر طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی۔ ملک کے دینی حلقے عمومی طور پر اسے قرآن و سنت کے منافی قرار دے رہے ہیں جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل کے بعض ارکان اور ان کے ساتھ ملک کے بعض دانشور اس کا دفاع کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ یہ سفارش قرآن و سنت کے منافی نہیں بلکہ اس کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

یہ مسئلہ نیا نہیں ہے، بلکہ جب سے مغرب نے مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات کا نعرہ لگا کر مرد اور عورت کے درمیان فطری امتیازات کو مصنوعی طریقے سے ختم کرنے کی کوشش شروع کر رکھی ہے تب سے ہمارے ہاں بھی یہ آواز مسلسل اٹھ رہی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات قائم کی جائے، اور جہاں جہاں مردوں اور عورتوں کے لیے قواعد و ضوابط اور قوانین میں کوئی فرق اور امتیاز پایا جاتا ہے اسے ختم کر دیا جائے، حتیٰ کہ قرآن و سنت کے جو احکام اس حوالہ سے امتیازی سمجھے جا رہے ہیں ان میں ترامیم کر کے انہیں بھی مغرب کے اس فلسفہ کے مطابق بنایا جائے کہ مرد اور عورت کے درمیان کسی بھی معاملے میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔

یہ مسئلہ صرف پاکستان میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہے۔ دنیا کے ہر مسلمان ملک میں آپ یہی صورتحال دیکھیں گے کہ ایسے قوانین و احکام کو جنہیں مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کے قوانین کہا جاتا ہے ختم کرنے یا ان میں ترامیم کرنے کے مطالبات کیے جا رہے ہیں۔ جبکہ ہر جگہ کے دینی حلقے اور علمی مراکز اس کی مزاحمت کرتے ہوئے قرآن و سنت کے احکام میں کوئی تبدیلی قبول کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ ہمارے ہاں صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں جب عائلی قوانین نافذ ہوئے تو اس مقصد کے لیے بہت سے شرعی احکام میں رد و بدل کیا گیا اور عورت کو طلاق کا حق دینے کے

بارے میں یہ طریق کار اختیار کیا گیا کہ نکاح نامے کے فارم میں ایک خانے کا اضافہ کر دیا گیا کہ:

"کیا خاوند نے عورت کو طلاق کا حق تفویض کر دیا ہے؟"

یہ خانہ دنیا میں عورت کو طلاق کا حق دلانے کا تاثر قائم کرنے کے لیے بڑھایا گیا اور اسلامی فقہ میں اس کی کسی حد تک گنجائش بھی موجود ہے لیکن نصف صدی کے لگ بھگ عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ تصور پاکستان کے عوام میں قبولیت حاصل نہیں کر سکا۔ چنانچہ شاید ایک فیصد نکاحوں میں اسے سنجیدگی سے لیا جاتا ہو ورنہ عام طور پر اس خانہ میں ہاں یا ناں لکھنے کی ذمہ داری نکاح رجسٹرار ہی فریقین میں سے کسی کو پوچھے بغیر سرانجام دے دیتا ہے۔ میں جب بھی کسی کا نکاح پڑھاتا ہوں بڑی دلچسپی سے نکاح رجسٹرار کو یہ خانہ پر کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ مجھے نہیں یاد کہ گزشتہ تیس برس کے دوران میں نے کسی نکاح رجسٹرار کو اس خانے کے بارے میں دونوں فریقوں میں سے کسی سے دریافت کرتے دیکھا ہو۔ وہ خود ہی اس پر کراس کا نشان لگاتے ہوئے آگے گزر جاتا ہے اور فریقین میں سے کوئی بھی اس پر اعتراض نہیں کرتا حالانکہ دونوں فریق اپنے سامنے نکاح نامہ پر کراتے اور اس پر دستخط بھی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں اس خانے کی موجودگی کا علم نہیں ہوتا بلکہ وہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے بھی صرف اس لیے چشم پوشی کر جاتے ہیں کہ ان کے ذہنوں میں نکاح وطلاق کا جو تصور شرعی طور پر موجود ہے اور ان کے علاقائی کلچر میں نکاح وطلاق کا جو ڈھانچہ صدیوں سے قائم چلا آرہا ہے اس میں یہ خانہ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لیے ان کے نزدیک اس خانے کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہتی اور میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ نکاح وطلاق کے نظام میں ایک ایسی جزوی تبدیلی جس کی فقہی طور پر گنجائش بھی موجود ہے اس ملک کے عوام کے دلوں میں جگہ حاصل نہیں کر پا رہی تو ہمارے بہت سے دانشوروں نے قرآن و سنت کے صریح احکام سے متصادم تبدیلیوں کو پاکستان کے مسلمانوں سے قبول کرانے کی توقعات آخر کس طرح وابستہ کر رکھی ہیں؟

نکاح کے فارم میں "تفویضِ طلاق" کے اس خانے کے اضافے کو نصف صدی بعد مکمل طور پر ناکام ہوتا ہوا دیکھ کر ہمارے بعض دانشوروں نے پینترا بدلا ہے اور خلع کو عورت کا مساوی حق طلاق قرار دینے کی مہم شروع کر دی ہے جس کا ایک مرحلہ اسلامی نظریاتی کونسل کی حالیہ سفارش بھی ہے۔ اسلام میں طلاق اور خلع کی حیثیت کیا ہے اور ان کے حوالے سے مرد اور عورت کے حقوق و اختیارات کا دائرہ کیا ہے؟ اس پر گفتگو سے پہلے ہم چند اصولی باتیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنا

چاہتے ہیں۔ مثلاً:

۱. اجتہاد کا شرعی مفہوم کیا ہے؟
۲. مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا قیام کہاں تک قابلِ عمل ہے؟
۳. اسلامی نظریاتی کونسل کی حدود کار کیا ہیں؟
۴. اور ان حوالوں سے پاکستان کے زمینی حقائق اور صورتحال کا منظر کیا ہے؟

اجتہاد کا شرعی مفہوم

اجتہاد کی بات اس لیے کہ قرآن وسنت کے احکام میں ترامیم کے یہ سارے مطالبات اجتہاد ہی کے نام پر کیے جا رہے ہیں۔ بلکہ ہمارے بعض فاضل دوست تو ''روایتی اسلام'' اور ''اجتہادی اسلام'' کو آمنے سامنے کھڑا کر کے ان کے درمیان کوئی معرکہ بپا کرنے کے موڈ میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے یہ مغالطہ پہلے مرحلے ہی میں دور ہو جانا چاہیے کہ اجتہاد کا شرعی مفہوم کیا ہے اور ہمارے ان دوستوں نے اجتہاد کا کون سا تصور اپنے ذہنوں میں بٹھا رکھا ہے؟

اس سلسلہ میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اجتہاد اور روایت میں کوئی تعارض یا مقابلہ نہیں بلکہ یہ دونوں چودہ سو سال سے ساتھ ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور سے مسلسل یہ صورتحال ہے کہ روایت کرنے والے روایت کر رہے ہیں اور اجتہاد کرنے والے انہی روایات کی بنیاد پر اجتہاد کا عمل جاری رکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو روایت بھی کرتے ہیں اور خود ہی ان کے حوالے سے اجتہاد بھی کرتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیجئے جنہیں امت کے مجتہدین کا سرخیل سمجھا جاتا ہے، وہ اجتہاد کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ روایت بھی کرتے ہیں اور اجتہاد میں روایت ہی کو بنیاد بناتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاں روایت کو قبول کرنے کا معیار دوسروں سے قدرے سخت ہے لیکن اس کا مطلب روایت کی نفی نہیں، ان کے سینکڑوں اجتہادات اور فتاویٰ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جن کی بنیاد روایت پر ہے۔ اس لیے یہ تصور انتہائی گمراہ کن ہے کہ روایت اور درایت، یا روایت اور اجتہاد ایک دوسرے کے مقابل کی چیزیں ہیں۔ روایت کی دنیا میں اصول استناد کے حوالے سے سب سے بلند مقام امام بخاریؒ کو دیا جاتا ہے لیکن وہ صرف روایت نہیں کرتے بلکہ ہر روایت کے ساتھ اجتہاد بھی کرتے ہیں اور درایت کا دامن مسلسل تھامے ہوئے ہیں۔

ہمارے ہاں روایت اور درایت، یا روایت اور اجتہاد کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کرنے کا تصور یورپ میں مسیحیت کے مذہبی ڈھانچے کے خلاف پروٹسٹنٹ انقلاب کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے اور ہمارے بہت سے دانشور آنکھیں بند کر کے اسی لکیر کو پیٹتے چلے جا رہے ہیں۔ یورپ میں بائبل کی تعبیر و تشریح اور شرعی احکام کے تعین و وضاحت میں فائنل اتھارٹی پاپائے روم اور چرچ کو حاصل تھی جس کے خلاف مارٹن لوتھر اور ان کے رفقاء نے بغاوت کی اور اسے مسترد کرتے ہوئے یہ تصور دیا کہ بائبل کی تعبیر و تشریح ''کامن سینس'' کی بنیاد پر ہر مسیحی کا حق ہے اور اس پر پوپ یا چرچ کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے۔ اس کشمکش میں پوپ اور چرچ کی تعبیرات و تشریحات نے روایت کا عنوان اختیار کر لیا جبکہ کامن سینس کو درایت کا نام دے دیا گیا اور ان دونوں کے درمیان معرکہ آرائی کا بازار گرم ہو گیا۔

ہمارے ہاں اس کی پیروی سب سے پہلے اکبر بادشاہ نے کی اور اسلام کے فقہی ذخیرے کو تقلیدی اور روایتی اسلام قرار دے کر مسترد کرتے ہوئے ''اجتہاد مطلق'' کے نام سے اسلامی عقائد و احکام کی تشکیلِ نو (ری کنسٹرکشن) کا کام کر ڈالا۔ لیکن اسے مکمل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اس کے بعد بھی ہمارے معاشرے میں جس شخص یا گروہ نے یہ راستہ اختیار کیا آج تک اسے کامیابی اور قبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے والے دوست یورپ کے پس منظر اور مسلمانوں کے پس منظر میں فرق کو محسوس کرنے اور ملحوظ رکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرما رہے۔ ایک پنجابی محاورے کے مطابق پڑوسیوں کا منہ سرخ دیکھ کر اپنا منہ تھپڑ مار مار کر سرخ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ میں مارٹن لوتھر کی اس تحریک کا جواز اور اس کی کامیابی کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسیحیت کے پاس آسمانی تعلیمات کا کوئی مستند، محفوظ اور متفقہ متن موجود نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ جس کی وجہ سے خدا کی منشا بیان کرنے، بائبل کی حتمی تعبیر کرنے اور شرعی احکام و قوانین کے تعین میں پوپ اور چرچ کو فائنل اتھارٹی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور یہ اتھارٹی دلیل کی نہیں بلکہ شخصیت کی تھی۔ اسی طرح پوپ کو مسیحیت میں ''خدا کے نمائندے'' کا مقام حاصل ہے کہ وہ جو بات کرتا ہے خدا کی طرف سے کرتا ہے اس لیے اس کی کسی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

اسلام میں یہ صورتحال دونوں حوالوں سے موجود نہیں ہے، اس لیے کہ ہمارے پاس قرآن کریم کا مستند، محفوظ اور متفقہ متن موجود ہے۔ اس کی تعبیر و تشریح میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات واعمال، بلکہ صحابہ کرامؓ کا تعامل بھی مکمل استناد اور اعتماد کے ساتھ موجود ومحفوظ ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں کسی بڑے سے بڑے مجتہد اور امام کو بھی کوئی بات کرنا ہوتی ہے تو اسے اس کے لیے ان میں سے کوئی دلیل پیش کرنا پڑتی ہے اور کوئی حوالہ دینا ہوتا ہے، بلکہ دلائل اور حوالوں کے انبار میں سے اپنے موقف کا ثبوت فراہم کرنا پڑتا ہے۔ پھر ان میں سے کسی کو ''خدا کا نمائندہ'' ہونے کی سند حاصل نہیں ہے جیسا کہ خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کسی نے ''خدا کا خلیفہ'' کہہ کر خطاب کیا تو انہوں نے اسے فوراً یہ کہہ کر ٹوک دیا کہ میں خدا کا نہیں بلکہ رسول اللہؐ کا خلیفہ ہوں۔ جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مجھے خدا کی نمائندگی کے نام پر شخصی اتھارٹی حاصل نہیں بلکہ میں جناب رسول اللہؐ کے نمائندے کے طور پر ان کی تعلیمات وارشادات کا پابند ہوں۔

چنانچہ ہمارے ہاں دینی تعبیرات کا نظام پاپائے روم کی طرح شخصی اور صوابدیدی نہیں بلکہ اس کی بنیاد قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے معلوم اور محفوظ ذخیرے اور دلیل واستدلال پر ہے۔ اس لیے اسے یورپ کی مسیحیت پر قیاس کرنا اور اسے مسترد کرنے کے لیے مارٹن لوتھر طرز کی تحریک کے راستے نکالنا مسئلہ کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اسی وجہ سے ایسی کسی کوشش کو اکبر بادشاہ سے لے کر اب تک مسلم معاشرہ میں پذیرائی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ پھر مارٹن لوتھر کی ایک اور مجبوری یہ بھی تھی کہ چرچ اور پاپائے روم کی اتھارٹی اور صوابدیدی اختیارات کو مسترد کرنے کے بعد اس کے پاس کوئی متبادل علمی بنیاد اور ذخیرہ موجود نہیں تھا جس کے ذریعے وہ بائبل کی تعبیر وتشریح کا کوئی ''علمی ڈھانچہ'' تشکیل دیتا۔ اسی وجہ سے اسے بائبل کی تعبیر وتشریح کے لیے ''کامن سینس'' کو بنیاد قرار دینا پڑا اور اس کا یہ نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ مسیحیت کا فکری شیرازہ منتشر ہو کر رہ گیا ہے۔

''کامن سینس'' بہت اچھی چیز ہے اور بہت سے معاملات طے کرنے کے لیے اچھی بنیاد ہے۔ لیکن یہ کوئی ایک جگہ ٹھہرنے والی چیز تو نہیں ہے۔ یہ میسر معلومات ومشاہدات اور معلوم تجربات و تاثرات کی بنیاد پر سوسائٹی کی اجتماعی سوچ کے تعین اور اظہار کا بہترین ذریعہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جوں جوں معلومات، مشاہدات، تجربات اور تاثرات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، کامن سینس کے ذریعے قائم ہونے والی رائے بھی تبدیل ہوتی جائے گی۔ اگر انسانی معلومات ومشاہدات کو کسی ایک جگہ قرار نہیں ہے تو ان کی بنیاد پر تشکیل پانے والی رائے کو کسی ایک مقام پر کیسے روکا جا سکتا ہے؟ اس کا

دائرہ زمانے کے لحاظ سے بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے اور علاقے کے حوالے سے بھی مختلف ہوتا ہے۔ ایک بات آج سے ایک سو سال قبل معیوب سمجھی جاتی تھی مگر آج وہ معیوب نہیں رہی۔ ایک بات امریکہ میں عام طور پر ناپسندیدہ نہیں سمجھی جاتی مگر پاکستان یا چین کا معاشرہ اسے پسند نہیں کرتا۔ چنانچہ نہ تو ایک زمانے کی کامن سینس کو دوسرے زمانے کے لیے معیار قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ایک علاقے کی کامن سینس کو دوسرے علاقے پر ٹھونسا جاسکتا ہے۔ خود مغرب میں دیکھ لیں کہ:

- نصف صدی قبل تک شادی کے بغیر مرد اور عورت کے اکٹھا رہنے کو معیوب اور بداخلاقی تصور کیا جاتا تھا، مگر اب یہ بات وہاں کے ''معروفات'' میں شامل ہے۔
- ہم جنس پرستی کو اب سے نصف صدی قبل تک بداخلاقی اور بدکاری تصور کیا جاتا تھا، مگر اب اسے حقوق میں شمار کیا جاتا ہے۔
- شراب نوشی امریکہ میں پون صدی قبل تک جرم تھی، آج جائز سمجھی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ آسمانی تعلیمات کو مسترد کر کے کامن سینس کو مذہب قرار دے لینے کا منطقی نتیجہ ہے۔ جہاں بھی یہ راستہ اختیار کیا جائے گا نتیجہ یہی ہوگا۔ پھر سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مغرب نے کامن سینس کو حتمی معیار قرار دینے سے پہلے سوسائٹی کے ساتھ مذہب کے تعلق کو مسترد کیا تھا مگر ہمارے دانشور اس کا حوصلہ اور اخلاقی جرأت نہ رکھتے ہوئے سوسائٹی کو اسلام کے ساتھ جوڑے رکھنے کی بات بھی کرتے ہیں اور ہر لمحہ تغیر پذیر کامن سینس کو اسلام کے ابدی اصولوں اور صریح احکام کی تعبیر و تشریح کا واحد معیار قرار دینے پر بھی اصرار کیے جا رہے ہیں۔ ان دانشوروں کی نظر اس سب سے بڑی معروضی حقیقت سے عام طور پر چوک جاتی ہے کہ قرآن کریم اور سنتِ نبویؐ کا ذخیرہ محفوظ حالت میں مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ یہ ذخیرہ ایک زندہ زبان میں ہے اور وہ زبان عام طور پر پڑھی جاتی ہے اور سمجھی جاتی ہے۔ کوئی بھی عام مسلمان اس ذخیرے تک براہ راست رسائی حاصل کرنا چاہے تو اسے اس کے مواقع میسر ہیں اور ہر مسلم معاشرے میں علماء کرام اور دینی مدارس کی ایک اچھی خاصی تعداد اس علمی ذخیرے تک رسائی حاصل کر کے اس سے عام مسلمانوں کو وابستہ رکھنے میں مسلسل مصروف ہے۔ اس فضا اور ماحول میں اگر کسی شخص یا حلقے کو یہ غلط فہمی ہے کہ وہ مسلمانوں کو اسلام کی کسی نئی تعبیر و تشریح سے مانوس کر سکے گا تو اس کے لیے ہم دعائے صحت کے سوا اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔

ہم اجتہاد کے حوالے سے عرض کر رہے تھے، اس لیے اس بحث کو اس گزارش پر سمیٹ رہے ہیں کہ ''اجتہاد'' ہمارے روایتی علمی نظام ہی کا ایک حصہ ہے، اسے اس سے الگ کر کے یا اس کے مقابل کھڑا کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ جبکہ اجتہاد کے نام پر دینی احکام پر نظر ثانی کی خواہش رکھنے والے بہت سے دوست اجتہاد کے اس شرعی مفہوم اور علمی ڈھانچے کی بجائے پوپ طرز کے صوابدیدی اختیارات یا مارٹن لوتھر کی طرح کامن سینس کو پورے دین کی تعبیر نو کی بنیاد قرار دینے کو اجتہاد کا نام دے رہے ہیں، جس کا قرآن و سنت کے اصولوں کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے کہ اجتہاد اپنے شرعی مفہوم میں الگ چیز ہے اور کامن سینس اس سے مختلف چیز ہے۔

مرد اور عورت کے درمیان مساوات

دوسرے نمبر پر ہم یہ بات کرنا چاہیں گے کہ مغرب مرد اور عورت کے درمیان جس مساوات کی بات کرتا ہے اور اس حوالے سے تمام امتیازی قوانین کو ختم کرنے کے درپے ہے، کیا وہ قابلِ عمل بھی ہے؟ اور کیا مغرب نے تمام تر دعوؤں کے باوجود خود وہ منزل حاصل کر لی ہے؟ فطرت نے مرد اور عورت کے درمیان امتیاز قائم کر رکھا ہے۔ یہ امتیاز ان کی جسمانی ساخت میں بھی ہے، ان کے فطری فرائض اور معاشرتی کردار میں بھی ہے، اور ان کی ذہنی و عملی صلاحیتوں میں بھی ہے۔ میں اس کی تازہ ترین مثال دوں گا:

- امریکہ کے حالیہ صدارتی انتخاب میں ڈیموکریٹک پارٹی سے امیدواری کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے باراک اوباما اور ہیلری کلنٹن میں مقابلہ تھا، اس کے ابتدائی دور میں ایک ریاستی سطح کی ووٹنگ میں ہیلری کلنٹن کو اوباما کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا تو اس خاتون کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے۔ اس پر امریکی حلقوں میں تبصرہ شروع ہو گیا کہ جو شخصیت اتنی سی شکست گوارا نہیں کر سکی وہ ملکی معاملات کو کیسے سنبھالے گی؟ چنانچہ عورت کے وہ آنسو جو عام طور پر عورت کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھارنے کا باعث بنتے ہیں، ہیلری کلنٹن کی شخصیت کا تاثر مجروح کرنے کا باعث بن گئے۔
- اسی الیکشن کے دوران ایک فوٹو بعض پاکستانی اخبارات میں بھی شائع ہوئی جس میں ہیلری کلنٹن، اوباما کی بیوی اور نائب صدارت کی امیدوار سارہ پالین کو دکھایا گیا اور یہ بتایا گیا کہ تینوں خواتین کا دلکش میک اپ اور دیدہ زیب لباس پورے الیکشن میں لوگوں کی توجہات کا

مرکز بنا رہا۔ یہ فوٹو دیکھتے ہی میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ کیا عورت امریکہ کے صدارتی الیکشن تک اپنے حسن اور دلکشی کے ''امتیاز'' کی نفی میں مساوات کا مقام حاصل کر پائی ہے ؟

ان امتیازات کی کون نفی کر سکتا ہے اور عورت کو ان امتیازات سے آخر کیسے محروم کیا جا سکتا ہے ؟ سوال یہ ہے کہ جب یہ امتیازات قائم ہیں اور قائم رہیں گے اور عورت کو ان امتیازات سے کسی صورت میں محروم نہیں کیا جا سکتا تو ان امتیازات کی بنیاد پر ان کے لیے الگ احکام و قوانین کی نفی بھی نہیں کی جا سکتی۔ آپ ان امتیازات میں توازن قائم رکھنے کی بات کر سکتے ہیں، آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان امتیازی قوانین میں عورت پر بلکہ مرد پر بھی ظلم نہیں ہونا چاہیے، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے اور ایک دوسرے کے حقوق و مفادات کا پوری طرح لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ لیکن سرے سے امتیاز اور امتیازی قوانین و احکام کی نفی کریں گے تو یہ فطرت کی نفی ہوگی، قدرت کے قوانین کی نفی ہوگی اور زمینی حقائق کی نفی ہوگی، جو غیر منطقی اور غیر فطری ہونے کے علاوہ ناقابلِ عمل بھی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ کی بات یہ ہے کہ چند سال قبل ایک ملک میں مردوں کی طرف سے یہ مطالبہ سامنے آیا کہ جس طرح عورت کو بچہ جننے کے موقع پر زچگی کی چھٹیاں مع تنخواہ دی جاتی ہیں اس کے خاوند کو بھی ان دنوں اسی طرح چھٹیاں دی جائیں تاکہ مرد اور عورت کے درمیان مساوات کا تصور مجروح نہ ہو۔ خبر یہ تھی کہ اس ملک کی حکومت اس مطالبے پر غور کر رہی ہے۔ مجھ سے بعض دوستوں نے اس کے بارے میں پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ وہ عورت تو بے چاری بچہ جنے گی اور بچے کی پرورش کرے گی جبکہ زچگی کا یہ عمل عام طور پر ہسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ خاوند اتنے دن چھٹی لے کر کیا کرے گا؟ ایک صاحب فرمانے لگے کہ کچھ کرے یا نہ کرے مرد اور عورت کے درمیان مساوات تو قائم ہو جائے گی۔

فطرت کے خلاف یہ ''مصنوعی مساوات'' قائم کرنے میں خود مغرب کو بھی کامیابی حاصل نہیں ہو رہی۔ مغربی دنیا میں شائع ہونے والے اعداد و شمار ملاحظہ کر لیجیے جو گواہی دے رہے ہیں:

- یہ مساوات مردوں اور عورتوں کے درمیان ملازمتوں کی تقسیم میں بھی نہیں ہے۔
- تنخواہوں اور مراعات کے معیار میں بھی نہیں ہے۔
- سیاسی قیادت اور اعلیٰ مناصب میں بھی نہیں ہے۔
- اور عام معاشرتی رویوں میں بھی نہیں ہے۔

جب یہ بات عملاً ممکن نہیں تو اس سراب کے پیچھے بھاگے چلے جانے کی بجائے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ:

- مرد اور عورت کے درمیان فطری امتیاز کو تسلیم کر لیا جائے۔
- اس فطری امتیاز کو ان کے درمیان حقوق و فرائض کی بنیاد قرار دے کر دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں واپس لایا جائے۔
- اور باہمی حقوق و فرائض کے نظام کو اس طرح استوار کیا جائے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو اور ہر ایک اپنے فطری فرائض مکمل حوصلے اور اعتماد کے ساتھ سرانجام دے سکے۔

ہمیں عورت کے ساتھ انسانی معاشرے میں ہونے والی زیادتیوں سے انکار نہیں ہے، یہ زیادتیاں ہر جگہ ہو رہی ہیں۔ بعض حوالوں سے مغرب کی عورت زیادہ مظلوم ہے جبکہ بعض حوالوں سے مشرق اور مسلم دنیا کی عورت زیادہ مظلوم نظر آتی ہے۔ ان زیادتیوں کا مذہب اور اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، یہ معاشرتی رویے ہیں جو ظلم اور زیادتی کا عنوان بن جاتے ہیں۔ ان کا علاج اور حل مرد اور عورت کے درمیان امتیاز کی نفی کرتے ہوئے مساوات کا مصنوعی ماحول پیدا کرنا نہیں بلکہ فطرت کے قائم کردہ امتیاز اور تقسیم کار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے دائرے میں توازن واعتدال قائم کرنا اور معاشرتی اصلاح کے لیے محنت کرنا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی حدودِ کار

اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں اس حوالے سے ہم یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ یہ ایک دستوری ادارہ ہے اور اسے دستور کے اندر ہی رہنا چاہیے۔ دستور نے قرآن و سنت کو قانون سازی کا ماخذ قرار دیا ہے اور اس کا ایک طویل پس منظر ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بعض دانشوروں نے قرآن کریم کو اسلامی قانون سازی کا واحد ماخذ قرار دیتے ہوئے سنت رسولؐ کو اس کے دائرے سے خارج کرنے کی کوشش کی جو سالہا سال تک علمی مباحث اور فکری معرکوں کی صورت میں جاری رہی۔ پاکستان کی رائے عامہ نے اس میں واضح فیصلہ صادر کیا کہ قرآن کریم کی طرح سنت رسولؐ بھی اسلامی قانون سازی کا مستقل ماخذ ہے۔ چنانچہ دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ فیصلہ کر کے اس قضیہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ دستور کی نمائندگی کرنے والے اداروں کو اس کا ہر حالت میں لحاظ رکھنا ہوگا ورنہ وہ دستوری تقاضوں سے انحراف کے مرتکب ہوں گے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ

رہے کہ ”سنت“ سے مراد کوئی نیا اور خود ساختہ مفہوم نہیں بلکہ وہ ہے جسے امتِ مسلمہ مجموعی طور پر سنت سمجھتی آ رہی ہے اور اب بھی اس کے نزدیک سنت کا مفہوم وہی ہے۔

ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ سنت رسولؐ کو قانون سازی سے الگ سمجھنے والے دانشوروں کا پرنالہ پاکستانی رائے عامہ کے اس فیصلے اور دستورِ پاکستان کی اس واضح بنیاد کے باوجود اسی جگہ بہہ رہا ہے اور انہوں نے پاکستانی پولیس کی طرح ”نگ“ پورا کرنے کے لیے سنت کا ایک خود ساختہ مفہوم متعیّن کر کے اسے ”قرآن و سنت“ کی اصطلاح کے ساتھ نتھی کر دیا ہے جو فریب کاری کی انتہا ہے۔ یہ دانشور اسلامی نظریاتی کونسل میں بیٹھ کر سنت کا خود ساختہ مفہوم امت پر مسلط کرتے ہوئے اس معروضی حقیقت سے آنکھ بند کیے ہوئے ہیں کہ پاکستان کے وہ عوام جن کے اکثریتی فیصلے اور رجحان کے باعث دستور میں سنت رسولؐ کو قرآن کریم کے ساتھ قانون سازی کا مستقل ماخذ قرار دیا گیا ہے، وہ عوام سنت رسولؐ کے ساتھ صرف عقیدت اور کمٹمنٹ ہی نہیں رکھتے بلکہ سنت کا ایک واضح اور غیر مبہم مفہوم بھی اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ وہ سنت کو اسی مفہوم کے ساتھ ملک میں قانون سازی کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ گنتی کے چند دانشور اگر عوام کے اکثریتی رجحانات کے خلاف سنت کا کوئی الگ مفہوم اپنے ذہن میں رکھتے ہیں تو انہیں اسلامی نظریاتی کونسل کا دستوری فورم استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل دستوری ادارہ ہے اور دستورِ پاکستان کے عوام کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس فورم میں بیٹھ کر پاکستان کے عوام کی اکثریت کے رجحانات کی نفی کرنا قانوناً اور اخلاقاً کسی بھی حوالے سے درست نہیں ہے۔ وہ اپنی فکر کو عام کرنا چاہتے ہیں تو اس ادارے کو چھوڑیں اور عوام میں آئیں، انہیں اپنی دانش کے حدود و اربعہ کا خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔

جہاں تک پاکستان کے معروضی حالات اور زمینی حقائق کا تعلق ہے ہم سطور بالا میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ وہ یورپ کے مسیحیوں کی طرح اپنے مذہب کے ساتھ صرف رسمی تعلق نہیں رکھتے بلکہ شعوری طور پر اپنے مذہب سے وابستہ ہیں۔ یہ وابستگی صرف عقیدہ و ایمان کی حد تک نہیں بلکہ دین کی چودہ سو سالہ اجتماعی تعبیر و تشریح کے ساتھ ان کی وابستگی اور کمٹمنٹ بھی ایمان و عقیدے ہی کے درجہ کی ہے۔ وہ قرآن و سنت اور صحابہ کرامؓ کو دین کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں، اسی وجہ سے ان کی غالب اکثریت اہل السنۃ والجماعۃ کہلاتی ہے۔ یہ صرف رسمی ٹائٹل نہیں ہے بلکہ ان کے عقیدے و ایمان اور وابستگی کا شعوری اظہار ہے۔ ان کے اس اجتماعی رجحان اور وابستگی کو نہ چیلنج کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی انہیں اس سے

محروم کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اکبر بادشاہ سے بڑا کوئی حکمران اور سرسید احمد خان سے بڑا دانشور اب نہیں آسکتا۔ جب ان دو عظیم اور عبقری شخصیتوں کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تو کسی اور کو بھی یہ خواب نہیں دیکھنا چاہیے۔

پاکستانی عوام کا یہ جائز حق ہے کہ ان کے عقیدہ، وابستگی اور اجتماعی رجحانات کا احترام کیا جائے اور جس کام کے لیے انہیں گزشتہ چار صدیوں میں تیار نہیں کیا جا سکا اس میں مزید وقت اور صلاحیتیں ضائع نہ کی جائیں۔ پاکستان کے علماء نے قیامِ پاکستان کے بعد جب اور جہاں ضرورت پڑی اجتہاد سے کام لیا ہے۔ لیکن یہ اجتہاد علمی روایت کے ساتھ چلنے والا شرعی اجتہاد ہے، اسے مسترد کر کے اس کے متوازی دین کی تشکیل کے تصور پر مبنی نہیں ہے۔ اجتہاد اور تشکیلِ نو میں واضح فرق ہے، اس فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔ اجتہاد کے مسلمہ اصولوں اور طے شدہ دائروں میں جو بات بھی کی جائے گی ہم اس کا خیر مقدم کریں گے اور ہمیشہ کرتے آ رہے ہیں۔ لیکن امت کے اجتماعی تعامل اور چودہ سو سالہ علمی روایت کو مسترد کر کے نیا دین کھڑا کرنے کی بات نہ پہلے قبول ہوئی ہے نہ اب ہوگی۔

نکاح و طلاق کا مسئلہ

ان گزارشات کے بعد ہم نکاح و طلاق کے مسئلہ کی طرف آتے ہیں اور اس سلسلہ میں پہلی بات یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مغرب کے خاندانی نظام کی بنیاد دو باتوں پر ہے:

۱. ایک یہ کہ مرد اور عورت کے درمیان مکمل مساوات ہے۔
۲. اور دوسری یہ کہ نکاح محض سوشل کنٹریکٹ ہے اس لیے اسے صرف سوشل کنٹریکٹ کے طور پر ہی ڈیل کرنا چاہیے۔

اسلام ان دونوں باتوں کو قبول نہیں کرتا۔ مرد اور عورت میں مکمل مساوات کے حوالے سے ہم تفصیل سے عرض کر چکے ہیں۔ اور سول کنٹریکٹ کے بارے میں گزارش ہے کہ اسلام نکاح اور شادی کو صرف سوشل کنٹریکٹ نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہبی فریضہ گردانتا ہے، اسے سنتِ نبویؐ اور سنت المرسلین قرار دیتا ہے، اسے خاندانی نظام کے استحکام کا ذریعہ اور اجر و ثواب کا باعث بھی سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کے حدودِ کار کو صرف دو فریقوں کی صوابدید پر چھوڑ دینے کی بجائے قرآن و سنت کے احکام کے ذریعے ان کا تعین کیا گیا ہے اور میاں بیوی کو اس کا پابند بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم صاف طور پر کہتا ہے کہ:

- مرد اور عورت کا جنسی تعلق صرف خواہش کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ خاندان کی بنیاد کے طور پر جائز بلکہ ضروری ہے۔
- یہ تعلق خفیہ اور صرف دو طرفہ دوستی کی بنیاد پر نہیں بلکہ کھلے بندوں ہوگا اور ریکارڈ پر ہوگا۔
- یہ تعلق خاوند کی طرف سے مالیاتی ذمہ داریاں قبول کرنے کی صورت میں ہوگا۔
- یہ تعلق جو فریق جب چاہے چھوڑ دے کی بنیاد پر نہیں بلکہ زندگی بھر کے لیے دائمی ہوتا ہے۔ کیونکہ طلاق کو صرف مجبوری کے درجے میں روا رکھا گیا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلاوجہ طلاق پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے "ابغض المباحات" (مبغوض ترین) قرار دیا ہے۔
- "بیده عقدة النكاح" کی واضح نصِ قرآنی کی صورت میں نکاح کو قائم رکھنے یا توڑنے کی فائنل اتھارٹی صرف اور صرف مرد کو قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ دو ہاتھوں میں برابر کے اختیارات کی صورت میں خاندان کا نظام کسی صورت میں قائم نہیں رہ سکتا۔ کسی بھی ادارے میں دو ہاتھوں میں یکساں اختیارات ہمیشہ اس ادارے کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ خاندان بھی ایک ادارہ ہے اور اس کا نظام صحیح طور پر چلانے کے لیے فائنل اتھارٹی صرف ایک ہاتھ میں ہونا ضروری ہے۔ مغرب نے مرد اور عورت کو یکساں طور پر طلاق کا اختیار دے کر اس کا نتیجہ خاندانی نظام کی تباہی اور اخلاقی انارکی کی صورت میں دیکھ اور بھگت لیا ہے۔ لہٰذا دنیا میں کسی جگہ بھی کوئی مسلم معاشرہ اس صورتحال کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

اسلام میں عورت کو طلاق کے حق سے یکسر محروم نہیں کیا گیا بلکہ خلع کی صورت میں مطالبۂ طلاق کا حق دیا گیا ہے۔ خلع طلاق کا حق نہیں بلکہ مطالبۂ طلاق کا حق ہے اور اس کا پورا کرنا صرف خاوند کی صوابدید پر نہیں ہے بلکہ خاندان کی پنچایت اور عدالت کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر عورت خاوند کی زیادتی ثابت کر دے تو عدالت خاوند کی مرضی کے بغیر تفریق کا حکم صادر کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور پر عدالتی نظام اور معاشرتی ماحول کا حوالہ دیا جاتا ہے کہ بے چاری عورت کہاں عدالتوں کے دھکے کھاتی پھرے گی؟ جبکہ یہ صورتحال صرف عورتوں کے حوالے سے نہیں بلکہ عدالتی نظام کی یہ کمزوریاں اور معاشرتی خرابیاں ملک کے ہر قانون کے حوالے سے موجود ہیں۔ اگر کسی بے چارے کے دھکے کھانے کو قانون میں تبدیلی کی وجہ کے طور پر قبول کر لیا جائے تو ملک کا کوئی قانون تبدیلی سے

محفوظ نہ رہے۔ عدالتی نظام کی کمزوریوں اور معاشرتی خرابیوں کا علاج قانون کا حلیہ بگاڑنا نہیں بلکہ کمزوریوں اور خرابیوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔

سوسائٹی کی منہ زور خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کو اسلام قبول نہیں کرتا اور قرآن و سنت کی نصوصِ صریحہ کے مقابلے میں سوسائٹی کی خواہشات کی پیروی کو گمراہی قرار دیتا ہے۔ جبکہ مغرب نے سوسائٹی کی سوچ اور خواہشات کو ہی حق و باطل کا واحد معیار قرار دے رکھا ہے جس کے نتیجے میں شراب، زنا اور ہم جنس پرستی جیسی واضح خرابیوں کو صرف اس لیے قبول کر لیا گیا ہے کہ سوسائٹی کی اجتماعی سوچ اور خواہش یہی ہے۔ اب مغربی ملکوں میں ہیروئن جیسے نشوں کے بارے میں یہ مطالبات شروع ہو گئے ہیں کہ چونکہ سوسائٹی اسے ترک کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے اس کا قانونی جواز فراہم کرنے کے راستے تلاش کیے جائیں۔ اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ نکاح مغربی معاشرے میں غیر ضروری ہوتا جا رہا ہے، شادی کے بغیر اکٹھے رہنے کا رجحان دن بدن بڑھتا جا رہا ہے، جبکہ سنگل پیرنٹ (single parent) کے قانون نے نسب اور خاندان کے رہے سہے تصور اور باہمی رشتوں کے تقدس کو، جسے اسلام نے صلہ رحمی کے عنوان سے عبادت کا درجہ دے رکھا ہے، پامال کر کے رکھ دیا ہے۔

ان ساری خرابیوں کی واحد وجہ خاندانی نظام کے بارے میں یہ تصور ہے کہ یہ محض سوشل کنٹریکٹ ہے اور مرد اور عورت کو ہر معاملے میں مساوی حقوق حاصل ہیں۔ جبکہ اس تصور کی وکالت کرنے والے دوست، غیر شعوری طور پر سہی، وہی ماحول مسلم معاشرے میں قائم کرنے کے درپے ہیں۔ اس لیے کہ ایک عمل نے جو نتائج مغربی معاشرے میں پیدا کیے ہیں اس کے منطقی نتائج سے مسلم معاشرہ کو آخر کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟ لطف کی بات یہ ہے کہ خاندانی نظام کے تحفظ کی بات اقوام متحدہ کا چارٹر بھی کرتا ہے اور خاندان کو ہی معاشرے کی بنیادی اکائی قرار دیتا ہے، لیکن اس نے خاندانی نظام کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں وہ نظم اور اجتماعیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بجائے فردیت (individualism) کو اس کے مقابلہ میں فروغ دیتی ہیں۔ اسلام کے نظام اور مغرب کے فلسفہ میں بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ اسلام اجتماعیت کی بات کرتا ہے اور اس اجتماعیت کے تحفظ کے لیے، خواہ وہ خاندان کی سطح پر ہو یا سوسائٹی کی سطح پر ہو، فرد پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فرد پابندیاں قبول نہیں کرے گا اور ہر جگہ فردیت کو بالاتر رکھنے کی کوشش کی جائے گی تو اجتماعیت کسی سطح پر بھی قائم

نہیں ہو سکے گی اور نظم و ڈسپلن کہیں وجود میں نہیں آ پائے گا۔

خاندانی نظام اپنے وجود اور استحکام دونوں کے لیے فرد پر پابندیوں کو ضروری قرار دیتا ہے اور باہمی رشتوں کا تقدس اور احترام بھی انہی پابندیوں کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ اگر فرد اپنی خواہشات پر قدغنیں قبول نہیں کرے گا اور ناگزیر پابندیوں کو آزادی کے حق کے منافی سمجھنے لگے گا تو نہ خاندان وجود میں آ سکتا ہے اور نہ ہی رشتوں کا وہ تقدس اور احترام قائم رہ سکتا ہے جسے اسلام نے صلہ رحمی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس لیے اگر ہم نے خاندانی نظام اور رشتوں کے تقدس کو قائم رکھنا ہے تو وہ ساری پابندیاں اور ترجیحات قبول کرنا ہوں گی جو قرآن و سنت نے بیان کی ہیں۔ اگر خدانخواستہ اس سے دستبردار ہو کر مغربی معاشرے کے مقام تک جانے کا تہیہ کر لیا گیا ہے تو پھر جو چاہے کریں۔ لیکن ہمارے دانشور خاطر جمع رکھیں کہ پاکستان کے عوام نے اسے پہلے کبھی قبول کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کبھی انہیں اس بات پر آمادہ کیا جا سکتا ہے (ان شاء اللہ تعالیٰ)۔

پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کی کوششوں کا پس منظر

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۴ جنوری ۲۰۰۹ء)

جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے ۱۹۷۵ء میں نفاذِ شریعت کے سلسلہ میں حکومتی رویے سے مایوس ہو کر ملک بھر میں پرائیویٹ شرعی عدالتیں قائم کرنے کا اعلان کیا تھا اور طے کیا تھا کہ جو مقدمات اور تنازعات قابلِ دست اندازئ پولیس نہیں ہیں اور جن میں لوگ اپنی مرضی کے مطابق تحکیم، پنچایت اور ثالثی کے ذریعے اپنے تنازعات کا فیصلہ کرا سکتے ہیں، ان میں عام مسلمانوں کو اپنے مقدمات کے فیصلے شرعی قوانین کی روشنی میں کرانے کے لیے سہولت اور نظام فراہم کیا جائے۔ میں نے اپنے ایک دو گزشتہ کالموں میں اس کا ذکر کیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اس کی تفصیلات قارئین کو فراہم کروں گا، چنانچہ پہلے اس فیصلے کا اور اس پر عملدرآمد کے لیے اس وقت کیے جانے والے اقدامات کا تذکرہ کروں گا، پھر ان اسباب و عوامل کا جائزہ لوں گا کہ یہ انتہائی اہم فیصلہ اور اعلان عملدرآمد کی منزل کیوں حاصل نہ کر سکا اور آخر میں عرض کروں گا کہ آج کے دور میں اس کی اہمیت و ضرورت کیا ہے اور اسے پھر سے زندہ کر کے قابلِ عمل بنانے کے لیے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۲۵ و ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو جمعیۃ علماء اسلام کے زیر اہتمام علماء کرام اور جماعتی کارکنوں کا ملک گیر کنونشن گوجرانوالہ میں منعقد ہوا جو پروگرام کے مطابق شیرانوالہ باغ میں منعقد ہونا تھا لیکن حکومت نے عین وقت پر اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور یہ ''نظام شریعت کنونشن'' جامع مسجد نور مدرسہ نصرۃ العلوم میں منعقد ہوا۔ حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ اس کنونشن کی مجلس استقبالیہ کے صدر اور حضرت مولانا مفتی عبد الواحدؒ ناظم استقبالیہ تھے۔ جبکہ مجھے ان کے نائب اور معاون کے طور پر خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔ حافظ الحدیث حضرت مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ نے کنونشن کی صدارت فرمائی اور ملک بھر سے پانچ ہزار کے لگ بھگ علماء کرام اور کارکنوں نے شرکت کی جن میں قائد جمعیۃ حضرت مولانا مفتی محمود اور حضرت مولانا عبید اللہ انور کے علاوہ حضرت مولانا خواجہ خان محمد، حضرت مولانا سید محمد شاہ امروٹی، حضرت مولانا سید محمد ایوب جان بنوری، حضرت مولانا عبد الغفور آف کوئٹہ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن، حضرت مولانا محمد اجمل خان، حضرت مولانا مفتی محمد

عبداللہ آف ملتان اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر جیسے اکابر بزرگ بھی شامل تھے۔ اس موقع پر تبلیغی جماعت کے بزرگ الحاج ظفر علی ڈار کی رہائش گاہ پر جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہوا جس کے فیصلوں کا اعلان کنونشن کی آخری نشست میں کیا گیا۔ راقم الحروف ان دنوں جمعیۃ علماء اسلام کا مرکزی سیکرٹری اطلاعات تھا اس لیے آخری نشست میں اسٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دینے اور مرکزی مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا اعلان کرنے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ ان فیصلوں میں ایک اہم فیصلہ پرائیویٹ شرعی عدالتوں کے قیام کا بھی تھا جو مجلس شوریٰ کی منظور کردہ قرارداد کے مطابق یوں تھا:

> ''جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کا عظیم الشان نظام شریعت کنونشن فیصلہ کرتا ہے کہ جب تک حکمران گروہ پاکستان میں اسلام کے عادلانہ نظام اور اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں نہیں لاتا اس وقت تک کے لیے جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے ملک میں مرکزی، صوبائی اور ضلعی سطح پر شرعی عدالتیں قائم کی جائیں جو مسلمانوں کے باہمی تنازعات و مقدمات کا فیصلہ کریں گی، اس سے ایک طرف تو مقدمات کے شرعی فیصلوں کا آغاز ہوگا اور دوسری طرف غریب عوام عدالتوں کے کمر توڑ اخراجات سے چھٹکارا پالیں گے۔
>
> کنونشن اس مقصد کے لیے مرکزی شرعی عدالت کے لیے ان تین حضرات کو نامزد کرتا ہے جو عدالتی طریق کار تجویز کرنے کے ساتھ ساتھ صوبائی سطح پر قاضیوں کا تقرر کریں گے اور اس کے بعد صوبائی عدالتیں اضلاع میں قاضی مقرر کریں گے۔
>
> مولانا مفتی محمود، ڈیرہ اسماعیل خان (قاضی القضاۃ)
> مولانا عبدالکریم قریشی، بیر شریف لاڑکانہ (قاضی)
> مولانا محمد سرفراز خان صفدر، گوجرانوالہ (قاضی)
>
> کنونشن عامۃ المسلمین خصوصاً جمعیۃ علماء اسلام کے کارکنوں اور اس سے وابستہ تمام مسلمانوں سے استدعا کرتا ہے کہ اپنے تنازعات اور ان مقدمات کے تصفیہ کے لیے، جو مروجہ قانون کے مطابق قابلِ دست اندازیٔ پولیس نہیں ہیں، شرعی عدالتوں سے رجوع کریں اور اس طرح ملک میں شرعی نظام کے نفاذ کی جدوجہد میں عملی حصہ لیں۔''

کنونشن میں اپنے خطاب کے دوران جب مولانا مفتی محمودؒ نے جمعیۃ کی طرف سے شرعی عدالتوں

کے قیام کے اس اہم اعلان کا ذکر کیا تو علماء کرام اور کارکنوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مفتی صاحبؒ نے اس موقع پر فرمایا:

"ہم ان سے مایوس ہو گئے ہیں، ہمیں انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ نظام شریعت کنونشن ایسے وقت میں بلایا گیا ہے جب موجودہ حکومت سے عوام مایوس ہو چکے ہیں، وہ جان چکے ہیں کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے، اس لیے میں آج اس کنونشن میں اہم اعلان کرنا چاہتا ہوں، اس کا فیصلہ مجلس شوریٰ نے کیا ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں ملک بھر میں شرعی عدالتیں قائم کرنے کا (فلک شگاف نعرے)۔ اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے مسلمانوں کے تمام مقدمات و معاملات طے کرنے کے لیے شرعی عدالتیں قائم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔ ہر ضلع میں شرعی عدالت قائم کی جائے گی، صوبے میں بھی، مرکز میں بھی۔ مرکز میں تین جج ہوں گے جو صوبوں میں قاضیوں کا انتخاب کریں گے، اس کے بعد ہر ضلع میں شرعی عدالتوں کی نامزدگی ہوگی۔ ہم دعوت دیں گے مسلمانوں کو کہ اپنے وہ مقدمات جو قابلِ دست اندازئ پولیس نہیں، جن میں سرکار فریق نہ ہو، ان مقدمات کے فیصلے شرعی عدالتوں سے کرائیں۔ فیصلے کے خلاف اپیل صوبے میں ہو سکے گی اور صوبے کی مرکز میں۔ اگر معاملات شریعت کے مطابق طے ہو سکیں تو غیر اسلامی قانون اور عدالت کے پاس جانے کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے؟ قرآن کریم میں واضح طور پر آیا ہے کہ "اے نبی! یہ لوگ مومن نہیں ہیں جب تک آپ کو عدالتی معاملات میں حکم تسلیم نہیں کرتے"۔ تو ہمارا فرض ہے کہ اپنے مقدمات ان شرعی عدالتوں میں لائیں۔"

جبکہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے اس فیصلہ کی وضاحت کے لیے ایک تفصیلی مضمون بھی قلمبند کیا جو ہفت روزہ خدام الدین لاہور اور دیگر جرائد میں شائع ہوا، اس میں حضرت مولانا مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں:

"قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک اسلام کو بطور ایک نظام زندگی نافذ کرنے کی آج تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی، جتنی حکومتیں بھی برسرِاقتدار آتی رہیں اسلام کا نام سب نے لیا ہے، کسی نے اقتدار کے حصول کے لیے اور کسی نے اقتدار کے تحفظ کے

لیے اور بس! اس سے زیادہ پاکستان کی تاریخ میں اسلام کا کوئی اور مصرف نہیں سمجھا گیا۔ پاکستان میں جتنے بھی آئین نافذ ہوئے، ملکی قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کی نوید اور اسلامی نظریاتی کونسل کے قیام کی خوشخبری آئین میں قوم کو دی گئی، لیکن عملاً کسی ایک قانون کو بھی اسلام کے سانچے میں فٹ نہیں کیا جاسکا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ کی کوششوں کی پوری قوت کے ساتھ حوصلہ شکنی کی گئی تو بے جانہ ہوگا۔

ریاست قلات اور ریاست بہاولپور میں (اور سوات میں بھی) پاکستان کے ساتھ الحاق سے قبل قضا کا شرعی نظام نافذ تھا جو الحاق کے بعد ختم کر دیا گیا، اور اس طرح ان ریاستوں میں جہاں انگریز خود اپنے قوانین نافذ نہیں کر سکا تھا، حکومت پاکستان نے وہاں فرنگی قوانین نافذ کرنے کا ''فریضہ'' سرانجام دیا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد جب بلوچستان اور سرحد کے لیے کمیشن قائم کیے گئے، سرحد کے کمیشن میں مولانا سید محمد یوسف بنوری، مولانا شمس الحق افغانی اور راقم الحروف (مولانا مفتی محمود) کے علاوہ صوبائی وزیر قانون امیر زادہ خان اور ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن کے نمائندے شامل تھے، جبکہ بلوچستان میں کمیشن کے سربراہ جسٹس فضل غنی تھے اور اس میں مولانا عبد الغفور اور مولانا محمد عمر کے علاوہ دیگر قانون دان بھی شامل تھے۔ بلوچستان کمیشن رپورٹ مکمل کر کے پیش کر چکا تھا اور سرحد کمیشن کی رپورٹ زیر تکمیل تھی کہ بلوچستان کی اکثریتی حکومت غیر قانونی طور پر برطرف کر دی گئی اور صوبہ سرحد کی حکومت اس غیر جمہوری اقدام پر احتجاج کرتے ہوئے مستعفی ہوگئی۔ لیکن اس کے بعد آج تک سرحد یا بلوچستان کسی صوبہ میں بھی کمیشن کی رپورٹ اور کارکردگی سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ یہ معاہدہ وہیں پر اسٹاپ ہے جہاں جمعیۃ اور نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کی حکومتوں نے چھوڑا تھا اور اس سلسلہ میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔

اسی طرح ۱۹۷۳ء کے آئین میں یہ طے کیا گیا تھا کہ تمام قوانین کو سات سال کے

عرصہ میں قرآن و سنت کے مطابق بنا دیا جائے گا، اس مقصد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی جس کے ذمہ آئین کی رو سے یہ ضروری ہے کہ وہ مروجہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے ایک رپورٹ پیش کرے۔ لیکن دو سال (۱۹۷۵ء میں) سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود نہ تو کسی مروجہ قانون کو قرآن و سنت کے مطابق بنایا گیا ہے اور نہ ہی اسلامی نظریاتی کونسل نے اسمبلی میں کوئی بل پیش کیا ہے۔

ان حالات میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلہ میں حکمران گروہ کی طرف سے مایوس ہو جانا فطری بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اس سلسلہ میں حکمران گروہ کی طرف سے مکمل طور پر مایوس ہو چکے ہیں اور اگر جمعیۃ علماء اسلام کی طرف سے شرعی عدالتوں کے قیام کے اس فیصلہ کو اس مایوسی کا فطری اور خوشگوار ردعمل قرار دیا جائے تو یہ بات کچھ غلط نہ ہوگی۔ کیونکہ ہمارے اس اقدام میں بنیادی طور پر یہی جذبہ کارفرما ہے کہ اگر حکومت شرعی قوانین کے نفاذ کی طرف سنجیدگی سے آگے بڑھنے کے لیے آمادہ نہیں ہے تو جس حد تک شرعی قوانین پر عملدرآمد ہمارے لیے ممکن ہے اس سے گریز نہ کریں اور ایک نظام قائم کر کے اس مقدس عمل کا اظہار کریں تاکہ قوم نظام شریعت کی برکات سے بہرہ ور ہو سکے۔ اسی وجہ سے ہم نے شرعی عدالتوں کے آغاز کے لیے ان تنازعات و مقدمات کو بنیاد بنانے کا فیصلہ کیا ہے جن میں سرکار فریق نہیں ہوتی اور جن میں دونوں فریق اپنی مرضی سے کسی بھی حکم کا فیصلہ قبول کر سکتے ہیں تاکہ مروجہ قانون سے ٹکراؤ پیدا کیے بغیر رضاکارانہ بنیادوں پر شرعی عدالتوں کے قیام کا نظام استوار ہو سکے۔

اس نظام کے قیام سے جہاں اور بہت سے فوائد اور برکات سامنے آئیں گی وہاں اسلامی نظام کا قانونی شعبہ ایک فعال اور قابلِ عمل ضابطہ کی حیثیت سے سامنے آئے گا، عامۃ المسلمین میں اپنے تنازعات کو قرآن و سنت کے مطابق طے کرنے کا رجحان پیدا ہوگا، دیوانی مقدمات پر مروجہ عدالتوں کے بے پناہ اخراجات اور طویل طویل مدتوں کی تاریخوں کی صورت میں وقت کے زیاں سے عوام کو نجات ملے گی، خدا کے قانون کو

معاشرے میں عملاً نافذ کرنے کے مقدس عمل کا آغاز ہوگا۔ یہ تمام نظام رضاکارانہ بنیادوں پر ہوگا، علماء کرام اپنے اپنے حلقۂ اثر میں عوام کو ترغیب دلائیں گے، قاضی ان کے فیصلے اسلامی اصولوں کے مطابق کریں گے۔"

یہ وہ اصولی وضاحت ہے جو شرعی عدالتوں کے قیام کے اس فیصلے کی اہمیت وضرورت اور اس کے دائرہ کار کے بارے میں مولانا مفتی محمودؒ نے اپنے تفصیلی مضمون میں فرمائی تھی، جبکہ ۲۸ و ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء کو شیرانوالہ لاہور میں شرعی عدالتوں کے قاضیوں کا ملک گیر کنونشن منعقد ہوا جس میں شرعی عدالتوں کے عملی دائرہ کار اور طریق کار کا تعین کیا گیا، اس کی تفصیل اگلے کالم میں پیش کی جائے گی، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

نفاذِ شریعت: کیا، کیوں اور کیسے ؟

(قرآن آڈیٹوریم، گارڈن ٹاؤن، لاہور۔۳۱مئی ۲۰۰۹ء)

۳۱ مئی کو قرآن آڈیٹوریم گارڈن ٹاؤن لاہور میں تنظیمِ اسلامی کے زیر اہتمام ایک سیمینار ''نفاذِ شریعت: کیا، کیوں اور کیسے ؟'' کے عنوان پر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں تنظیمِ اسلامی کے امیر جناب حافظ عاکف سعید، مولانا حافظ عبد الرحمٰن مدنی، مولانا ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی، جناب احمد جاوید اور دیگر ارباب دانش نے خطاب کیا۔ راقم الحروف کو بھی گزارشات پیش کرنے کی دعوت دی گئی جن کا خلاصہ نذرِ قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ مجھے جس موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی ہے اس کے تین حصے ہیں:

۱. ایک یہ کہ شریعت کیا ہے ؟
۲. دوسرا یہ کہ اس کے نفاذ کی ضرورت کیوں محسوس کی جا رہی ہے ؟
۳. اور تیسرا یہ کہ اس کے نفاذ کا طریق کار کیا ہو گا؟

شریعت کیا ہے ؟

جہاں تک شریعت کا تعلق ہے، یہ بات واضح ہے کہ قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین کو شریعت کہا جاتا ہے اور قرآن و سنت سے مستنبط احکام شریعت کہلاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آج کے دور میں ایک سوال کیا جاتا ہے کہ شریعت کے بارے میں آپ کا وژن کیا ہے اور شریعت کے احکام کو قوانین کی صورت دینے کی آپ کے نزدیک عملی صورت کیا ہے ؟ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے حوالے سے ہمارا وژن یہ ہے کہ:

- دستور کی اساس قراردادِ مقاصد پر عمل کیا جائے۔
- تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ علماء کرام کے ۲۲ متفقہ دستوری نکات کو عملی جامہ پہنایا جائے۔
- ۱۹۷۳ء کے دستور کی اسلامی دفعات کے عملی نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔
- اور اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک کے قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے

لیے سفارشات کا جو جامع مجموعہ حکومت کو پیش کر رکھا ہے اس کے مطابق قانون سازی کی جائے۔

پاکستان میں نفاذِ شریعت کے بارے میں اس ''وژن'' پر تمام مذہبی مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے اور بعض جزوی تحفظات کے باوجود اس پر تمام دینی جماعتوں کا مجموعی طور پر اجماع ہو چکا ہے۔ اس لیے پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے ہمارے نزدیک یہی چار بنیادیں ہیں، ان سے ہٹ کر نفاذِ شریعت کا کوئی اور وژن قابلِ قبول نہیں ہے۔

نفاذِ شریعت کیوں ضروری ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ نفاذِ شریعت کیوں؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ تین وجوہ کی بنا پر ہمارے ہاں نفاذِ شریعت ضروری ہے:

۱. پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ کے ارشادات و تعلیمات پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ تعلیمات ایک فرد کی زندگی، خاندانی زندگی، سوسائٹی کی اجتماعی زندگی اور قومی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتی ہیں اور ہم تمام دائروں میں ان تعلیمات پر عمل کرنے کے پابند ہیں۔ اس لیے ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں قرآن وسنت کے احکام وقوانین کا عملاً نفاذ ہو۔

۲. دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس کا قیام ہی اس غرض سے ہوا تھا کہ اس میں اسلامی تعلیمات پر عملدرآمد کا اہتمام ہوگا اور قرآن و سنت کے احکام و قوانین کا نفاذ ہوگا۔ تحریکِ پاکستان کے موقع پر قائداعظم محمد علی جناح مرحوم سمیت تمام ذمہ دار قائدین نے اس کا واضح اعلان کیا تھا، اس لیے بھی ہم پابند ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے اور اسلامی احکام وقوانین کی عملداری کا اہتمام کیا جائے۔

۳. تیسرا یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ شرعی قوانین کا نفاذ اور شرعی عدالتوں کا نظام ہماری قومی ضرورت ہے۔ اس وقت ملک میں عام آدمی کو عدالتوں سے انصاف فراہم ہونے کے حوالے سے جو صورتحال ہے اس پر عدالتِ عظمیٰ کے جج صاحبان اور ہمارے حکمرانوں سمیت سب پریشانی کا اظہار کر رہے ہیں۔ موجودہ عدالتی نظام پر بے اطمینان کا کھلے بندوں اظہار کیا جا رہا ہے اور متبادل کی تلاش جاری ہے۔ چند ماہ قبل وفاقی وزارتِ قانون نے بین

الصوبائی اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ عدالتوں پر مقدمات کا بوجھ کم کرنے اور عوام کو جلد انصاف مہیا کرنے کے لیے شام کی عدالتیں قائم کی جائیں مگر یہ تجویز مسترد کر دی گئی، ویسے بھی یہ قابلِ عمل نہیں ہے۔ سوات میں نظامِ عدل کے معاہدے کی دیگر تفصیلات سے قطع نظر اس کے حوالے سے وفاقی اور صوبائی حکمرانوں کی طرف سے بار بار کہا جا تا رہا ہے کہ یہ عوام کو سستا اور فوری انصاف مہیا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ ہماری حکومتیں اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ عوام کو سستا اور فوری انصاف مہیا کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ شرعی عدالتیں قائم کی جائیں اور شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔

اس پس منظر میں، میں ان حکمرانوں سے پوچھنا چاہوں گا کہ اگر سوات میں سستا اور فوری انصاف مہیا کرنے کا ذریعہ شرعی عدالتیں ہیں تو لاہور اور کراچی کے عوام کا کیا قصور ہے کہ انہیں اس سے محروم رکھا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ملک بھر میں عوام کو فوری اور سستا انصاف فراہم کرنے کے لیے اس کے سوا دوسرا کوئی آپشن موجود نہیں ہے کہ نچلی سطح پر شرعی عدالتوں کا قیام عمل میں لایا جائے اور شرعی قوانین کے نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔

نفاذِ شریعت کا طریق کار کیا ہو گا؟

آج کے موضوع کا تیسرا پہلو اور سوال یہ ہے کہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے اور اس کی جدوجہد کو کن خطوط پر استوار کیا جائے؟ اس کے بارے میں میری گزارش ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً ابعد ہی تمام علماء کرام نے متفقہ طور پر طے کر لیا تھا کہ ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے سیاسی جدوجہد کی جائے گی، دستوری راستہ اختیار کیا جائے گا اور رائے عامہ کی قوت کے ذریعے حکمرانوں کو نفاذِ اسلام کے لیے آمادہ کیا جائے گا، جبکہ اس کے لیے مسلح اور غیر قانونی جدوجہد سے گریز کیا جائے گا۔ گزشتہ چھ عشروں سے اسی دائرے میں یہ تحریک جاری ہے اور پر امن جدوجہد کے ذریعے خاصی پیشرفت بھی ہوتی رہی ہے۔ مگر اب اس میں تشدد کا عنصر شامل ہو گیا ہے اور بعض گروہوں نے مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کر لیا ہے جس سے حالات بگڑتے جا رہے ہیں۔

ہم ملک میں نفاذِ شریعت کے لیے مسلح جدوجہد کو درست نہیں سمجھتے اور اس کے لیے قانون کو ہاتھ میں لینے اور ہتھیار اٹھانے کی حمایت نہیں کرتے۔ لیکن اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ مسلح جدوجہد ہمارے اسٹیبلشمنٹ کے اس ساٹھ سالہ طرز عمل کا ری ایکشن ہے جو اس نے ملک میں

نفاذِ شریعت کا راستہ روکنے کے لیے اختیار کر رکھا ہے۔ اس لیے اس مسلح جدوجہد کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہمارے حکمرانوں، رولنگ کلاس اور اسٹیبلشمنٹ پر عائد ہوتی ہے جو مسلسل چھ عشروں سے نفاذ اسلام کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے اور کچھ لوگ اس کے رویے سے مایوس ہو کر "تنگ آمد بجنگ آمد" پر اتر آئے ہیں۔ ہم ہتھیار اٹھانے، قانون کو ہاتھ میں لینے اور حکومتی رٹ کو چیلنج کرنے کے طریق کار کو درست نہیں سمجھتے اور اس کی حمایت نہیں کرتے لیکن اس سب کچھ کی ذمہ دار ہمارے نزدیک ملک کی رولنگ کلاس ہے جو اگر اپنے رویے میں تبدیلی نہیں کرے گی اور جمہوری راستے سے نفاذِ شریعت کو آگے بڑھنے کا راستہ نہیں دے گی تو حالات میں اصلاح کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی اور صورتحال کی سنگینی میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مجھے حالات میں بگاڑ کے دیگر اسباب سے انکار نہیں لیکن میرے نزدیک ان میں سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ قومی خودمختاری، ملکی استحکام اور ملی وحدت کے لیے اس پر توجہ دینا بہرحال ضروری ہے۔

مسئلہ سود پر دو اہم باتیں

(۲جون ۲۰۱۰ء کو اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام سود کے مسئلہ پر منعقدہ سیمینار سے خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ میں اسلامی نظریاتی کونسل کا شکر گزار ہوں کہ سود کے بارے میں منعقدہ دو روزہ سیمینار میں مجھے بھی شرکت کا موقع عطا کیا گیا جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے ارباب علم و دانش سود اور سودی نظام کے حوالہ سے موجودہ معروضی صورتحال اور اس سلسلہ میں مشکلات و مسائل کے حل کے موضوع پر اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ میں اس مرحلہ میں اس موضوع پر کوئی تفصیلی بات نہیں کرنا چاہتا اور مختلف الخیال ارباب دانش کے خیالات سننے کی نیت سے حاضر ہوا ہوں، مگر مجھ سے پہلے ایک فاضل دوست نے اپنے خطاب میں کچھ اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے جن میں سے دو نکات پر مختصراً کچھ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

۱. انہوں نے فرمایا ہے کہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے آخری خطبۂ جمعہ میں فرمایا تھا کہ جناب نبی اکرمؐ دنیا سے تشریف لے گئے مگر انہوں نے ”ربوٰا“ کے بعض پہلوؤں کی وضاحت نہیں فرمائی۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق یہ درست ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے یہ بات فرمائی تھی لیکن میں اس پر یہ سوال کرنا چاہوں گا کہ:

- ربوٰا کے ان بعض پہلوؤں کی وضاحت، جو حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کے مطابق وضاحت طلب تھے، خود جناب نبی اکرمؐ نے واپس آکر فرمانا تھی؟ یا اب یہ امت کا کام تھا کہ وہ اس کی وضاحت تلاش کرے؟
- اور امت کے اہلِ علم نے ان پہلوؤں کو اسی طرح وضاحت طلب چھوڑ دیا یا ان کی وضاحت کا فریضہ ادا کیا؟
- اور پھر امت کے اہلِ علم نے ان ابواب کی وضاحت کر کے ربوٰا کے بارے میں امت کا جو جمہوری موقف طے کیا اور صدیوں سے امت کے جمہور اہلِ علم کا وہی موقف چلا آرہا ہے اس کی کیا علمی حیثیت ہے؟ کیا اس سارے عمل کو نظر انداز کر کے ہم پھر اسی مقام پر جا کھڑے ہوں گے جب حضرت عمرؓ نے یہ بات ارشاد

فرمائی تھی؟

۲. دوسری بات فاضل مقرر نے فرمائی ہے کہ ہمیں سود کے حوالہ سے آج کے حالات کے تناظر میں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ نظر ثانی کب سے کرنی ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم امت کے چودہ سو سالہ علمی موقف کو مسترد کر کے پھر سے زیرو پوائنٹ پر جا کھڑے ہوں؟

جہاں تک نظر ثانی کا تعلق ہے ہم اس ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں کہ حالات کے تغیر اور عرف و تعامل کی تبدیلی سے جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان پر مسلمہ اصولوں کی روشنی میں غور کرایا جائے اور جہاں ضرورت و گنجائش ہو وہاں نظر ثانی بھی کی جائے۔ (خلافت عثمانیہ کا "مجلة الاحكام العدلية" اور مغل حکومت کا "فتاوٰی عالمگیری" اسی نظر ثانی پر مشتمل ہے)۔ لیکن پورے فقہی ڈھانچے کی تشکیلِ نو اور تمام اسلامی احکام و قوانین اور ان کے اصول و قواعد کے از سر نو تعین کی بات قبول کرنا مشکل ہے، اس لیے کہ ارتقا ماضی کے علمی تعامل و توارث کو مسترد کر کے زیرو پوائنٹ پر واپس جانے کا نام نہیں ہے بلکہ اب تک کے تمام علمی سفر اور پراسیس کو تسلیم کرتے ہوئے، اس کے مکمل احترام کے ساتھ اسے برقرار رکھتے ہوئے اس سے آگے بڑھنے کو ارتقا کہا جاتا ہے، اس لیے فقہی احکام پر نظر ثانی کی بات کرتے ہوئے اس کو ملحوظ رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

امتِ مسلمہ کے مسائل و مشکلات اور علماء کا کردار

(۱۱ مئی ۲۰۱۱ء کو اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام "امت مسلمہ اور اس کو درپیش مسائل" کے عنوان پر قومی کانفرنس سے صدارتی خطاب)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی اور ان کے رفقاء کا شکر گزار ہوں کہ ایک اہم عنوان پر منعقد ہونے والے ارباب علم و دانش کے اس اجتماع میں شرکت اور اس کی ایک نشست کی صدارت کا اعزاز بخشا، اللہ تعالیٰ ہمارا مل بیٹھنا قبول فرمائیں اور کچھ مقصد کی باتیں کہنے اور سننے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

کانفرنس کا مرکزی عنوان "امتِ مسلمہ اور اس کو درپیش مسائل" ہے اور اس کے ایک ذیلی عنوان پر مجھے گفتگو کے لیے کہا گیا ہے جو "امتِ مسلمہ کے مسائل و مشکلات اور علماء کا کردار" سے معنون ہے۔ امتِ مسلمہ اس وقت عالمی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق ڈیڑھ ارب سے زیادہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، ایک امریکی تھنک ٹینک کے حوالہ سے شائع ہونے والی اخباری خبروں کے مطابق اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ایک ارب سرسٹھ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور کہا جاتا ہے کہ مسلم امہ جو دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ سمجھی جاتی تھی اب چوتھے حصے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اور اس طرح دنیا کی انسانی آبادی کا کم و بیش چوتھا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے، مسلم ممالک کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے اور زمینی وسائل کا ایک بڑا حصہ مسلمانوں کے پاس ہے۔ اس تناظر میں اگر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کا جائزہ لیا جائے تو میرے خیال میں اس کی سرسری سی فہرست یوں بنتی ہے:

۱. امتِ مسلمہ سیاسی اور فکری مرکزیت سے محروم ہے۔ "خلافت عثمانیہ" کے خاتمہ کے بعد مسلم امہ کے پاس کوئی ایسی مرکزیت موجود نہیں ہے جس کی طرف وہ اپنے سیاسی اور فکری مسائل کی طرف رجوع کر سکے، یا وہ مسلمانوں کو دنیا کے کسی حصہ میں ان کے مسائل کے حل میں مدد دے سکے۔ "اسلامی سربراہ کانفرنس تنظیم قائم ہونے کے بعد کسی درجہ میں یہ امید قائم ہوئی تھی کہ شاید وہ ایک بین الاقوامی ادارے کے طور پر یہ خلا پر کر سکے مگر اس کا کردار "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ اہل تشیع نے تو ایران کے مذہبی

انقلاب کے بعد امام غائب کے نمائندہ کے طور پر ''ولایت فقیہ'' کا دستوری منصب قائم کر کے اپنے دائرہ میں اس خلا کو پر کر لیا ہے اور دنیا بھر کے اہل تشیع میں اسے مرکز اور مرجع کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، مگر اہل سنت جو مسلم آبادی کی غالب اکثریت پر مشتمل ہے اس قسم کی مرکزیت سے محروم ہے جس کی وجہ سے سیاسی اور فکری انتشار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور میرے نزدیک امتِ مسلمہ کا دور حاضر میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے۔

۲. دنیا کے اقتصادی، معاشی اور تجارتی میدان میں مسلمانوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو ان کا جائز حق ہے اور وہ ان شعبوں میں دوسری قوموں کے تابع بلکہ ان کے دست نگر نظر آتے ہیں۔

۳. سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری شعبوں میں مسلم امہ بین الاقوامی برادری میں اپنے صحیح مقام سے محروم ہے اور میری طالب علمانہ رائے میں ہم اس وقت قرآن کریم کے ایک صریح حکم "واعدوا لهم ما استطعتم من قوة" کی خلاف ورزی کے سنگین جرم کی سزا بھگت رہے ہیں۔ قرآن کریم نے مسلمانوں کو عسکری قوت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کا معیار یہ طے کیا ہے کہ "ترهبون به عدو الله وعدوكم" کہ دشمنوں پر تمہارا رعب ہو، یعنی عالمی سطح پر عسکری قوت کا توازن تمہارے ہاتھ میں ہو۔ مگر ہماری حالت یہ ہے کہ نہ صرف عسکری میدان بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے عمومی ماحول میں بھی ہم بہت پیچھے ہیں اور ہمیں ایک حد سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا جا رہا۔

مسلم امہ کو گزشتہ ایک ہزار سال کے دوران عالمی سطح پر تین قیادتیں میسر آئی تھیں۔ (۱) اندلس کی مسلم حکومت، (۲) ترکی کی خلافت عثمانیہ (۳) اور جنوبی ایشیا کی مغل شہنشاہیت۔ ان تینوں میں سے اندلس کی حکومت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دی تھی اور اسی کی فراہم کی ہوئی اساس پر آج مغرب کی سائنسی ترقی کا ڈھانچہ کھڑا ہے۔ جبکہ اندلس کی اسلامی حکومت کے خاتمہ کے بعد خلافت عثمانیہ اور مغل شہنشاہیت میں سے کسی نے اس طرح توجہ نہیں دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکریت میں مغرب نے برتری بلکہ اجارہ داری حاصل کر لی تو ہمارے لیے اس طرف آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہوتے چلے گئے۔ اس کا صرف ایک منظر سامنے رکھ لیجئے کہ عرب ممالک میں تیل کے چشمے

دریافت ہوئے تو مسلمانوں کے پاس تیل کو زمین سے نکالنے کی تکنیکی صلاحیت موجود نہیں تھی، ہم تیل کو صاف کر کے استعمال کے قابل بنانے کی پوزیشن میں نہیں تھے اور نہ ہی دنیا میں اس کی مارکیٹنگ کے وسائل اور صلاحیت ہمیں حاصل تھی۔ اپنی اس نااہلی کی وجہ سے ان کاموں کے لیے ہمیں مغرب کی تیل کمپنیوں کو بلانا پڑا وہ آئیں انہوں نے کام سنبھالا ان کے پیچھے مغرب کے بینک آئے جنہوں نے سرمایہ سمیٹنا شروع کر دیا اور پھر مغرب کی افواج نے آکر سارا ماحول کنٹرول کر لیا۔ یہ سب کچھ سائنس، ٹیکنالوجی اور عسکری میدان میں ہماری نااہلی کا نتیجہ ہے جو ہم بھگتتے چلے آرہے ہیں اور موجودہ حالات میں مستقبل قریب میں بھی اس صورتحال میں تبدیلی کا کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا۔

۴. ہمارا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت عالمی سطح پر اقوام و ممالک کے باہمی معاملات کو چلانے اور کنٹرول کرنے کا جو نظام ”اقوام متحدہ“ کے نام سے موجود ہے اور اس کے نام پر سارے معاملات کو کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ اس میں ہماری حیثیت کیا ہے؟ ہم جنرل اسمبلی میں ہر سال دو چار تقریریں کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے دل کی بھڑاس نکال لی ہے مگر پالیسی سازی اور کنٹرول کی اصل قوت سلامتی کونسل میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے جبکہ ویٹو پاور رکھنے والے پانچ ممالک اقوام متحدہ کے نام سے دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔

۵. عالمی سطح سے ہٹ کر ملکی سطح پر آجائیں تو صورتحال یہ ہے کہ سرے سے ہمارا کوئی قومی رخ ہی متعیّن نہیں ہے۔ ہم نے دستور میں اسلام اور جمہوریت کو قومی پالیسیوں کی اساس قرار دے رکھا ہے کہ حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کی ہوگی اور وہ قرآن و سنت کے مطابق حکومت کو چلانے کے پابند ہوں گے۔ مگر قومی سطح پر ہم اسلام اور جمہوریت میں سے کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہیں اور چھ عشرے گزر جانے کے باوجود آج بھی ہم اس بحث میں الجھے ہوئے ہیں کہ یہ ملک اسلامی ہے یا سیکولر؟ اور اس کی پالیسیوں میں قرآن و سنت کی راہنمائی کا کوئی حصہ ہونا چاہیے یا نہیں؟ قومی سطح پر ہماری یہ دورخی اور تذبذب ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے، جب تک ہم اس سے نجات حاصل نہیں کریں گے، کسی سمت بھی پیشرفت نہیں کر سکتے۔

۶. ہمارا ایک بڑا مسئلہ قومی خود مختاری کا ہے جس سے ہم مسلسل محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

ڈرون حملوں اور ملکی معاملات میں بیرونی مداخلت نے ہماری خود مختاری کو چیلنج کر رکھا ہے مگر سیاسی قیادتوں کے پاس مذمت کے بیانات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ منتخب پارلیمنٹ قومی خود مختاری کے حوالہ سے ایک متفقہ قرارداد پاس کرتی ہے لیکن اس پر عملدرآمد کا حوصلہ کسی میں نہیں ہے۔

۷. ہمارا ایک بڑا قومی مسئلہ معاشی عدم توازن کا ہے۔ ایک طرف عیاشی، فضول خرچی اور نمود و نمائش انتہا کو پہنچ چکی ہے اور دوسری طرف فاقہ اور فقر کے باعث عام آدمی خودکشیاں کر رہے ہیں۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے، لوڈشیڈنگ نے عوام کی زندگی اجیرن کر دی ہے جبکہ ہمارے حکمرانوں کو معاملات کو سلجھانے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی۔

۸. ایک بڑا مسئلہ "دہشت گردی" کا ہے۔ ہم نے دہشت گردی کی کوئی تعریف متعیّن کرائے بغیر مبینہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں شرکت اختیار کر رکھی ہے جس نے دہشت گردی، تحریک آزادی، اور قومی خود مختاری کے مسائل کو گڈمڈ کر کے رکھ دیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے بھی ملک کے اندر دہشت گردی اور باہمی قتل و قتال کا بازار گرم ہے۔ یہ دہشت گردی بظاہر مذہب کے نام پر ہے لیکن صرف مذہب کے نام پر نہیں ہے کیونکہ کراچی میں ہونے والی دہشت گردی میں مذہب کا کوئی کردار نہیں ہے اور نہ ہی بلوچستان میں ہونے والے قتل و قتال میں مذہب فریق ہے۔ پھر اس مبینہ دہشت گردی کا صرف ملک کے اندر کے معاملات سے تعلق نہیں ہے بلکہ عالمی قوتیں اور بین الاقوامی ادارے اس میں پوری قوت کے ساتھ شریک ہیں اور سب سے زیادہ کردار انہیں کا ہے۔ ملک کے اندر ہونے والے اس خوفناک قتل و قتال میں صرف مذہبی فرقہ واریت اور مذہبیت کو ذمہ دار قرار دینا کسی طرح بھی انصاف کی بات نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی ایجنسیاں، لسانیت اور علاقائی قومیتیں اس کا اہم فریق ہیں، لیکن ہم سب عوامل کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف مذہبی عناصر کو رگڑتے چلے جا رہے ہیں۔

۹. ہمارا ایک مسئلہ تہذیبی شناخت کے تحفظ کا ہے کہ مغربی تہذیب و ثقافت کی یلغار ہماری تہذیبی شناخت کو دھیرے دھیرے ختم کرتی جا رہی ہے، اور مغرب کی یہ دھاندلی ہم پر مسلط ہے کہ اقوام متحدہ کا منشور تو قومی اور علاقائی تہذیبوں اور ثقافتوں کے تحفظ کی بات کرتا

ہے مگر مغرب اسی اقوام متحدہ کے زیر سایہ اپنی تہذیب و ثقافت کو دنیا پر مسلط کرنے کے لیے علاقائی اور قومی ثقافتوں کو بلڈوز کرتا جا رہا ہے۔ اس نے میڈیا، لابنگ اور تخویف و تحریص کے سارے وسائل اسلامی ثقافت کی اس جنگ میں جھونک رکھے ہیں۔

حضرات محترم! میں نے آپ بزرگوں اور اہل دانش کے سامنے امتِ مسلمہ کو درپیش مسائل کی صرف ایک فہرست پیش کی ہے جو مکمل نہیں ہے، البتہ اس سے ایک ہلکا سا عمومی تناظر سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد اس سلسلہ میں علماء کے کردار کی طرف آتا ہوں کہ میرے ناقص خیال میں ان کی ذمہ داری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱. وہ پہلے خود ان مسائل کا احساس اور شعور حاصل کریں، اس لیے کہ علماء کرام اور اہل دانش کی اکثریت کو سرے سے ان مسائل و مشکلات کا احساس اور ادراک تک حاصل نہیں ہے۔
۲. امتِ مسلمہ میں اس کے مسائل و مشکلات کا شعور بیدار کریں، قرآن و سنت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کے سامنے ان مسائل کا حل پیش کریں، ان حوالوں سے نئی نسل کے ذہنوں میں پیدا کیے جانے والے شکوک و شبہات کے ازالے کا اہتمام کریں، اور مسلم رائے عامہ کو بیدار کرنے کی طرف سنجیدہ توجہ دیں۔
۳. خود کو صرف فکری راہنمائی تک محدود نہ رکھیں بلکہ مسائل کے حل کے عملی راستوں کی تشکیل اور تنظیمی و تحریکی ماحول پیدا کرنے کی کوشش بھی کریں۔

میں ایک بار پھر اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے ارباب علم و دانش کی اس محفل میں حاضری، چند احباب کے ارشادات سننے اور کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقع دیا۔ اللہ تعالیٰ کونسل کی اس کاوش کو قبول فرمائیں اور ہم سب کو اپنی ذمہ داریاں صحیح طریقہ سے سرانجام دینے کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

انٹرنیشنل کرائسس گروپ کا
پاکستان میں شرعی قوانین ختم کرنے کا مطالبہ

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ ۔ جنوری ۲۰۱۲ء)

روزنامہ جنگ لاہور میں ۲۰ دسمبر ۲۰۱۱ء کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ ملاحظہ فرمائیے!

''اسلام آباد (طاہر خلیل) پاکستان پر دباؤ بڑھانے کے ایک اور حربہ کے طور پر برسلز میں قائم مغربی ترجمان انٹرنیشنل کرائسس گروپ نے وفاقی شرعی عدالت کو ختم اور اسلامی نظریاتی کونسل کے اختیارات محدود کرنے کا مطالبہ کر دیا ہے۔ آئی سی جی نے ''پاکستان میں اسلامی پارٹیاں'' کے عنوان سے رپورٹ جاری کر دی ہے۔ تازہ رپورٹ میں جماعتِ اسلامی، جمعیۃ علماء اسلام (فضل الرحمٰن)، جمعیۃ علماء اسلام (سمیع الحق)، مرکزی جمعیت اہلحدیث، جمعیت علمائے پاکستان، سنی تحریک، اسلامی تحریکِ پاکستان (کالعدم تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ)، تحریکِ نفاذِ فقہ جعفریہ (موسوی گروپ)، مجلس وحدت المسلمین سمیت دیگر مذہبی و سیاسی جماعتوں کے کردار و کارکردگی اور سرگرمیوں کے حوالے سے تفصیلی رپورٹس جاری کی ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں ۲۵ مذہبی پارٹیاں سرگرمِ عمل ہیں مگر انتخابات میں انہیں کبھی عوامی پذیرائی نہیں مل سکی تاہم آمرانہ ادوار میں یہ جماعتیں خوب پروان چڑھیں۔ رپورٹ کے مطابق سابق آمرانہ دور میں ۲۰۰۲ء کے دوران دو صوبوں میں ایم ایم اے اقتدار میں ہونے کے باوجود اچھی حکمرانی قائم نہ کر سکی جس کی وجہ سے ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں اسے ۲۰۰۲ء کے شرح تناسب کی طرح پذیرائی نہ مل سکی، تاہم آئی سی جی نے اعتراف کیا کہ جے یو آئی (فضل الرحمٰن) اور جماعتِ اسلامی آج بھی عوامی مقبولیت کی حامل مذہبی جماعتیں ہیں اور عمران خان کی تحریک انصاف نے پیپلز پارٹی کی حکومت کے

خلاف مؤثر مہم چلا رکھی ہے۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ کی رپورٹ میں مطالبہ کیا گیا کہ آئینی ترمیم کے ذریعے وفاقی شرعی عدالت کو ختم کر دیا جائے اور اسلامی نظریاتی کونسل کی غیر جانبداری کے لیے یقینی اقدامات کیے جائیں، مدارس اصلاحات کا کام تیز کیا جائے اور تمام مدارس کو شفاف طریقے سے رجسٹرڈ کیا جائے، طلبہ یونینز پر پابندی ختم کی جائے۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ کا مطالبہ ہے کہ ناموس رسالت، قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے اور حدود آرڈیننس ختم کرنے کے لیے سیاسی پارٹیوں کے قومی مکالمے کا اہتمام کیا جائے۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ آئی سی جی کی رپورٹ کا مقصد پاکستانی معاشرے کو تقسیم کرنا اور دباؤ بڑھانے کا حربہ ہو سکتا ہے۔"

انٹرنیشنل کرائسس گروپ کا یہ مطالبہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ مغرب کی لابیاں اور ادارے ایک عرصہ سے پاکستان کے اسلامی تشخص اور ملک میں نافذ بعض اسلامی قوانین کو ختم کرانے کے لیے مطالبات کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اب تک یہ مطالبات باضابطہ طور پر یورپین پارلیمنٹ، بین الاقوامی انسانی حقوق کمیشن، امریکی حکومت اور ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے بیسیوں مرتبہ سامنے آ چکے ہیں اور اب اس فہرست میں انٹرنیشنل کرائسس گروپ کا نام بھی شامل ہو گیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں میں وطن عزیز میں اسلامی قوانین کے نفاذ اور ان پر عملدرآمد کے بارے میں تذبذب اور گومگو کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کی ایک وجہ یہ بین الاقوامی دباؤ بھی ہے جو اسلامی قوانین کے نفاذ کے حوالہ سے انہیں خوفزدہ رکھے ہوئے ہے یا اس سلسلہ میں ان کا بظاہر معقول بہانہ بنا ہوا ہے، جس کی آڑ میں وہ خود اسلامی قوانین کے نفاذ میں رکاوٹ ہیں۔

ہماری ہمیشہ یہ گزارش چلی آ رہی ہے کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کا جذبہ رکھنے والی جماعتوں اور حلقوں کو یہ مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے عملی ایجنڈے میں شامل کرنا چاہیے کہ اس بین الاقوامی دباؤ کے اسباب و عوامل کا پوری طرح ادراک کرتے ہوئے اس کے تدارک کے لیے علمی، فکری، سیاسی اور عملی طور پر کیا رویہ اور حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس کے بغیر ہم اس مسئلہ کا کوئی صحیح حل تلاش نہیں کر پائیں گے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اپریل ۲۰۱۲ء)

روزنامہ ایکسپریس گوجرانوالہ ۱۹ مارچ ۲۰۱۲ء میں شائع ہونے والی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ:

"اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے پارلیمنٹ کو بھجوائی گئی ۹۵ ہزار کے قریب سفارشات اور ۷۰ کے لگ بھگ رپورٹیں قانون سازی کا حصہ بننے کی بجائے کاغذوں کی نذر ہو کر رہ گئی ہیں اور ان رپورٹوں کو اب تک کسی ایجنڈے کا حصہ نہیں بنایا گیا۔ اس حوالہ سے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی نے وزیراعظم سے ملاقات کا وقت مانگا مگر باضابطہ جواب نہیں دیا گیا۔ کونسل کی گزشتہ چند سال میں صرف خواتین کے حقوق اور جبری مشقت کے بارے میں سفارشات پر کسی حد تک عمل کیا گیا جبکہ باقی سفارشات بے معنی ہو کر رہ گئیں۔ قریبی ذرائع کے مطابق ان سفارشات اور رپورٹس میں ۱۹۶۰ء سے ملک میں نافذ عائلی قوانین پر نظر ثانی کرانے کی بھی بات کی گئی ہے تاہم یہ رپورٹس پارلیمنٹ کے تہہ خانے میں دبا دی گئی ہیں۔"

اسلامی نظریاتی کونسل دستورِ پاکستان کے تحت قائم ہونے والا ایک آئینی ادارہ ہے جس کے قیام کی غرض ہی یہ ہے کہ وہ ملک میں رائج قوانین پر نظر ثانی کرتے ہوئے انہیں قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات مرتب کرے اور اس کی سفارشات کو باقاعدہ پارلیمنٹ میں پیش کر کے قانون سازی کے ذریعہ ملکی قوانین کا حصہ بنایا جائے۔ جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل کی محنت اور علمی کاوش کا تعلق ہے مختلف ادوار میں کونسل کی محنت قابلِ داد ہے اور اس نے اپنے حصہ کا فریضہ سرانجام دینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی جس کا ثبوت اس خبر میں موجود ہے کہ پچانوے ہزار کے لگ بھگ سفارشات اور ستر کے قریب رپورٹیں پارلیمنٹ میں پیش کرنے کے لیے وزارت قانون کی میز پر پڑی ہیں مگر ان میں سے ایک دو کے سوا باقی سب سفارشات اور رپورٹیں دستور کے مطابق پارلیمنٹ میں پیش ہونے کی بجائے وزارت قانون کے فریزر میں منجمد پڑی ہیں۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا

ہے کہ ہماری حکومتوں کو ملکی قوانین کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے سے سرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ وہ اس کام میں عملاً گریز اور ٹال مٹول سے کام لے رہی ہیں۔

ملک میں نفاذِ اسلام کے لیے ہتھیار اٹھانے کی ہم نے کبھی حمایت نہیں کی اور اب بھی اس کو روا نہیں سمجھتے مگر سوال یہ ہے کہ جب ہماری حکومتوں کا نفاذِ اسلام کے بارے میں طرزِ عمل مسلسل یہ چلا آرہا ہے اور ہماری دینی سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے میں بھی اس مسئلہ نے عملاً ثانوی حیثیت اختیار کر رکھی ہے تو نفاذ اسلام کے لیے مخلصانہ جدوجہد کرنے والوں کے لیے "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق بالآخر ہتھیار اٹھا لینے کے سوا اور کون سا آپشن باقی رہ جاتا ہے؟ اس سنجیدہ سوال کا جواب صرف حکمرانوں کے ذمہ نہیں بلکہ ہماری دینی سیاسی جماعتوں کو بھی اس سوال کی سنگینی کا بہرحال احساس کرنا ہوگا۔

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل کی پریس کانفرنس

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۱۳ء)

روزنامہ پاکستان لاہور میں ۲۴ ستمبر کو شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی نے اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر قانون سازی آئینی تقاضہ ہے اس لیے پارلیمنٹ کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ انہوں نے بتایا کہ گزشتہ بارہ سال کے دوران اسلامی نظریاتی کونسل کی منظور کردہ ہزاروں سفارشات ایک بار پھر پارلیمنٹ کو بھجوادی گئی ہیں تاکہ ان کے بارے میں قانون سازی کے دستوری تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔

اسلامی نظریاتی کونسل جب سے قائم ہوئی ہے، ملک کے قوانین کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے اور آج کی ضروریات کے مطابق اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے سفارشات پیش کرنے کا عمل مسلسل جاری رکھے ہوئے ہے اور ہر دور میں ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام اور ممتاز ماہرین قانون اس میں شریک رہے ہیں۔ اس کے بعض فیصلوں اور سفارشات سے علمی بنیادوں پر اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کی کارکردگی اور محنت قابلِ داد ہے اور ہمارے خیال میں یہ آئینی ادارہ دستورِ پاکستان کے تحت اس پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برا ہو رہا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق چیئرمین اقبال احمد خان مرحوم نے، جو وفاقی وزیر قانون بھی رہے ہیں اور ہمارے ذاتی دوستوں میں سے تھے، ایک موقع پر بتایا کہ ملک میں رائج تمام قوانین کا تفصیلی جائزہ لے کر انہیں قرآن و سنت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے جامع سفارشات کا ایک مجموعہ وہ باضابطہ طور پر وزارت قانون کے سپرد کر چکے ہیں جو ہزاروں سفارشات پر مشتمل ہے، لیکن وزارت قانون میں اس کے حوالہ سے دلچسپی کا کوئی ماحول دکھائی نہیں دے رہا۔ اب وہی شکایت کونسل کے موجودہ چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی نے دہرائی ہے اور بتایا ہے کہ ہزاروں سفارشات جو پہلے بھی پارلیمنٹ کو بھجوائی گئی تھی اب دوبارہ بھجوادی گئی ہیں تاکہ پارلیمنٹ ان کے بارے میں قانون سازی کر سکے۔

مگر ہمارا خیال ہے کہ یہ سفارشات بھی حسبِ سابق وزارت قانون کے ڈیپ فریزر کی نذر ہو جائیں گی کیونکہ قیامِ پاکستان کے بعد سے ہماری اسٹیبلشمنٹ کا یہ طرز عمل چلا آرہا ہے کہ اسلامی قوانین کے حوالہ سے جہاں عوامی دباؤ کا سامنا ہو وہاں رسمی طور پر کچھ پیشرفت کر لی جائے جبکہ اگر دینی حلقوں اور عوام کے دباؤ سے کوئی قانون نافذ کرنا پڑ جائے تو اس پر عملدرآمد اور اس کے مؤثر نفاذ کی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دی جائے۔ یہ انتہائی افسوسناک صورتحال مسلسل موجود ہے اور اس کے بارے میں دینی حلقوں کو متفقہ طور پر کوئی راستہ اختیار کرنا ہوگا، ہمارا خیال ہے کہ اگر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ اور تحفظ ناموس رسالتؐ کے قانون کی طرح اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عملدرآمد کے لیے مشترکہ جدوجہد کا اہتمام کیا جاسکے تو اس سلسلہ میں پیشرفت کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے خلاف افسوسناک مہم

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ فروری ۲۰۱۴ء)

گزشتہ دنوں سینٹ آف پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے راہنماؤں نے اسلامی نظریاتی کونسل کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ روزنامہ پاکستان لاہور میں ۲۱ جنوری کو شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق ان دونوں سیاسی جماعتوں کی طرف سے کہا گیا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور کی باقیات میں سے ہے اور اپنا کام مکمل کر چکی ہے اس لیے اس کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق اس لیے وجود میں آئی تھی کہ اسلامی علوم اور جدید قانونی تعلیم کے ماہرین پر مشتمل ایک ایسا آئینی فورم موجود ہونا چاہیے جو حکومت اور عوام کو در پیش مختلف مسائل میں تحقیق اور مطالعہ کے بعد اسلامی تعلیمات کی روشنی میں راہنمائی فراہم کرے اور ملک میں مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سفارشات مرتب کرے۔ اسلامی نظریاتی کونسل میں ہر دور میں ملک کے ممتاز علماء کرام، مختلف مکاتبِ فکر کے فقہی ماہرین اور جدید قانون کے نامور اسکالرز شامل رہے ہیں اور انہوں نے مختلف ادوار میں قومی و معاشرتی مسائل میں حکومت اور عوام کی راہنمائی کا فریضہ مسلسل سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ملک میں مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر انہیں اسلامی تعلیمات کے مطابق بنانے کے لیے سفارشات کی ایک جامع رپورٹ حکومت کو پیش کی ہے۔ اس لیے کسی مسئلہ پر اسلامی نظریاتی کونسل کی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے آئینی کردار اور محنت و کاوش سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ ملک کے دینی حلقوں کی طرف سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ دستور کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کی جائے جس کے لیے دستور خود حکومت کو پابند بناتا ہے۔ مگر اس دستوری تقاضے کو پورا کرنے کی بجائے سرے سے اسلامی نظریاتی کونسل کے وجود اور اس کی ضرورت و افادیت کو ہی متنازعہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو انتہائی افسوسناک بات ہے۔

یہ کہنا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی ضرورت نہیں رہی، زمینی حقائق سے انحراف کے مترادف ہے، اس لیے کہ جب تک کونسل کی سفارشات کو متعلقہ منتخب ایوانوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کا کام مکمل نہیں کر لیا جاتا اس وقت تک کونسل کا وجود اس دستوری ضروریات کے ناگزیر تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ ملک کے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے علاوہ پیش آمدہ مسائل میں حکومت اور عوام کی راہنمائی کا کام ایک مستقل قومی ضرورت ہے، اس لیے جب تک دستور موجود ہے یہ ضرورت بھی باقی رہے گی اور اسلامی نظریاتی کونسل کی ضرورت اور کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح اسلامی نظریاتی کونسل کو جنرل ضیاء الحق مرحوم کی باقیات قرار دینا حقائق کے یکسر منافی ہے، اس لیے جنرل ضیاء الحق مرحوم کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے بھی یہ دستوری ادارہ موجود تھا کیونکہ اس کا آغاز ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی حکومت کے دور میں ۱۹۷۳ء کے دستور کے نفاذ کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔

اس بنا پر ہم پاکستان پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کے راہنماؤں سے گزارش کریں گے کہ وہ دستور اور اس کے ناگزیر تقاضوں سے انحراف کی راہ اختیار نہ کریں بلکہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اب تک ملکی قوانین کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے جو سفارشات پیش کی ہیں انہیں اسمبلیوں میں لا کر ان کے مطابق قانون سازی کا اہتمام کریں۔ خاص طور پر ہم عرض کریں گے کہ پیپلز پارٹی اگر اپنے بانی جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے دورِ حکومت میں بننے والے دستور اور اس کے تحت قائم ہونے والے اداروں کی نفی شروع کر دے گی تو خود اس کا سیاسی تسلسل اور بھٹو مرحوم کے ساتھ اس کی وفاداری سوالیہ نشان بن کر رہ جائے گی، اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کرنے کا مطالبہ پی پی پی کے فورم سے قطعی طور پر ناقابلِ فہم ہے اور پی پی پی کی قیادت کو اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن واضح کرنی چاہیے۔

سودی نظام کے خلاف دینی حلقوں کی مشترکہ مہم

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰ فروری ۲۰۱۴ء)

قائداعظم محمد علیؒ جناح نے ۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر اپنے خطاب میں کہا تھا کہ:

> ''میں نہایت اشتیاق کے ساتھ آپ کی ریسرچ فاؤنڈیشن کے تحت موجود بینکنگ نظام کو اسلامی معاشی اور معاشرتی افکار کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سعی و کوشش کو دیکھنا چاہوں گا۔ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے کچھ ناقابلِ حل مسائل پیدا کیے ہیں اور بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی معجزہ ہی اسے تباہی سے بچا سکتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے مابین معاشی عدل قائم کرنے اور عالمی سطح پر ہونے والی کشمکش کے تدارک میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس کے برخلاف یہی نظام ماضی میں ہونے والی دو عالمی جنگوں کا سبب بنا ہے۔ دنیائے مغرب اپنی صنعتی ترقی اور مشینی ایجادات واختراعات کے باوجود بدترین انتشار میں مبتلا ہے جو تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد معاملہ ہے۔ مغربی معاشی نظریے اور عمل کو اختیار کرنا ہمیں اس آسودہ معاشرے تک پہنچانے کا باعث نہیں ہو سکتا جو ہماری منزل ہے۔ ہمیں اپنی تقدیر خود اپنے ظروف واحوال کے مطابق لکھنی ہوگی اور اسلام کے معاشرتی عدل اور انصاف پر مبنی ایک معاشی نظام کو دنیا کے سامنے پیش کرنا ہوگا جس کے ذریعہ ہم بحیثیت مسلمان اپنا فرض ادا کر سکیں اور انسانیت کے سامنے پیغام امن پیش کر سکیں جو اس کی فلاح و بہبود، انبساط اور ترقی کا ضامن ہوگا۔''

مگر بانی پاکستان کی اس واضح ہدایت کے باوجود ملک کا معاشی نظام ابھی تک مغرب کے معاشی نظریات اور اصول وضوابط کے مطابق چل رہا ہے اور اس میں اصلاح کی کوئی کوشش کامیاب ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم قومی معیشت میں سودی نظام اور مغرب کے معاشی

اصولوں کے تمام تر تلخ نتائج، نحوستوں اور تباہ کاریوں کو دیکھتے بلکہ بھگتتے ہوئے بھی میر تقی میر مرحوم کے اس شعر کا مصداق بنے ہوئے ہیں کہ:

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

جس معاشی نظام نے ہماری قومی معیشت کو کھوکھلا کرکے رکھ دیا ہے اور جو ہمارے ایمان و عقیدہ سے متصادم ہونے کے ساتھ ساتھ قومی مفادات کے بھی منافی ہے، بدستور ہم پر مسلط ہے اور رولنگ کلاس قوم کو اس دلدل سے نجات دلانے کے لیے کوئی راستہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

پاکستان میں نافذ ہونے والے ہر دستور میں اس کا وعدہ کیا گیا کہ قوم کو سودی نظام سے جلد از جلد نجات دلائی جائے گی۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۳ء کے دستور کے آرٹیکل ۳۸۰ کی ذیلی دفعہ F میں کہا گیا ہے کہ ''حکومت جس قدر جلد ممکن ہوسکے ربا کو ختم کرے گی۔''

قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے دستوری طور پر قائم ہونے والے ادارہ اسلامی نظریاتی کونسل نے ۳دسمبر ۱۹۶۹ء میں قرار دیا تھا کہ:

> ''موجودہ بینکاری نظام کے تحت افراد، اداروں اور حکومتوں کے درمیان قرضوں اور کاروباری لین دین میں اصل رقم پر جو اضافہ یا بڑھوتری کی جاتی ہے وہ ربا کی تعریف میں آتی ہے، سیونگ سرٹیفیکیٹ میں جو اضافہ دیا جاتا ہے وہ بھی سود میں شامل ہے، پراویڈنٹ فنڈ اور پوسٹل بیمہ زندگی میں جو سود دیا جاتا ہے وہ بھی ربا میں شامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صوبوں، مقامی اداروں اور سرکاری ملازمین کو دیے گئے قرضوں پر اضافہ بھی سود ہی کی ایک قسم ہے لہٰذا یہ تمام صورتیں حرام اور ممنوع ہیں۔''

اسلامی نظریاتی کونسل نے اس کے بعد سودی نظام کے خاتمے اور متبادل معاشی نظام کے حوالہ سے ایک جامع رپورٹ ۲۵ جون ۱۹۸۰ء کو حکومت کے سامنے پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ ان تجاویز پر عمل کی صورت میں دو سال کے اندر پاکستان کی معیشت کو سود سے پاک کیا جاسکتا ہے۔

وفاقی شرعی عدالت نے ۱۹۹۰ء میں اس سلسلہ میں ایک واضح فیصلہ صادر کیا جس میں تمام مرّوجہ سودی قوانین کا جائزہ لے کر وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی کہ وہ ۳۰ جون ۱۹۹۲ء تک ان قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق تبدیل کرلیں ورنہ یہ سب قوانین یکم جولائی ۱۹۹۲ء تک خود بخود کالعدم ہو جائیں گے۔

وفاقی شرعی عدالت کے اس تاریخی فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیل دائر کی گئی

جس کی سماعت میں سات سال کی مسلسل تاخیر کے بعد ۱۹۹۹ میں اس کے لیے بینچ تشکیل دیا گیا اور سپریم کورٹ نے وفاقی شرعی عدالت کی توثیق کرتے ہوئے کہ وہ جون ۲۰۰۱ء تک وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر عمل مکمل کر کے ملک کو سود سے پاک کر دے۔ مگر یہ فیصلہ بھی اب اپیل در اپیل کے مراحل میں ہے اور حکومت نے اس پر عمل کرنے کی بجائے تاخیری حربوں کا سہارا لے رکھا ہے۔

اس پس منظر میں ''ملّی مجلسِ شرعی'' کی تحریک پر گزشتہ دو تین ماہ کے دوران مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ راہ نماؤں کے درمیان مرکز جماعت الدعوۃ، دفتر جماعتِ اسلامی، دفتر تنظیم اسلامی اور مسجد خضراء لاہور میں باہمی مشاورت کی متعدّد نشستیں ہوئی ہیں جن میں یہ طے پایا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت میں زیر سماعت اپیل کے حوالہ سے ''ملّی مجلسِ شرعی پاکستان'' جماعتِ اسلامی اور تنظیمِ اسلامی کے تعاون سے علمی و فکری جدوجہد جاری رکھے گی جبکہ ملک کے دینی حلقوں میں اس مقصد کے لیے باہمی ربط و تعاون کے فروغ اور عوام میں بیداری و آگہی پیدا کرنے کی غرض سے ایک مستقل فورم ''تحریک انسداد سود پاکستان'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور اس کی رابطہ کمیٹی کے کنوینر کی ذمہ داری راقم الحروف کو سونپی گئی ہے۔

رابطہ کمیٹی میں مولانا عبد المالک خان، مولانا عبد الرؤف فاروقی، مولانا امیر حمزہ، علامہ خلیل الرحمٰن قادری، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، ڈاکٹر محمد امین، مولانا عبد الرؤف ملک، سردار محمد خان لغاری، قاری محمد یعقوب شیخ، مولانا حافظ عبد الغفار روپڑی، جناب حافظ عاکف سعید، مولانا مجیب الرحمٰن انقلابی، میاں محمد اویس، مولانا حافظ محمد نعمان، مولانا قاری جمیل الرحمٰن اختر، اور سید جواد حسین نقوی کے علاوہ ممتاز دانشور جناب اوریا مقبول جان بھی شامل ہیں، جبکہ جن حضرات نے خطوط اور زبانی پیغامات کے ذریعہ تائید و حمایت کی ہے، ان میں مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی، مولانا محمد اویس نورانی، مولانا قاری زوار بہادر، ڈاکٹر زاہد اشرف، مولانا عبد القیوم حقانی اور مولانا پیر عبد الرحیم نقشبندی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس مہم کے آغاز کے طور پر ۲۱ فروری کو ''یوم انسداد سود'' کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس موقع پر مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور خطباء نے جمعۃ المبارک کے خطبات میں سودی نظام کی نحوست و حرمت کے ساتھ ساتھ مقتدر طبقات کے تاخیری حربوں کا ذکر کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ملک کو سودی نظام کی لعنت سے نجات دلا کر بابرکت اسلامی معاشی نظام کے نفاذ کی راہ ہموار کرے۔

ملک بھر میں تمام مکاتبِ فکر اور طبقات کے علماء کرام، ارباب دانش، راہ نماؤں اور کارکنوں سے گزارش ہے کہ اس کار خیر میں ہمارے ساتھ شریک ہو کر ملکی نظام معیشت کو سود کی لعنت سے نجات دلانے میں کردار ادا کریں۔

دستور کی بالادستی اور قومی خود مختاری کا مسئلہ

(۲۶فروری ۲۰۱۴ء کو ایوان اقبال، لاہور میں خطاب)

مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ نے اب سے نصف صدی قبل قادیانی امت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کو مباہلہ کا چیلنج دیا تھا جس پر دونوں طرف سے خط وکتابت بھی ہوئی تھی۔ دریائے چناب کے دو پلوں کے درمیان مولانا چنیوٹیؒ اپنے ساتھیوں سمیت مقررہ تاریخ کو سارا دن انتظار کرتے رہے مگر دوسری طرف سے کوئی نہ آیا۔ اس کے بعد ہر سال مولانا چنیوٹیؒ اسی مقام پر اس چیلنج کو دہراتے تھے اور اب اس کی یاد میں ۲۶ فروری کو سالانہ فتح مباہلہ کانفرنس منعقد ہوتی ہے جس میں مختلف مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور دانشور خطاب کرتے ہیں۔ اس سال یہ کانفرنس دو حصوں میں ہوئی۔ ۲۵ فروری کو مغرب کے بعد ادارہ مرکزیہ دعوت وارشاد چنیوٹ میں کانفرنس کا ایک سیشن ہوا جبکہ دوسرا سیشن ۲۶ فروری کو صبح دس بجے شام ۵ بجے تک ایوان اقبال لاہور کے وسیع ہال میں انعقاد پذیر ہوا۔ انٹرنیشنل ختمِ نبوت موومنٹ کے سربراہ فضیلۃ الشیخ مولانا عبد الحفیظ مکی نے کانفرنس کی صدارت کی جبکہ سیکرٹری جنرل مولانا ڈاکٹر احمد علی سراج اور مولانا چنیوٹیؒ کے جانشین مولانا محمد الیاس چنیوٹی ایم پی اے کی نگرانی میں کانفرنس کے دونوں سیشن کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ مختلف مکاتبِ فکر اور طبقات کے ممتاز اربابِ علم و دانش نے خطاب کیا اور راقم الحروف کو بھی دونوں نشستوں میں کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ نذر قارئین ہے۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج کی اس کانفرنس کے ذریعہ ہم جہاں عقیدۂ ختم نبوت اور تحریکِ ختم نبوت کے ساتھ اپنی بے لچک وابستگی اور عزمِ نو کا اظہار کر رہے ہیں، وہاں تحریکِ ختم نبوت کے عظیم مجاہد حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ کو بھی خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کی عظیم جدوجہد، یاد اور اس کے تسلسل میں ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند سے بلند تر فرمائیں۔ آمین۔

آج ملک کا سب سے اہم مسئلہ جس نے قوم کے ہر فرد کو مضطرب اور بے چین کر رکھا ہے، ملکی سالمیت، خود مختاری اور امن کے قیام کا مسئلہ ہے۔ بیرونی مداخلت بالخصوص ڈرون حملوں نے بدامنی

کی جو صورتحال ہمارے ملک میں پیدا کی ہے اور اندرونی دہشت گردی اور خودکش حملوں میں جس طرح بے گناہ شہریوں کا خون بہایا گیا ہے وہ سب کے لیے پریشان کن ہے اور ملک و قوم کو اس افسوسناک بلکہ المناک صورتحال سے نجات دلانے کے لیے مذاکرات کی بات چل رہی ہے۔ وطن عزیز کی سلامتی، ریاست کا تحفظ و وقار، قومی خودمختاری، دستور کی بالادستی، قانون کی حکمرانی اور امن عامہ کی بحالی ہم سب کا مسئلہ ہے۔ اور ہماری ترجیحات میں اسلام اور پاکستان سب سے مقدم ہیں۔ اسی حوالہ سے دستور کی بالادستی کا تذکرہ ہو رہا ہے اور اس پر بحث چل رہی ہے، کہا جا رہا ہے کہ تحریک طالبان پہلے دستور کو تسلیم کرے اور اس کی بالادستی کا اعلان کرے تب مذاکرات صحیح سمت آگے بڑھیں گے۔ ہم بھی اس کی حمایت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دستور کی بالادستی کو تسلیم کیا جائے، خودکش حملے بند ہوں اور آپریشن کا سلسلہ روک کر مذاکرات کے ذریعہ امن قائم کیا جائے۔

لیکن اس سلسلہ میں ایک اہم پہلو یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ پاکستانی طالبان دستور کو مانتے ہیں یا نہیں اور مذاکرات کے لیے وہ دستور کی بالادستی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں، اس مسئلہ میں ہم حکومت کے ساتھ ہیں اور قومی موقف کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس گروہ نے گزشتہ چار عشروں سے دستور کی بالادستی کو قبول کرنے سے انکار کر رکھا ہے ان کے بارے میں حکومتی پالیسی کیا ہے؟ ۱۹۷۴ء میں جب منتخب پارلیمنٹ نے متفقہ دستوری ترمیم کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا فیصلہ کیا تھا، تب سے قادیانی گروہ دستور کے اس فیصلے کو ماننے سے انکاری ہے۔ وہ نہ صرف دستور کی دفعات اور پارلیمنٹ کے متفقہ فیصلے سے منحرف ہے بلکہ اس نے دنیا بھر میں بیسیوں مقامات پر دستورِ پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے اور لابنگ کے مورچے قائم کر رکھے ہیں اور پاکستان کے نظریاتی تشخص، دستور کی اسلامی دفعات، عقیدۂ ختمِ نبوت کے بارے میں قوم کے موقف اور ناموس رسالتؐ کے قانون کے خلاف مہم جاری رکھی ہوئی ہے۔ میں حکومت پاکستان، ملک کے ارباب دانش اور خاص طور پر میڈیا کے پالیسی سازوں اور مختلف چینلوں کے اینکرز سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ دستورِ پاکستان سے اس انحراف اور اس کے خلاف اس مہم کا بھی نوٹس لیں۔ اگر دستور سے منحرف ایک گروہ کے خلاف آپریشن کی بات اس شد و مد کے ساتھ کی جا رہی ہے تو اسی دستور سے منحرف دوسرے گروہ کے خلاف آپریشن کی بات کیوں نہیں کی جاتی، کیا یہ بھی دستور کی بالادستی کا تقاضہ نہیں ہے؟

اس حوالہ سے ایک اور بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، ابھی کل ہماری قومی اسمبلی نے ایک متفقہ قرارداد کے ذریعہ سفارش کی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق ملک میں قانون سازی کی جائے۔ میں اس قرارداد کا خیر مقدم کرتا ہوں لیکن دو سادہ سے سوال قوم کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ اسلامی نظریاتی کونسل ۱۹۷۳ء میں دستور کے نفاذ کے بعد قائم ہوئی تھی جس کے ذمہ یہ بات تھی کہ وہ ملک کے تمام قوانین کا جائزہ لے کر خلاف اسلام قوانین کی نشاندہی کرے اور ان کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے تجاویز مرتب کرے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ کام برسوں پہلے مکمل کر دیا تھا، چنانچہ آج ہی کے ایک قومی اخبار نے تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک میں رائج سات سو سے زیادہ غیر شرعی قوانین کی نشاندہی کر کے انہیں اسلام کے مطابق بنانے کے لیے تجاویز مرتب کر کے حکومت کے حوالے کر رکھی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ دستور کے نفاذ کو چار عشرے گزر جانے کے بعد اب قومی اسمبلی کو یہ قرارداد منظور کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کی جائے۔ سارا کام مکمل ہو جانے کے باوجود اب تک قانون سازی کیوں نہیں ہوئی اور کئی عشروں پر محیط اس دستوری اور قانونی خلا کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اگر دستور کو تسلیم نہ کرنے والے مجرم ہیں تو دستور کے اسلامی کردار کو چار عشروں تک معطل رکھنے والوں کے بارے میں ہمارے دانشور کیا فرماتے ہیں؟

پھر اس کے ساتھ ہی ایک سوال یہ بھی ہے کہ قومی اسمبلی یہ سفارش کس سے کر رہی ہے؟ قانون سازی تو خود قومی اسمبلی نے ہی کرنی ہے، گویا قومی اسمبلی خود سے یہ سفارش کر رہی ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کرے۔ کیا یہ قوم کے ساتھ مذاق نہیں ہے؟ میں انتہائی نرم الفاظ میں اپنے حکمرانوں سے صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا کے لیے اس قوم پر رحم کیجئے اور اپنے ملک کے عوام پر ترس کھائیے۔

اس موقع پر یہ بات عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ دستورِ پاکستان کے بیشتر حصوں کو اب تک معطل رکھنے کے نتیجے میں ہی وہ صورتحال پیدا ہوئی ہے جس نے پوری قوم کو کرب و اضطراب سے دوچار کر رکھا ہے۔ اگر دستور پر عمل ہوتا، دستور کے اسلامی کردار کو معطل نہ رکھا جاتا اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی ہو جاتی تو یہ حالات سرے سے پیدا ہی نہ ہوتے۔ اب بھی اس کا حل یہی ہے کہ دستور کا اسلامی کردار بحال کیا جائے اور اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی اور

صوبائی اسمبلیوں میں دستوری تقاضوں کے مطابق باضابطہ پیش کر کے قانون سازی کا اہتمام کیا جائے۔
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سارے مسئلے ختم ہو جائیں گے اور وطن عزیز نہ صرف امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے گا بلکہ ترقی اور خوشحالی کی منزل کی طرف بھی گامزن ہو گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

اسلام اور مغرب،
باہمی افہام وتفہیم کی ضرورت اور تقاضے

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ یکم نومبر ۲۰۱۴ء)

"اسلام اور مغرب، باہمی افہام وتفہیم کی ضرورت اور تقاضے" کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار شاہ فیصل مسجد کے قائداعظم آڈیٹوریم ہال میں منعقد ہوا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی اور اقبال بین الاقوامی ادارہ برائے تحقیق ومکالمہ کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر ڈاکٹر ممتاز احمد اس قومی سیمینار کے داعی اور میزبان تھے۔ جبکہ افتتاحی نشست میں وفاقی وزیر محترم جنرل (ر) عبد القادر بلوچ اور بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر احمد بن یوسف الدریویش بھی شریک ہوئے اور خطاب کیا۔

مجھے پہلے روز کی تین نشستوں میں شرکت کا موقع ملا۔ ظہر سے عصر تک کی نشست کی صدارت کا اعزاز بھی بخشا گیا۔ جبکہ پہلے روز کے مقررین میں مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ ڈاکٹر طاہر مسعود، جناب سجاد میر، پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز، پروفیسر سید متین احمد شاہ، جناب خورشید احمد ندیم، جسٹس (ر) ڈاکٹر محمد الغزالی، پروفیسر علی طارق اور دیگر حضرات شامل تھے۔ "اسلام اور مغرب" کے حوالہ سے مختلف پہلوؤں پر اصحاب فکر و دانش نے اظہارِ خیال کیا۔ اور کچھ گزارشات میں نے بھی پیش کیں۔ سب حضرات کی گفتگو کا احاطہ تو اس کالم میں ممکن نہیں ہے البتہ مختلف اصحاب دانش کے ارشادات میں چند زیادہ اہم اور توجہ طلب نکات قارئین کی دلچسپی کے لیے ذکر کیے جا رہے ہیں۔

- "اسلام اور مغرب کی کشمکش" کا عنوان بجائے خود محل نظر ہے، اس لیے کہ مغرب بحیثیت مغرب اسلام دشمن نہیں ہے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد مغرب میں آباد ہے جس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، حتیٰ کہ فرانس اور جرمنی سمیت بعض ممالک میں اسلام وہاں کا دوسرا بڑا مذہب تسلیم کیا گیا ہے۔ مغرب کی غیر مسلم آبادی میں ایک بڑی تعداد اسلام قبول کر رہی ہے اور مغربی اقوام میں نومسلموں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد

اسلام کا مطالعہ کر رہی ہے، وہ اسلام کی دعوت سننے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے سمجھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ مغرب کی یونیورسٹیوں میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے بہت سے پہلوؤں پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔ اس سب کو استشراق اور اسلام دشمنی کے ساتھ جوڑنا درست نہیں ہے، کیونکہ تحقیق اور ریسرچ کی دنیا میں ہونے والے کام کا ایک بڑا حصہ فی الواقع تلاشِ حق کے دائرے میں آتا ہے جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس میں تعاون کے راستے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور ان سے محاذ آرائی کا اہتمام کرنے والے عناصر اگرچہ طاقتور اور مؤثر ہیں، اور سیاست، معیشت اور میڈیا پر ان کا کنٹرول ہے، مگر وہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔ اس لیے مغرب کے ساتھ بات کرتے ہوئے یا مغرب کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس درجہ بندی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

- اس کشمکش کے بارے میں یہ سمجھ لینا بھی درست نہیں ہے کہ یہ اسلام اور مسیحیت کی لڑائی ہے۔ اسلام اور مسیحیت کی کشمکش صدیوں رہی ہے اور اپنے دائروں میں اب بھی موجود ہے، لیکن اسلام اور مغرب کی موجودہ کشمکش میں مغرب کی قیادت مسیحیت کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ مسیحی مذہب کو سوسائٹی کی قیادت سے دست بردار ہوئے دو صدیاں گزر چکی ہیں۔ اب یہ قیادت سیکولر اور مذہب مخالف عناصر کے ہاتھ میں ہے جو اپنے مقاصد کے لیے مذہب کا نام تو کبھی کبھی استعمال کر لیتے ہیں لیکن خود لا مذہب ہیں، اور ان کی پالیسی اور کردار کی بنیاد بھی مذہب کی نفی اور مخالفت پر ہے۔ وہ اپنا موقف اور ترجیحات بائبل یا آسمانی تعلیمات کے حوالہ سے نہیں بلکہ سوسائٹی کی خواہشات کی روشنی میں طے کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کشمکش دراصل مذہب اور لا مذہبیت، یا خدا پرستی اور ہوا پرستی کے درمیان ہے، اور اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ حقیقت سامنے رہنی چاہیے۔
- اسلام اور مغرب کی اس کشمکش میں دراصل مغرب کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کی مختلف سطحوں اور دائروں سے آگاہی حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ ضروری ہے۔ وہاں اسلام، سیکولرازم اور مسیحیت کے حوالہ سے بیک وقت مختلف لہریں موجود ہیں اور مختلف طبقات سرگرمِ عمل ہیں۔ اس لیے جس طرح مغربی

دنیا میں مشرق کے مطالعہ اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں تحقیقی اور مطالعاتی کام وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے، اسی طرح اسلامی دنیا کے تعلیمی اداروں اور مراکز کو بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ مغربی دنیا کے علمی، فکری اور تہذیبی رجحانات کا رخ کیا ہے۔ اور اسلام اور مسلمانوں کے حوالہ سے ان سے گفتگو اور مکالمہ کی ضروریات کیا ہیں؟ کیونکہ مغرب کو پوری طرح سمجھے بغیر اور مغربی دنیا کے مختلف الجہات رجحانات کو سامنے رکھے بغیر "اسلام اور مغرب" کے بارے میں کوئی صحیح موقف اور طرز عمل طے کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی یہ قرین انصاف ہوگا۔

تین طلاقوں کو تعزیری جرم قرار دینے کی سفارش

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۹ جنوری ۲۰۱۵ء)

اسلامی نظریاتی کونسل نے تین طلاقیں اکٹھی دینے کو تعزیری جرم قرار دینے کی سفارش کی ہے جس پر بعض حلقوں نے تحفظات کا اظہار کیا ہے اور اس پر بحث وتمحیص ہو رہی ہے۔ یہ تجویز دراصل مشرف حکومت کے دوران حدود آرڈیننس میں تحفظ حقوق نسواں کے عنوان سے کی جانے والی ترامیم کے موقع پر سرکردہ علماء کرام کی ایک کمیٹی کی طرف سے ستمبر ۲۰۰۶ء کے دوران سامنے آئی تھی۔ اس کمیٹی میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا مفتی منیب الرحمٰن، مولانا حسن جان شہیدؒ، مولانا مفتی غلام الرحمٰن، مولانا قاری محمد حنیف جالندھری اور ڈاکٹر سرفراز احمد نعیمی شہید کے علاوہ راقم الحروف بھی شامل تھا۔ کمیٹی نے حدود آرڈیننس میں مجوزہ ترامیم پر چودھری شجاعت حسین، چودھری پرویز الٰہی، سردار نصر اللہ خان دریشک اور دیگر حضرات پر مشتمل حکومتی ٹیم سے مذاکرات کیے تھے اور دینی حلقوں کا موقف پیش کیا تھا جسے تحفظ حقوق نسواں بل میں نظر انداز کر دیا گیا۔ اور تحفظ حقوق نسواں ایکٹ کے ذریعہ حدود آرڈیننس کا جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ اس موقع پر علماء کرام کی مذکورہ بالا کمیٹی نے مجوزہ ترامیم کے بارے میں اپنے تحفظات اور تجاویز کے اظہار کے علاوہ اپنی طرف سے مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی تھیں کہ:

۱. خواتین کو عملاً وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے، اس کے سدباب کے لیے مستقل قانون بنایا جائے۔
۲. بعض علاقوں میں خواتین کو ان کی مرضی کے خلاف نکاح پر مجبور کیا جاتا ہے، اس کی روک تھام کے لیے قانون سازی کی جائے اور اسے قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جائے۔
۳. بیک وقت تین طلاقیں دینے کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیا جائے اور ایسی دستاویز لکھنے والے نوٹری پبلک اور وثیقہ نویس کو بھی شریک جرم قرار دیا جائے۔
۴. جبری وٹہ سٹہ یعنی نکاح شغار کو قانوناً جرم قرار دیا جائے۔
۵. قرآن کریم کے ساتھ نکاح کی مذموم رسم کا سدباب کیا جائے۔

۶۔ عورتوں کی خرید و فروخت اور انہیں میراث بنانے کے غیر شرعی رواج اور رسم کا سدباب کیا جائے۔

بیک وقت تین طلاقیں دینے کو قابلِ تعزیر جرم قرار دینے کا پس منظر یہ ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں فقہاء نے طلاق کے تین درجات بیان کیے ہیں۔ (۱) ایک یا دو بار صریح طلاق کے بعد نئے نکاح کے بغیر رجوع کی گنجائش ہوتی ہے۔ (۲) طلاق بائن کے بعد دوبارہ نکاح کی صورت میں ہی میاں بیوی اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ (۳) تیسری طلاق واقع ہو جانے پر قرآن کریم نے دوبارہ نکاح کی گنجائش نہیں دی جب تک کہ عورت کا نکاح دوسری جگہ نہ ہو، اور وہاں سے خاوند کی وفات یا طلاق کے ذریعہ فارغ نہ ہو جائے۔ طلاق کے ان تین درجات میں فقہاء کرام نے پہلی صورت کو سنت کے مطابق قرار دیا ہے جبکہ تین طلاقیں اکٹھی دینے کو طلاق بدعی شمار کیا ہے۔

ہمارے ہاں عام طور پر لوگ طلاق کے مسائل اور اس کی ترتیب و تفصیل سے آگاہ نہیں ہوتے۔ حتیٰ کہ وثیقہ نویس اور نوٹری پبلک حضرات کی اکثریت بھی ان نزاکتوں سے بے خبر ہوتی ہے۔ اس لیے کوئی مسلمان غصہ میں ان کے پاس طلاق لکھوانے کے لیے آتا ہے تو وہ رٹے رٹائے جملے لکھ کر اسے سناتے ہیں اور اس سے دستخط کروا لیتے ہیں جو کہ اکثر اوقات تین صریح طلاقوں کی صورت میں ہی ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نئی الجھن کھڑی ہو جاتی ہے کہ چاروں فقہی مذاہب یعنی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مفتیان کرام کے نزدیک تین طلاقیں ایک مجلس میں یا یکبارگی دینے کی صورت میں وہ عورت پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں رہتی، اور اس کے ساتھ رجوع یا دوسرے نکاح کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ جبکہ اہلِ حدیث مکتبِ فکر کے نزدیک تین طلاقیں اکٹھی دینے کی صورت میں ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے اور رجوع کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ چنانچہ کوئی شخص عرضی نویس یا نوٹری پبلک سے رٹے رٹائے جملوں میں طلاق لکھوانے کے بعد غصہ ٹھنڈا ہونے پر مفتیان کرام سے رجوع کرتا ہے تو وہ حنفی اور اہلِ حدیث مفتیان کرام کے درمیان شٹل بن کر رہ جاتا ہے، اور نئے مخمصے کا شکار ہو جاتا ہے۔

یہ ساری صورتحال اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ نہ تو طلاق دینے والا طلاق کے درجات اور دیگر نزاکتوں سے واقف ہوتا ہے اور نہ ہی طلاق لکھنے والے کو ان کی خبر یا احساس ہوتا ہے۔ اس مخمصے کا اصل حل یہ ہے کہ نوٹری پبلک اور وثیقہ نویس حضرات کو طلاق و نکاح کے معاملات و مسائل کی تربیت دینے کے لیے باقاعدہ کورس کرائے جائیں اور اس کے ساتھ ساتھ تین طلاقیں اکٹھی دینے کی

حوصلہ شکنی کی جائے۔ ویسے بھی مباحات میں طلاق مبغوض ترین شمار ہوتی ہے اور تین طلاقیں ایک بار دینے کو فقہاء کرام نے طلاق بدعت قرار دیا ہے۔ اس لیے اس سے پیدا ہونے والے مفاسد کو روکنے کے لیے یہ تجویز پیش کی گئی کہ اسے تعزیری جرم قرار دے دیا جائے اور خاص طور پر نوٹری پبلک اور وثیقہ نویسوں کو تنبیہ کی جائے تاکہ وہ طلاق لکھوانے کے لیے آنے والے کی صحیح راہنمائی کر کے طلاق سے بچنے یا کم از کم رجعی طلاق تک اسے محدود رکھنے کی کوشش کریں۔

دستورِ پاکستان کی اسلامی بنیادیں

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰ جون ۲۰۱۵ء)

پاکستان میں دستور کی اسلامی بنیادوں کے حوالہ سے جنوری ۱۹۵۱ء کے دوران کراچی میں تمام مکاتبِ فکر کے ۳۱ سرکردہ علماء کرام نے جمع ہو کر "۲۲ متفقہ دستوری نکات" پیش کیے تھے جو کئی بار منظر عام پر آچکے ہیں۔ اور کم و بیش تمام مکاتبِ فکر کی دینی و سیاسی جماعتیں ان کے ساتھ مسلسل اتفاق کا اظہار کرتی آرہی ہیں۔ جبکہ اس کے دو سال بعد جنوری ۱۹۵۳ء میں انہی اکابر علماء کرام کا اجلاس دوبارہ کراچی میں ہوا تھا جو ۱۱ جنوری سے ۱۸ جنوری تک مسلسل جاری رہا اور اس میں تمام مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام نے مجلس دستور ساز کے تجویز کردہ بنیادی اصولوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں متفقہ سفارشات پیش کی تھیں۔ یہ سفارشات شاید دوبارہ منظر عام پر نہیں آسکیں۔ جبکہ اس وقت کراچی کے حافظ مجددی صاحب (مکان ۴ ڈی، بلاک آئی، شمالی ناظم آباد، کراچی) نے یہ پمفلٹ کی شکل میں شائع کی تھیں اور ہمیں اس کی کاپی اسلامی نظریاتی کونسل کے سیکرٹری ڈاکٹر حافظ اکرام الحق صاحب نے فراہم کی ہے۔ یہ دستاویز پاکستان کی دستور سازی کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور ہم اسے ڈاکٹر صاحب موصوف کے شکریہ کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ (راشدی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام اسلامی فرقوں اور گروہوں کے معتمد علیہ علماء کا جو اجتماع دستور اسلامی کے مسائل پر غور کرنے کے لیے کراچی میں منعقد ہوا تھا اس کے مرتب کردہ ۲۲ اصول "اسلامی مملکت کے بنیادی اصول" کے نام سے منظر عام پر آچکے ہیں اور بفضل خدا مسلم پبلک میں قبول عام بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ کسی قریبی وقت میں دوبارہ یہ اجتماع منعقد کر کے ان اصولوں کے

مطابق ایک دستور کا خاکہ بھی مرتب کر دیا جائے۔ لیکن بعد میں یہی مناسب سمجھا گیا کہ مجلس دستور ساز کی مقرر کردہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی جب اپنی رپورٹ پیش کرے، اس وقت ہی یہ اجتماع منعقد کیا جائے اور اس رپورٹ کو مدارِ بحث بنا کر جس قسم کی اصلاحات اس میں ضروری سمجھی جائیں کر دی جائیں۔ چنانچہ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو جب مجلس دستور ساز میں مذکورہ بالا رپورٹ پیش ہوگئی تو اس اجتماع کے دوبارہ منعقد کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا اور اس میں شرکت کے لیے انہی اصحاب کو دعوت دی گئی جو جنوری ۱۹۵۱ء کے اجتماع میں مدعو تھے۔

۱۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں یہ اجتماع منعقد ہوا اور ۱۸ جنوری تک ۹ اجلاس مختلف اوقات میں حسب ذیل اصحاب کے زیر صدارت منعقد ہوئے۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب۔ حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب۔ حضرت مولانا داؤد غزنوی صاحب۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔

ان اجلاسوں میں پوری رپورٹ پر غور کیا گیا۔ اگرچہ مدارِ بحث مذکورہ بالا رپورٹ کا مستند اردو ترجمہ رہا جو حکومت پاکستان کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ لیکن چونکہ ترجمہ میں بکثرت نقائص تھے اس لیے رپورٹ کے مصنفین کا منشا سمجھنے کے لیے اصل انگریزی رپورٹ کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔

اجتماع کی کارروائی میں بڑی سہولت ہو جاتی اگر مجلس دستور ساز کے قائم کیے ہوئے تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی تجاویز بہم پہنچ جاتیں لیکن افسوس ہے کہ مجلس دستور ساز کے صدر نے اس اجتماع کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دینا پسند نہیں کیا۔

الحمدللہ اس اجتماع میں تمام فیصلے بالاتفاق کیے گئے ہیں جنہیں اطلاع عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

دستوری سفارشات پر ہر مکتبۂ خیال کے مشاہیر علماء کا متفقہ تبصرہ اور ترمیمات

حصہ (۱)

باب (۲) مملکت کی پالیسی کے رہنما اصول

پیراگراف (۲) شق (۲) ضمن (الف): رپورٹ میں اس ضمن کی موجودہ عبارت سے یہ گنجائش نکلتی ہے کہ حکومت نظامِ تعلیم کو سابق انگریزی دور کی بنیادوں پر برقرار رکھتے ہوئے صرف اس امر کی

کوشش کرے کہ مسلمانوں کے لیے بس قرآن مجید کی تعلیم لازم کردے، اور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ کس قسم کی زندگی قرآن مجید اور سنت رسول کے مطابق ہوتی ہے دینیات کا ایک کورس مقرر کر دے۔ لیکن یہ انتظام کسی طرح بھی تعلیم اور تربیت کی ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں ہے جو سابق ملحدانہ نظام تعلیم کے بدولت پیدا ہو رہی تھیں۔ لہٰذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس ضمن کے موجودہ الفاظ کو حسب ذیل الفاظ سے بدل دیا جائے۔

> ''مسلمانوں کے لیے قرآن مجید اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے اور ملک کے نظامِ تعلیم میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے مسلمان اپنی زندگی کو قرآن مجید اور سنت رسول کے مطابق ڈھالنے کے قابل ہو سکیں۔''

پیراگراف (۲) شق (۲) ضمن (ب): اس ضمن میں رپورٹ کی موجودہ تجویز اس لحاظ سے ناقص ہے۔ ایک یہ کہ وہ صرف شراب خوری کو ممنوع کرتی ہے نہ کہ شراب فروشی، شراب سازی وغیرہ کو بھی، اور دوسرے مسکرات کے بارے میں خاموش ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ شراب، جوئے، عصمت فروشی کے انسداد کے لیے کسی مدت کا تعین نہیں کرتی جس سے اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت پاکستان میں یہ فواحش غیر معین مدت تک جاری رہیں گے۔ لہٰذا ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس کی موجودہ عبارت کی جگہ یہ عبارت رکھی جائے۔

> ''ہر قسم کی مسکرات، جوئے اور عصمت فروشی کا تاریخ نفاذِ دستور سے زیادہ سے زیادہ تین سال کے اندر قانون سازی کے ذریعہ مکمل انسداد کیا جائے۔''

پیراگراف (۲) شق (۴): اس شق میں رپورٹ کے مصنفین نے موجودہ قوانین ملکی کو کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کرنے کے لیے کسی مدت کا تعین نہیں کیا ہے جس سے یہ اندیشہ لاحق ہوتا ہے کہ نفاذِ دستور سے پہلے کے خلافِ اسلام قوانین غیر معین مدت تک ملک میں نافذ رہیں گے۔ حالانکہ یہ قابلِ برداشت نہیں ہے۔ اس لیے ہم اس شق کو بدل کر حسب ذیل صورت میں رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

> ''شق (۴) ضمن (الف): موجودہ قوانین کو پانچ سال کے اندر کتاب و سنت کے مطابق تبدیل کر دینے کا مناسب انتظام کیا جائے۔

شق (۴) ضمن (ب): قرآن پاک اور سنت کے وہ احکام جو قانونی صورت میں نافذ کیے جا سکتے ہیں

ان کی تدوین و تنفیذ کے لیے مناسب کارروائی کی جائے۔ البتہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے شخصی معاملات سے متعلق ہو، ہر فرقے کے لیے کتاب و سنت کے اس مفہوم کی روشنی میں بنایا جائے گا جو اس کے نزدیک مستند ہو اور کوئی فرقہ دوسرے فرقے کی تعبیر کا پابند نہ ہوگا۔ نہ کوئی قانون ایسا بنایا جائے گا جس سے کسی فرقے کے مراسم وفرائضِ مذہبی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔"

پیراگراف (۲) شق (۶): اس شق کی موجودہ عبارت کی بجائے ہمارے نزدیک یہ عبارت مناسب ہوگی۔

"مملکت کی کوشش ہونی چاہیے کہ بلا امتیاز مذہب و ملت پاکستان کے تمام شہریوں کے لیے کھانے، کپڑے، مکان، تعلیم اور طبی امداد جیسی بنیادی ضروریات زندگی کا نظام کرے۔ خصوصاً ان کے لیے جو بیروزگاری، کمزوری، بیماری یا ایسی ہی کسی دوسری وجہ سے عارضی یا مستقل طور پر اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہوں۔"

پیراگراف (۲) شق (۷): اس شق میں اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ مملکت کی معاشی پالیسی اسلام کے اصولِ عدل پر مبنی ہوگی۔ اس لیے موجودہ عبارت کی جگہ یہ عبارت ہونی چاہیے:

"مملکت کی معاشی پالیسی اسلام کے اصول عدل عمرانی پر مبنی ہونی چاہیے، اور بلا امتیاز مذہب، نسل یا رنگ عوام کی ہر قسم کی بہبودی کا انتظام کیا جائے، اور اس پر اس طرح عمل درآمد ہونا چاہیے کہ"

پیراگراف (۲) شق (۷) ضمن (ج): اس شق میں اگرچہ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا مفہوم بہت وسیع ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ محنت پیشہ اور زراعت پیشہ لوگوں کے معاوضوں کا معاملہ اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کا الگ ذکر کر دینا اور اس امر کی صراحت کرنا ضروری ہے کہ ملک میں اس طبقہ کے معاوضوں کا معیار کم از کم اس حد تک پر رکھا جائے گا کہ ان کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں۔ لہٰذا ہماری رائے میں موجودہ عبارت کی جگہ یہ عبارت ہونی چاہیے۔

"مزدوروں اور کسانوں کے حقوق اور معاوضوں کا ایسا منصفانہ معیار مقرر کیا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہیں اور ان سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جا سکے۔"

پیراگراف (۲) شق (۱۰): اس شق میں رپورٹ کی موجودہ عبارت ناقص ہے اور یہ نقص

خصوصیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ لسانی تعصبات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک اس کو حسب ذیل عبارت سے بدلنا چاہیے۔

> ''مملکت کے لیے لازم ہونا چاہیے کہ وہ پاکستانی مسلمانوں میں سے جغرافیائی، قبائلی، نسلی اور لسانی اور اسی قسم کے دوسرے غیر اسلامی جذبات دور کرنے اور ان میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کرے کہ وہ ملت اسلامیہ کی سالمیت، وحدت، استحکام اور اس طرز فکر کے لوازمات اور اس مقصد کو سب سے مقدم رکھیں جس کی تکمیل کے لیے پاکستان قائم ہوا۔

اضافے:

مذکورہ بالا ترمیمات کے علاوہ ہمارے نزدیک رپورٹ کے رہنما اصولوں پر حسب ذیل امور کا اضافہ بھی ضروری ہے۔

> شق (۲) ضمن (و): ''اسلامی علوم وثقافت کے فروغ کا مؤثر انتظام کیا جائے۔''
>
> شق (۷) ضمن (د): ''حکومت کے ادنیٰ و اعلیٰ ملازمین کے معاوضوں کا تفاوت اعتدال پر لایا جائے۔''

مزید نئی دو شقیں (ا)

> (الف) ''مملکت کے لیے اس امر کا اہتمام لازمی ہو گا کہ مسلم امیدواران ملازمت اور ملازمینِ حکومت کے انتخاب، تقرر اور ترقی کے مواقع پر قابلیت اور کارکردگی اور دیگر متعلقہ عوامل کے ساتھ ساتھ اسلامی کردار اور شعائر اسلام کی پابندی کا مؤثر لحاظ رکھا جائے۔''
>
> (ب) ''تمام سرکاری ملازمتوں کی ٹریننگ میں خواہ وہ فوجی ہوں یا سول، مسلمانوں کے لیے دینی و اخلاقی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا جائے تاکہ ریاستِ پاکستان کے ملازمین کا اخلاقی معیار بھی معیارِ قابلیت کی طرح بلند ہو۔''
>
> (ج) ''مسلمان ملازمینِ حکومت کو فرائض دینی کی پابندی اور شعائر اسلام کے

التزام میں پوری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔"

"دہریت و الحاد کی تبلیغ اور قرآن و سنت کی توہین و استہزا کا بذریعہ قانون سازی انسداد کیا جائے۔"

باب (۳) قرآن پاک اور سنت کے خلاف قانون سازی کا سدباب

پیراگراف (۳): اس پیراگراف میں صرف سلبی حیثیت سے یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ کوئی قانون سازی قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہوگی۔ بلکہ ایجابی طور پر اس اصولی حقیقت کو دستور میں ثبت ہونا چاہیے کہ اس ریاست میں قرآن و سنت کے احکام و ہدایات ہی قانون کا اصل سرچشمہ ہوں گے۔ اس لیے موجودہ پیراگراف کے بعد اس عبارت کا اضافہ ضروری ہے۔

"اور مملکت کے قوانین کے ماخذ اساسی، چیف سورس، قرآن و سنت ہوں گے۔"

پیراگراف (۴، ۵، ۶ اور ۸): حضرت مولانا ابوالحسنات صاحب۔ حضرت مولانا عبد الحامد صاحب بدایونی اور حضرت مفتی صاحبداد صاحب نے اس کی بجائے ایک دوسری تجویز پیش کی جو ضمیمے میں درج ہے۔

ان میں قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی کی روک تھام کے لیے علماء کے ایک بورڈ کے قیام کی جو صورت پیش کی گئی ہے وہ نہ کسی لحاظ سے معقول ہے اور نہ اس طرح کی قانون سازی کو روکنے کے لیے مؤثر ہی ہو سکتی ہے۔ البتہ اس سے بہت سی نئی خرابیوں کے پیدا ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ جس طرح دوسرے قوانین کے معاملے میں حدود دستور سے متجاوز قانون سازی کی روک تھام کے لیے تعبیرِ دستور کے اختیارات سپریم کورٹ کے سپرد کیے گئے ہیں، اسی طرح پیراگراف (۳) کے معاملے کو بھی سپریم کورٹ پر ہی کیوں نہ چھوڑا جائے۔ البتہ یہ امر ضروری ہے کہ جس وقت تک ہمارے ملک میں نئے دستور کے تقاضوں کے مطابق کتاب و سنت میں بصیرت رکھنے والے فاضل جج پیدا نہ ہوں اس وقت تک کے لیے کوئی ایسا عارضی انتظام تجویز کر دیا جائے جس سے سپریم کورٹ میں پیراگراف (۳) کے منشا کے مطابق کتاب و سنت کی صحیح تعبیر کی جا سکے۔ لہٰذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ پیراگراف (۴ تا ۶) کو اور ان سے تعلق رکھنے والے پیراگراف ۸ کو حذف کر دیا جائے اور ان کے بجائے حسب ذیل پیراگراف رکھا جائے۔

(۱) "پیراگراف (۳) کے تحت مجالس قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین کے

خلاف جو دستوری اعتراضات یا تعبیر دستور کے مسائل پیدا ہوں، ان کا فیصلہ کرنے کے لیے سپریم کورٹ میں پانچ علماء مقرر کیے جائیں گے جو سپریم کورٹ کے کسی ایسے جج کے ساتھ جسے امیر مملکت تدین و تقویٰ اور واقفیتِ علوم و قوانینِ اسلامی کے پیش نظر اس مقصد کے لیے نامزد کرے گا، مل کر اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟"

(۲) "ان علماء کا تقرر اسی طریقے سے ہوگا جو سپریم کورٹ کے ججوں کے لیے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات میں تجویز کیا گیا ہے۔"

(۳) "اس منصب کے لیے ایسے ہی علماء ہوں گے جو (الف) کسی دینی ادارے میں کم از کم دس سال تک مفتی کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہوں۔ یا (ب) کسی علاقے میں کم از کم دس سال تک مرجع فتویٰ رہے ہوں۔ یا (ج) کسی باقاعدہ محکمہ قضاء شرع میں کم از کم دس سال تک قاضی کی حیثیت سے کام کر چکے ہوں۔ یا (د) کسی دینی درسگاہ میں کم از کم دس سال تک تفسیر، حدیث یا فقہ کا درس دیتے رہے ہوں۔"

(۴) "یہ انتظام پندرہ سال کے لیے ہوگا اور اگر ضرورت ہو تو رئیس مملکت اس مدت میں توسیع کر سکتا ہے۔"

(۵) "ان عالم دین ججوں کے لیے جملہ ضوابط وہی ہوں گے جو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات میں دوسرے ججوں کے متعلق تجویز کیے گئے ہیں۔"

پیراگراف (۷): رپورٹ میں اس پیراگراف کو دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ جن لوگوں نے پیراگراف (۳) میں اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اس مملکت میں قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بننا چاہیے، ان کے قلم سے یہ بات کیسے نکلی کہ اس مملکت کے مالی معاملات قرآن اور سنت کے احکام کی پابندی سے آزاد رہیں گے۔ اگر یہ ریاست خدا اور رسول کے احکام و فرامین کو بالاتر قانون تسلیم کرتی ہے جیسا کہ پیراگراف (۳) کے الفاظ سے ظاہر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس ریاست کے مالیات خدا اور رسول کے دائرہ اثر (جورسڈکشن) سے باہر ہوں۔ ہمارے نزدیک جس طرح اسلام دنیا کے ہر معاملے میں ہمارا بہترین رہنما ہے، اسی طرح مالی معاملات میں بھی ہے۔ ہم اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ ہمارے دستور کی ایک دفعہ میں مالیات کی حد تک اسلام کی رہنمائی پر صاف صاف

عدم اعتماد کا اعلان کر دیا جائے۔ البتہ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ سر دست کچھ مدت کے لیے ریاست کے مالی معاملات کو اسلام کے مطابق درست کرنے میں عملی مشکلات مانع ہوں گی۔ مگر اس کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ مالی مسودات قانون پر باب سوم کے احکام کا اطلاق ہونے کے لیے پانچ سال کی مدت مقرر کر دی جائے۔ لہٰذا اس باب کا پیراگراف (۷) حذف کر کے اس کی جگہ پر یہ عبارت ہونی چاہیے۔

> "باب ہذا کے احکام کا اطلاق مالی مسودات قانون پر تاریخ نفاذ دستور سے پانچ سال کی مدت کے اختتام پر ہوگا۔"

حصہ (۲)

وفاقیہ اور اس کے علاقہ جات

پیراگراف (۹): اس دفعہ کی شق (ا) میں مملکت کا نام صرف پاکستان تجویز کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کافی نہیں ہے، اس کے بجائے مملکت کا نام "جمہوریہ اسلامیہ پاکستان" ہونا چاہیے۔

اس نام پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں کی موجودگی اسے اسلامی جمہوریہ کہنے میں مانع ہے۔ آخر جب روس میں کثیر التعداد غیر اشتراکیہ کی موجودگی جمہوریہ روس کو اشتراکی جمہوریہ کہنے میں مانع نہیں ہے، تو پاکستان کے لیے غیر مسلموں کی موجودگی اسے اسلامی جمہوریہ کہنے میں مانع کیوں ہے۔ "اسلامی جمہوریہ" کا مفہوم صرف یہ ہے کہ یہ ایک ایسی جمہوریت ہے جو اسلام کے اصولوں پر قائم ہوئی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کا اظہار قرارداد مقاصد میں بھی کیا جا چکا ہے اور اس رپورٹ کا پیراگراف (۳) بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

علاوہ بریں اس میں حسب ذیل اضافے بھی ہونے چاہئیں۔ شق (ا) کے بعد حسب ذیل عبارت۔

> "ملک کے مختلف ولایات و اقطاع مملکتِ واحدہ کے اجزا انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسل، لسانی یا قبائلی وحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی، جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع اختیارات سپرد کیے جائیں گے۔"

شق (۲) کے بعد حسب ذیل عبارت۔

"ولایات مملکت کو مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔"

اس کے بعد موجودہ شق (۲) شق (۴) ہو جائے گی۔

حصہ (۳)

باب (۱) عاملہ

پیراگراف (۲۳) شق (۲): اس میں انتخابی عدالتیں مقرر کرنے کا اختیار اُن امور میں داخل کیا گیا ہے جو صدر ریاست کی صوابدید پر چھوڑے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔ انتخابات میں انصاف قائم کرنا اس ریاست کے وجود کے لیے غایت درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور انصاف کے تمام دوسرے شعبوں کی طرح یہ شعبہ بھی انتظامیہ کی مداخلت سے آزاد اور عدلیہ کے دائرہ عمل میں ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس پیراگراف کی شق (۲) سے "اور انتخابی عدالتوں" کے الفاظ حذف کر دینے چاہئیں۔ اس کی متبادل تجویز ہم حصہ دوازدھم (۱۲) در باب انتخابات میں پیش کریں گے۔

پیراگراف (۲۸) شق (۲و۳): ان دونوں شقوں میں اس امر کا امکان رکھا گیا ہے کہ ایسے اشخاص وزیراعظم اور وزیر بن سکیں جو مجالس قانون میں منتخب ہو کر نہ آئے ہوں یا انتخاب میں ناکام ہوئے ہوں اور پھر اقتدار کی کرسی پر چھ مہینے تک فائز رہنے کے بعد انتخاب جیتنے کی کوشش کریں۔ یہ چیز نہایت قابلِ اعتراض اور نقصان دہ بھی ہے۔ کسی شخص کو وزارت کی کرسی پر بٹھا کر پھر انتخاب جیتنے کا موقع دینا حکومت کی انتظامی مشینری کو اور رائے دہندوں کو سخت اخلاقی انحطاط میں مبتلا کرنے کا موجب ہوگا۔ لہٰذا اس دروازہ کو قطعی بند ہونا چاہیے اور یہ دونوں شقیں حذف کی جانی چاہئیں۔

اس غلطی کا اعادہ پیراگراف (۸۹) شق (۲) میں بھی کیا گیا ہے جہاں ولایات (یونٹس) میں غیر منتخب لوگوں کے وزیراعلیٰ اور وزیر بن جانے اور پھر انتخاب جیتنے کے امکانات رکھے گئے ہیں۔ لہٰذا پیراگراف (۸۹) شق (۲) کو بھی حذف کیا جانا چاہیے۔

باب (۲) وفاقی مقننہ

اس باب میں ایوانِ ولایات (ہاؤس آف یونٹس) اور ایوانِ جمہور (ہاؤس آف دی پیپل) کی ترکیب و تشکیل جس طرح کی گئی ہے اس میں متعدد امور ایسے ہیں جو اس مجلس کے نزدیک سخت قابلِ

اعتراض ہیں اور ان میں بڑی بے اصولی بھی پائی جاتی ہے۔ مگر چونکہ اس وقت مختلف صوبوں کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان ان امور میں گفت وشنید ہو رہی ہے اور ہم اس میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتے اس لیے ان کے بارے میں ہم سرِدست اپنی رائے محفوظ رکھتے ہیں۔

پیراگراف (۴۰) شق (ا): اس میں ایوانِ ولایت کی نشست پر کرنے کے لیے کسی شخص کے نااہل ہونے کے جو چار وجوہ بیان کیے گئے ہیں ان میں مسلم ارکان کے لیے پانچویں وجہ کا بھی اضافہ ہونا چاہیے جس کے الفاظ یہ ہوں:

"فرائضِ اسلام کا پابند اور فواحش سے مجتنب نہ ہو۔"

اس وجہ کا اضافہ پیراگراف (۴۷) در باب ایوانِ جمہور اور پیراگراف (۱۰۱) در باب مجالسِ مقننۂ ولایات میں بھی ہونا چاہیے۔

پیراگراف (۴۰) شق (ا) ضمن (۴): اس ضمن کی موجودہ عبارت قابلِ اعتراض ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایوانِ ولایات کا ہر رکن لازماً اس ولایت کا باشندہ ہونا چاہیے کہ جس سے وہ منتخب ہو کر آئے۔ یہ پاکستانیوں کے درمیان صوبائی تعصبات کو مستقل طور پر قائم رکھنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہوگا۔ لہٰذا ہم تجویز کرتے ہیں کہ اس عبارت کو بدل کر یوں کر دیا جائے۔

"مملکت کے کسی حصہ کی فہرست رائے دہندگان میں اس کا نام درج ہو۔"

اس غلطی کا اعادہ پیراگراف (۴۷) شق (۴) میں بھی کیا گیا ہے اور اس کی بھی مذکورہ بالا طریقے پر اصلاح ہونی چاہیے۔

پیراگراف (۴۲) ضمن (۵): اس میں ہر اس شخص کو ایوانِ ولایات کی رکنیت کے لیے نااہل قرار دیا گیا ہے جسے کسی عدالت مجاز نے کسی جرم کے ارتکاب پر دو سال یا اس سے زیادہ کی سزا دی ہو۔ یہ "کسی جرم" کا لفظ بہت وسیع ہے، اس کی زد میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جنہیں سیاسی اسباب کی بنا پر سزا دی گئی ہو۔ اس کی بجائے، ہم تجویز کرتے ہیں کہ اس شق میں کسی دوسرے جرم کے الفاظ حذف کر کے "کسی اخلاقی جرم" کے الفاظ رکھے جائیں۔

یہی اصلاح پیراگراف (۴۸) شق (۵) اور پیراگراف (۱۰۲) شق (۵) میں بھی ہونی چاہیے۔

پیراگراف (۴۲) شق (ز): اس شق میں ایوانِ ولایات کی رکنیت کے لیے ہر اس شخص کو نااہل قرار دیا گیا ہے جو سرکاری ملازمت سے "بداطواری" کی بنا پر برخاست کیا گیا ہو۔ یہ بداطواری بھی بہت

وسیع مفہوم رکھتی ہے اور اس کی زد میں ایسے لوگ بھی آجاتے ہیں جن کو کسی وقت کسی پارٹی کی حکومت سیاسی اسباب سے برخاست کر دے۔ درآں حالیکہ وہ کسی اخلاقی خرابی میں مبتلا نہ پائے گئے ہوں۔ لہٰذا اس شق میں "بداطواری" کے بعد "جو اخلاقی جرم کی نوعیت کی ہو" کا اضافہ ہونا چاہیے۔

یہی اصلاح پیراگراف (۴۸) شق (ز) اور پیراگراف (۱۰۲) شق (ز) میں بھی ہونی چاہیے۔

پیراگراف (۵۰) شق (د): اس میں ہر اس شخص کو رائے دہندگی کے حق سے محروم کیا گیا ہے جس نے کسی عدالت مجاز سے "کسی جرم" کے ارتکاب پر دو سال یا اس سے زیادہ کی سزا پائی ہو۔ اس پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے جو پیراگراف (۴۲) شق (۵) کے سلسلہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا "کسی جرم" کے بعد "جو اخلاقی نوعیت کا ہو" کے الفاظ کا اضافہ ہونا چاہیے۔ یہی اصلاح پیراگراف (۱۰۶) شق (د) میں بھی ہونی چاہیے۔

پیراگراف (٦٦) شق (ا): اس میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مقننہ کے ہر رکن کے لیے پاکستان کی وفاداری کا حلف اٹھانا لازم ہوگا۔ یہ بالکل مناسب ہے لیکن اس کے ساتھ ہر رکن مقننہ کو یہ حلف بھی اٹھانا چاہیے کہ وہ مقننہ کی کارروائیوں میں اپنا ووٹ دیانتداری کے ساتھ دے گا۔ لہٰذا اس شق میں "وہ پاکستان کی وفاداری کا حلف اٹھائے" کے بعد ان الفاظ کا اضافہ ہونا چاہیے۔

"نیز اس امر کا حلف اٹھائے کہ وہ اپنا ووٹ دیانتداری کے ساتھ استعمال کرے گا۔ اس فقرے کا اضافہ پیراگراف (۱۱۸) شق (ا) میں بھی ہونا چاہیے۔

حصہ (۱۰)

درباب عدلیہ

عدلیہ کے باب میں کسی مقام پر حسب ذیل دو دفعات کا اضافہ ضروری ہے۔

(ا) "عدلیہ کے ہر اہل منصب کے تقرر و ترقی میں تقرر کرنے والے کے پیش نظر من جملہ دیگر عوامل، متعلقہ کے تقویٰ و تدین اور اصلی ماخذ کے ذریعہ علوم و قوانین اسلامی سے واقفیت بھی مؤثر عوامل اور وجہ ترجیح کی حیثیت رکھیں گے۔"

یہ اس لیے ضروری ہے کہ اسلام انتظامیہ اور مقننہ کے ارکان سے بھی بڑھ کر عدالت ہائے انصاف کے احکام کے تدین و تقویٰ کو اہمیت دیتا ہے۔ اور جبکہ اس مملکت میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا

ہے کہ یہاں کے قوانین اسلام کے اصول واحکام پر مبنی ہوں گے۔ تو یہ نہایت ضروری ہے کہ اس کے حکامِ عدالت قوانینِ اسلامی سے واقف ہوں۔

(۲) "مقننہ یا انتظامیہ کو ٹربیونلز (خاص عدالتیں) مقرر کرنے کے اختیارات نہ ہوں گے۔"

یہ اس لیے ضروری ہے کہ کسی خاص مقدمہ کے لیے یا خاص نوعیت کے مقدمات کے لیے انتظامیہ کا اپنی اغراض اور مصلحتوں کی بنا پر خود یا مقننہ کے ذریعہ سے خاص عدالتیں قائم کرنا اور ان کے اختیارات دادرسی پر من مانی حدود وقیود عائد کرنا قطعاً خلاف انصاف ہے۔ اور اس اختیار کو جس بے جا طریقے سے استعمال کیا جاتا رہا ہے اس کی نہایت بری مثالیں دیکھی جاچکی ہیں۔ اس لیے خاص عدالتیں مقرر کرنے کے طریقے کو از روئے دستور بند ہونا چاہیے اور ہر قسم کے مقدمات ملک کی عام عدالتوں ہی کی طرف رجوع کیے جانے چاہئیں۔

باب (۱) عدالت عظمیٰ

پیراگراف (۱۸۲): اس میں سپریم کورٹ کو اس اختیار سے محروم کیا گیا ہے کہ وہ مسلح افواج سے متعلق کسی عدالت یا ٹربیونل کے صادر کیے ہوئے کسی حکم کے خلاف اپیل کرنے کی اجازت دے۔ ہمارے نزدیک یہ قید غیر منصفانہ ہے جبکہ ہمارے دستور میں سپریم کورٹ کو آخری عدالت انصاف قرار دیا جائے گا تو کوئی وجہ نہیں کہ ملک کے کسی شخص کو خواہ وہ فوجی ہو، سولین یا عام شہری، انصاف حاصل کرنے کے لیے اس کا دروازہ کھٹکھٹانے کا موقع نہ دیا جائے۔ اگر فوجی عدالتوں میں کسی شخص کو بے انصافی کی شکایت ہو تو آخر کیوں وہ ملک کی آخری عدالت انصاف سے اپیل نہ کر سکے۔ لہٰذا پیراگراف (۱۸۲) کی حسب ذیل عبارت حذف کی جانی چاہیے۔

پیراگراف (۱۸۷): اس پیراگراف میں سپریم کورٹ کے اس اختیار کو کہ وہ انصاف کی غرض کے لیے کوئی شہادت یا دستاویز طلب کر سکے، وفاقی مقننہ کے بنائے ہوئے قوانین سے محدود کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر مقننہ کوئی ایسا قانون بنادے جس میں کسی خاص قسم کی شہادتیں یا دستاویزیں طلب کرنا ممنوع ہو تو سپریم کورٹ انہیں طلب نہ کر سکے گا۔ خواہ انصاف کے لیے اس کا طلب کرنا کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ بات اسلامی اصول عدل کے قطعاً خلاف ہے۔ اسلام کی رو سے جس شہادت کے بغیر انصاف نہ کیا جا سکتا ہو وہ جس کے پاس بھی ہو عدالت اس کو طلب

کرنے کا حق رکھتی ہے، اور اس شخص کے لیے کتمان حق جائز نہیں۔ لہٰذا اس پیراگراف سے یہ الفاظ حذف کر دیے جائیں۔

"بحفظ احکام موضوعہ مقننہ وفاقی"

نیز پیراگراف کے اختتام پر حسب ذیل عبارت کا اضافہ کیا جائے۔

"البتہ عاملہ کو حق ہونا چاہیے کہ اگر اس کے نزدیک کسی شہادت یا دستاویز کا افشا مملکت کے تحفظ و استحکام کے منافی ہو تو وہ عدالت سے استدعا کر سکتی ہے کہ اس کے اخفا کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔"

باب (۲) عدالت ہائے عالیہ

پیراگراف (۲۰۵) شق (۲): اس پیراگراف میں ہائی کورٹ کے اختیارات پر یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اپنے ماتحت کسی عدالت کے ایسے فیصلوں پر اعتراض کر سکے جن کی اپیل یا نگرانی کسی اور طریقہ سے ہائی کورٹ میں نہ ہو سکتی ہو۔ ہمارے نزدیک یہ پابندی ولایات کی بلند ترین عدالت کو انصاف کے تقاضے پورے کرنے سے روکتی ہے۔ ہائی کورٹ کو تو اس امر کے پورے اختیارات حاصل ہونے چاہئیں کہ جب کبھی اس کے علم میں کوئی ایسا معاملہ آئے جس میں اس کی ماتحت عدالتیں انصاف کرنے سے قاصر رہی ہوں، وہ اس کا نوٹس لے اور انصاف بہم پہنچانے کی کوشش کرے۔ لہٰذا اس پیراگراف کی یہ شق پوری کی پوری حذف کی جانی چاہیے۔

حصہ (۱۱)

باب ملازمین و ماموریۂ ملازمت سرکاری

پیراگراف (۲۲۲) شق (۱): اس شق میں یہ کہا گیا ہے کہ وفاقی مقننہ میں امیر مملکت کی اجازت کے بغیر اور ولایت (یونٹس) کی مجالس مقننہ میں حاکمان ولایات کی اجازت کے بغیر کوئی ایسا مسودہ قانون نہیں پیش کیا جا سکتا جو اُن تحفظات کو منسوخ یا محدود کرتا ہو جو دفعہ ۱۹۷ ضابطۂ فوجداری اور دفعات ۸۰ تا ۸۲ ضابطہ دیوانی میں سرکاری ملازمین کو دیے گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ شق سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اگر ریاست پاکستان کے ملازمین، امیر مملکت اور حاکمان ولایت کے ملازم نہیں بلکہ پاکستان کی پبلک کے ملازم ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پبلک کے نمائندے اس کے ملازموں کے حقوق و اختیارات اور امتیازات میں تغیر و تبدل کرنے کے لیے کوئی مسودہ قانون پیش کرنے میں امیر مملکت

اور حاکمان ولایات کی اجازت کے محتاج ہوں۔ آزاد پاکستان میں تو دفعہ ۱۹۷ فوجداری اور دفعات ۸۰ تا ۸۲ ضابطہ دیوانی جیسی صریح غیر منصفانہ دفعات کا کتاب آئین پر موجود رہنا ہی شرمناک ہے۔ کجا کہ دستور میں ان دفعات کو بچانے کے لیے یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ ان میں ترمیم اور تنسیخ کرنے کے لیے کوئی مسودۂ قانون نہ پیش کیا جا سکے جب تک کہ امیر مملکت اور حاکمان ولایات اس کی اجازت نہ دیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس پیراگراف کی یہ شق حذف کی جائے۔

حصہ (۱۲)

درباب انتخابات

اس باب میں کسی مقام پر حسب ذیل عبارات کا بصورت پیراگراف اضافہ ہونا ضروری ہے۔

(الف) ”امیرِ مملکت، حاکمانِ ولایات اور عمالِ حکومت کے لیے یہ ممنوع ہونا چاہیے کہ وہ انتخابات میں کسی شخص یا پارٹی کے خلاف یا موافق رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کرے۔“

(ب) ”مرکزی اور صوبائی وزیر اعظم، وزراء مملکتی، وزراء اور نائب وزراء، اور پارلیمنٹری سیکرٹری کے لیے ممنوع ہونا چاہیے کہ وہ کسی شخص یا پارٹی کے موافق یا خلاف سرکاری اثرات اور وسائل کے ذریعے رائے عامہ کو متاثر کرنے کی کوشش کریں۔“

(ج) ”مرکزی مقننہ اور ولایات کی مجالسِ مقننہ میں ہر نشست جو خالی ہوگئی ہو، زیادہ سے زیادہ چار ماہ کے اندر اندر بذریعہ ضمنی انتخاب پر کرنی ضروری ہوگی۔“

پیراگراف (۲۳۴) شق (۲): اس میں انتخابی کمیشن کے ”ارکان کا تقرر بھی چیف کمشنر کے تقرر کی طرح محض امیر مملکت کی صوابدید پر موقوف کر دیا گیا ہے۔“

جہاں تک چیف کمشنر کا تعلق ہے اس کے تقرر کے معاملے میں تو اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ وہ امیر مملکت ہی کی صوابدید پر ہو۔ لیکن انتخابات کی آزادی کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پورا الیکشن کمیشن محض امیر مملکت ہی کا ساختہ پرداختہ نہ ہو۔ لہٰذا ہم تجویز کرتے ہیں کہ اس شق کے الفاظ ”اور چیف کمشنر انتخابات سے“ لے کر ”اپنی صوابدید پر مقرر کرے گا“ تک حذف کر دیے جائیں اور

ان کی جگہ یہ عبارت رکھی جائے۔

"اور امیر مملکت چیف کمشنر انتخابات کو اپنی صوابدید پر اور دوسرے انتخابی کمشنروں کو چیف کمشنر انتخابات کی سفارش پر ایسے قانون کے (دو تین الفاظ مٹے ہوئے ہیں) کرے گا جو وفاقی مقننہ اس بارے میں وضع کرے۔"

نیز (دو تین الفاظ مٹے ہوئے ہیں) اداروں کو محفوظ کرنے کے لیے پیراگراف (۲۳۴) شق (۲) میں یہ اضافہ ہونا چاہیے۔

"چیف الیکشن کمشنر کا تقرر مستقل ہونا چاہیے، اس کے سپرد مرکز اور ولایات میں نہ صرف عام انتخابات کا انتظام ہوگا بلکہ وقتاً فوقتاً خالی ہونے والی نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات کا انتظام بھی ہوگا۔ نیز انتخابات کے لیے رائے دہندگان کی فہرستوں کو ہر وقت تیار رکھنا بھی اس کا فرض ہوگا۔ چیف الیکشن کمشنر کا مرتبہ سپریم کورٹ کے ججوں کے مماثل ہوگا اور اس پر بھی وہ پابندیاں عائد کی جائیں جو پیراگراف (۲۲۷) شق (۲) و (۳) میں پبلک سروس کمیشن کے صدر پر عائد ہوتی ہیں۔

"چیف الیکشن کمشنر وہی شخص مقرر کیا جائے گا جو کم از کم تین سال کسی ہائی کورٹ میں جج رہ چکا ہو۔"

پیراگراف (۲۳۹) شق (۲): اس شق میں انتخابی عدالتیں مقرر کرنے کا اختیار مرکز میں امیر مملکت اور ولایات میں حاکمان ولایات کو دیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ حصہ (۳) کے پیراگراف (۲۳) میں ہم کہہ چکے ہیں، یہ چیز انتخابات کی آزادی کے لیے مضر ہے۔ لہٰذا اس شق کی موجودہ عبارت کی بجائے یہ عبارت ہونی چاہیے۔

"انتخابی عدالتیں مقرر کرنے کا اختیار مرکز میں سپریم کورٹ اور ولایات میں ہائی کورٹ کو ہونا چاہیے۔"

ضمیمہ اول

فہرست اول: اس فہرست میں حسب ذیل مضامین کا اضافہ کیا جائے۔

(۱) "مملکت کے رہنما اصول کے مطابق تعلیمی پالیسی کا تعین، توافق اور رہنمائی

اور علمی و تعلیمی اداروں کا قیام۔"

(۲) "رہنما اصول کے مطابق مملکت کی بنیادی آئیڈیالوجی اور نصب العین کا تحفظ۔"

فہرست اول و سوم: ان دونوں فہرستوں میں نمبر (۳) اپنی موجودہ صورت میں سخت قابلِ اعتراض ہے۔ احتیاطی نظر بندی کے اختیارات اب تک جس طریقے سے استعمال کیے جاتے رہے ہیں وہ سیفٹی ایکٹ اور اس قسم کے دوسرے قوانین کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اور یہ قوانین نہ صرف شریعت کے خلاف ہیں بلکہ عقلِ عام اور انصاف کے عالمگیر تصورات کے بھی خلاف ہیں۔ حتیٰ کہ خود وہ لوگ جنہیں آج ان اختیارات پر اصرار ہے اپنی بے اختیاری کے زمانے میں دوسروں پر شدت کے ساتھ یہ اعتراض کرتے تھے کہ وہ ان کے خلاف سیفٹی ایکٹ ایک جیسے قوانین استعمال کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمارے نزدیک یہ ضروری ہے کہ ان دونوں فہرستوں کے نمبر (۳) میں "احتیاطی نظر بندی" کے بعد حسب ذیل عبارت کا اضافہ کیا جائے۔

"بشرطیکہ جس شخص کو اس غرض کے لیے بند کیا جائے اسے پندرہ دن کے اندر اندر عدالت کے سامنے پیش کیا جا سکے اور اس کو صفائی کا پورا موقعہ دیا جائے، اور مدت نظر بندی کی تعین کا اختیار عدالت کو حاصل ہو گا۔"

ضمیمہ دوم

اس ضمیمہ میں مسلم نشستوں کے عنوان کے کالم میں پنجاب کے بالمقابل ۸۸ کی جگہ ۸۷ کا عدد درج کیا جائے۔ اور ایک نئے کالم کا اضافہ کیا جائے جس کا عنوان "قادیانیوں کے لیے مخصوص نشستیں" ہو۔ اس کالم میں پنجاب کے بالمقابل ایک کا عدد درج کیا جائے۔ نیز ضمیمہ دوم کی تشریحات میں حسب ذیل پانچویں دفعہ کا اضافہ کیا جائے۔

"پنجاب میں قادیانیوں کی ایک نشست پر کرنے کے لیے پاکستان کے دیگر علاقوں کے قادیانی بھی ووٹ دینے اور مذکورہ نشست پر رکن منتخب ہو سکنے کے مستحق ہوں گے۔"

قادیانی کی تشریح یوں کی جائے۔

"قادیانی سے مراد وہ شخص ہوگا جو مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا ہو۔"

یہ ایک نہایت ضروری ترمیم ہے جسے ہم پورے اصرار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ملک کے دستور سازوں کے لیے یہ بات کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کے حالات اور مخصوص اجتماعی مسائل سے بے پرواہ ہوکر محض اپنے ذاتی نظریات کی بنا پر دستور بنائیں۔ لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ملک کے جن علاقوں میں قادیانیوں کی بڑی تعداد مسلمانوں کے ساتھ ملی جلی آباد ہے وہاں اس قادیانی مسئلہ نے کس قدر نازک صورتحال پیدا کردی ہے۔ ان کو پچھلے دور کے بیرونی حکمرانوں کی طرح نہ ہونا چاہیے جنہوں نے ہندو مسلم مسئلہ کی نزاکت کو اس وقت تک محسوس کرکے ہی نہ دیا جب تک متحدہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ دونوں قوموں کے فسادات سے خون آلود نہ ہوگیا۔ جو دستور ساز حضرات خود اس ملک کے رہنے والے ہیں ان کی یہ غلطی بڑی افسوس ناک ہوگی کہ وہ جب پاکستان میں قادیانی مسلم تصادم کو آگ کی طرح بھڑکتے ہوئے نہ دیکھ لیں اس وقت تک انہیں اس بات کا یقین نہ آئے کہ یہاں ایک قادیانی مسلم مسئلہ بھی موجود ہے جسے حل کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اس مسئلہ کو جس چیز نے نزاکت کی آخری حد تک پہنچا دیا ہے وہ یہ ہے کہ قادیانی ایک طرف مسلمان بن کر مسلمانوں میں گھستے بھی ہیں اور دوسری طرف عقائد عبادات اور اجتماعی شیرازہ بندی میں مسلمانوں سے نہ صرف الگ بلکہ ان کے خلاف صف آرا بھی ہیں، اور مذہبی طور پر تمام مسلمانوں کو علانیہ کافر قرار دیتے ہیں۔ اس خرابی کا علاج آج بھی یہی ہے اور پہلے بھی یہی تھا (جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے اب سے بیس برس پہلے فرمایا تھا) کہ قادیانیوں کو (تین چار الفاظ مٹے ہوئے ہیں) الگ ایک اقلیت قرار دے دیا جائے۔

علاوہ بریں بنیادی حقوق کی جو رپورٹ ۱۹۵۰ء میں پیش کی گئی تھی اور بسرعت منظور بھی کرلی گئی تھی اس کے پیراگراف (۳) کا یہ حصہ بھی حذف ہونا چاہیے۔

"ماسوا اس صورت کے جب کہ ریاست کی سلامتی کو کوئی بیرونی یا اندرونی خطرہ لاحق ہو یا کوئی نازک ہنگامی حالت رونما ہوجائے۔"

مذکورہ بالا رپورٹ میں یہ استثنائی فقرہ، ہیبس کارپس کے حق کو بعض سورتوں میں معطل کردیتا ہے در آں حالیکہ اسلامی شریعت کسی حالت میں بھی اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ کسی مسلم یا ذمی شہری کو ملک کی سب سے اونچی عدالت انصاف کے پاس حبسِ -- کے خلاف دادرسی کے لیے جانے کے حق

سے محروم کردیا جائے۔

اسمائے گرامی حضرات شرکائے مجلس

(۱) حضرت العلامہ مولانا سید سلیمان ندوی۔ صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام و صدر تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان۔

(۲) حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب۔ نائب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام و مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور۔

(۳) حضرت مولانا سید ابوالحسنات محمد احمد صاحب۔ صدر مرکزی جمعیۃ علماء پاکستان۔

(۴) حضرت مولانا داؤد غزنوی۔ صدر جمعیۃ اہلِ حدیث مغربی پاکستان۔

(۵) حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب۔ نائب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام۔

(۶) حضرت مولانا احمد علی صاحب۔ امیر انجمن خدام الدین لاہور۔

(۷) حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ امیر جماعتِ اسلامی پاکستان۔

(۸) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ نائب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام و رکن تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان، وسرپرست دار العلوم کراچی۔

(۹) حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی۔ وزیر معارف ریاست قلات۔

(۱۰) حضرت مولانا عبدالحامد صاحب بدایونی۔ صدر جمعیۃ علماء پاکستان سندھ۔

(۱۱) حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور۔

(۱۲) حضرت مولانا خیر محمد صاحب۔ مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان۔

(۱۳) حضرت مولانا حاجی محمد امین صاحب۔ خلیفہ حاجی ترنگ زئی پشاور (سرحد)

(۱۴) حضرت مولانا اطہر علی صاحب۔ صدر جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان۔

(۱۵) حضرت مولانا ابو جعفر محمد صالح صاحب۔ (پیر سرسینہ شریف) نائب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام و امیر جمعیۃ حزب اللہ مشرقی پاکستان۔

(۱۶) حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب۔ ناظم جمعیۃ اہلِ حدیث پاکستان۔

(۱۷) حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب۔ جامعہ دینیہ دار الہدیٰ ٹھیڑی، خیر پور میرس سندھ۔

(۱۸) حضرت مولانا محمد صادق صاحب۔ مہتمم مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی۔

(۱۹) حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوری۔ پرنسپل جامعہ قرآنیہ ڈھاکہ۔
(۲۰) حضرت مولانا مفتی محمد صاحبداد صاحب۔ کراچی
(۲۱) حضرت مولانا پیر محمد ہاشم جان صاحب مجددی سرہندی۔ ٹنڈوسائن داد حیدر آباد۔
(۲۲) حضرت مولانا راغب احسن صاحب ایم اے۔ نائب صدر جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان۔
(۲۳) حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ نائب صدر جمعیۃ المدرسین سرسینہ شریف مشرقی پاکستان۔
(۲۴) حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی۔ نائب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام و صدر جمعیۃ اہلِ حدیث پاکستان۔
(۲۵) حضرت مولانا حافظ کفایت حسین صاحب۔ مجتہد ادارہ عالیہ تحفظ حقوق شیعہ پاکستان۔
(۲۶) حضرت مولانا مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد رکن تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان۔
(۲۷) حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری۔ شیخ التفسیر دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار سندھ۔
(۲۸) حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری۔ صدر مجلس احرار اسلام پاکستان۔
(۲۹) حضرت مولانا امین الحسنات صاحب پیر مانکی شریف۔ نائب صدر مرکزی جمعیۃ علماء اسلام۔
(۳۰) جناب قاضی عبدالصمد صاحب سربازی۔ قاضی قلات بلوچستان۔
(۳۱) جناب مولانا احتشام الحق صاحب۔ مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ۔ خطیب جامعہ مسجد جیکب لائن کراچی۔
(۳۲) جناب مولانا ظفر احمد صاحب انصاری۔ سیکرٹری تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان۔
(۳۳) جناب مولانا دین محمد صاحب۔ نائب صدر جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان۔

نوٹ: اس اجتماع میں حضرت مولانا حماد اللہ صاحب بوجہ علالت، حضرت مولانا بدر عالم صاحب بوجہ ہجرت مدینہ منورہ، اور پروفیسر مولانا عبد الخالق صاحب رکن تعلیمات اسلامی بورڈ دستور ساز اسمبلی پاکستان بعض نجی مصروفیات کے باعث شرکت نہ فرما سکے۔

ضمیمہ

ہمارے نزدیک دفعہ نمبر (۴) کے الفاظ حسب ذیل ہوں۔

"ایسی صورت میں جب کہ مجلس مقننہ میں کتاب و سنت کی تعبیر و تعریف پر اعتراض ہو تو ضروری ہوگا کہ یہ سوال ماہرین قوانین اسلامی (علماء پاکستان) کے بورڈ کے پاس بھیجا جائے۔ یہ بورڈ اپنا جو فیصلہ صادر کرے مجلس مقننہ اس کی پابند ہوگی۔"

اسی طرح دفعہ نمبر (۵) کی شق نمبر (ا) میں تشکیل بورڈ کے متعلق ہماری ترمیم یہ ہے کہ

"حکومت پاکستان علماء کی ان مذہبی جماعتوں سے جو مرکزی اور صوبہ جاتی حیثیت سے قیامِ پاکستان کے بعد سے کام کر رہی ہیں، اور جن کا نظام اس وقت تک باقاعدہ قائم ہے، ان سے علماء پاکستان کے نام طلب کرے اور امیر مملکت ان کا اعلان کر دے۔

ماہرین قوانین اسلامی سے مراد علماء دین ہی ہوں تو انہیں ایسا باوقار و بااختیار ہونا چاہیے کہ ان کا فیصلہ ناطق ہو۔ ہمیں علماء کے اجتماع کی اس تجویز سے کہ کتاب و سنت کی تعبیر کا فیصلہ کرنے کے لیے "سپریم کورٹ" کے ساتھ علماء منسلک ہوں، بحالت موجودہ اختلاف ہے۔ اس لیے علماء کا محض کتاب و سنت کی تعبیر و معانی بتانے کے لیے "سپریم کورٹ" کے ججوں کے ساتھ منسلک ہونا بے کار و بے معنی ہے۔ البتہ مسلمانوں کے اہم مسائل دینی کے تصفیہ کے لیے اگر علماء بحیثیت جج یعنی "قاضی" مقرر کیے جائیں (جن کی ضرورت نزاکت حالات کے باعث لازمی ہے) تو موزوں ہو سکتا ہے۔"

مولانا ابوالحسنات قادری۔ مولانا محمد عبدالحامد القادری البدایونی۔ مفتی محمد صاحب داد۔

ناموسِ رسالتؐ کے قانون پر نظر ثانی؟

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۳۱ جنوری ۲۰۱۶)

مرکزی جمعیۃ اہلِ حدیث پاکستان کے امیر محترم سینیٹر پروفیسر ساجد میر نے ایک اخباری بیان میں کہا ہے کہ توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون کی تبدیلی برداشت نہیں کی جائے گی، البتہ اس کے غلط استعمال کی روک تھام ضروری ہے اور اس پر ہمیں غور کرنا چاہیے۔ انہوں نے یہ بات اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل توہین رسالتؐ کے قانون پر نظر ثانی کے لیے تیار ہے مگر اس کے لیے حکومت یہ مسئلہ باقاعدہ طور پر اسلامی نظریاتی کونسل کو بھجوائے۔ پروفیسر ساجد میر صاحب نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ مولانا محمد خان شیرانی کو نظر ثانی کی بات کرتے ہوئے یہ وضاحت کرنی چاہیے تھی۔

جہاں تک توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کا قانون ہے، یہ مسلمانوں کے دین و ایمان کا مسئلہ ہے اور اس پر امتِ مسلمہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں متفق ہے کہ توہین رسالتؐ کے سنگین جرم کی سزا موت ہے۔ اسی اجماعی عقیدہ کی بنیاد پر پاکستان میں توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کا قانون نافذ ہے جو دنیا بھر کے سیکولر حلقوں بالخصوص اقوام متحدہ، یورپی یونین اور مغربی ممالک و اداروں کی طرف سے مسلسل ہدف تنقید بنا ہوا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی سیکولر لابیوں کا کہنا ہے کہ یہ قانون آزادیٔ رائے کے انسانی حق کے منافی ہے جس کی اقوام متحدہ کے حقوق کے چارٹر میں ضمانت دی گئی ہے اور اس چارٹر پر پاکستان سمیت کم و بیش تمام مسلم حکومتوں کی طرف سے بارہا اتفاق کا اظہار کیا جا چکا ہے۔

مغربی حکومتیں اور ادارے اس قانون کو صرف تنقید کا نشانہ نہیں بنا رہے بلکہ اسے منسوخ کرانے کے لیے ایک عرصہ سے سرگرمِ عمل ہیں۔ اور پاکستان پر یہ دباؤ مسلسل بڑھایا جا رہا ہے کہ وہ اس قانون کو ختم کر دے یا ترامیم کے ذریعہ غیر مؤثر بنا دے۔ ملک کے اندر بعض سیکولر حلقوں اور دانشوروں کا موقف بھی یہی ہے اور وہ اسے ختم کرانے کی مہم میں بین الاقوامی سیکولر حلقوں کے ساتھ شریک و معاون ہیں۔

ملک کے دینی حلقوں اور عوام کی طرف سے اس موقف اور دباؤ کو بارہا مسترد کیا جا چکا ہے۔ حتیٰ کہ

ایک موقع پر ملی یکجہتی کونسل کی تحریک پر جب اس کی قیادت مولانا شاہ احمد نورانیؒ، قاضی حسین احمدؒ، مولانا سمیع الحق اور مولانا معین الدین لکھویؒ جیسے سرکردہ علماء کرام کے ہاتھ میں تھی، پاکستان کے عوام نے ملک گیر پہیہ جام ہڑتال کر کے اس حوالہ سے اپنے جذبات کا بھرپور اظہار کیا تھا۔ ایک سے زائد بار ایسا ہو چکا ہے کہ توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون کو تبدیل کرنے کی بات کسی بھی طرف سے سامنے آئی تو تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور جماعتوں نے متحد ہو کر اس کا متفقہ جواب دیا۔ چنانچہ اب تک ایسی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی اور آئندہ بھی پاکستانی عوام کی دینی حمیت اور غیرت کے سامنے ایسی کسی کوشش کا کامیاب ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کو ختم کر دیا جائے تو یہ ممکن ہی نہیں ہے اور پاکستان کے عوام خواہ وہ کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں اسے قبول نہیں کریں گے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ مولانا محمد خان شیرانی بھی نظر ثانی کی بات اس حوالہ سے نہیں کر رہے، اس لیے پروفیسر ساجد میر کی طرح ہمارا بھی ان سے تقاضہ یہی ہے کہ وہ اس کی وضاحت کریں اور دوٹوک یہ اعلان کریں کہ نظر ثانی موت کی سزا پر نہیں بلکہ قانون کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے کی جا سکتی ہے۔

جس طرح یہ بات قطعی طور پر غیر متنازعہ ہے کہ توہین رسالتؐ کی سزا بہرحال موت ہے جسے کسی صورت میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح یہ بات بھی اب متنازعہ نہیں رہی کہ ہمارے ہاں اس قانون کا استعمال بہت سے مواقع پر ناجائز ہوتا ہے۔ متعدّد شواہد ایسے موجود ہیں کہ اپنے مخالفین کو خواہ مخواہ پھنسانے کے لیے اس قانون کا ناجائز استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ بیسیوں مقدمات ایسے ریکارڈ پر ہیں جو خود مسلمانوں کے باہمی مسلکی مشاجرات و تنازعات کے پس منظر میں ایک دوسرے کے خلاف درج کرائے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ صورتحال صرف توہین رسالتؐ کے قوانین کے بارے میں نہیں بلکہ دفعہ ۳۰۲ اور دیگر سنگین سزاؤں کے قوانین کے حوالہ سے بھی موجود ہے لیکن توہین رسالتؐ کے الزام کے ساتھ مذہبی عقیدت اور نفرت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کی سنگینی دوسرے قوانین کے غلط استعمال سے بڑھ جاتی ہے اور بعض اوقات امن عامہ بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

چنانچہ قانون کے غلط استعمال کی روک تھام کے لیے یہ مسئلہ اسلامی نظریاتی کونسل میں زیر بحث آتا ہے تو اسے ہدف تنقید بنانے کی بجائے اس کی حمایت کرنی چاہیے اور مل جل کر اس کا رخ صحیح رکھنے

کی کوشش کرنی چاہیے۔ بلکہ ہمیں ہر کام کے لیے ریاستی اور دستوری اداروں کی طرف رجوع کرنے اور سارے معاملات انہی کے حوالے کر دینے کی روش کا از سرِ نو جائزہ لینا چاہیے۔ اور دینی جماعتوں کو اپنے طور پر بھی اس الجھن کا حل نکالنے کی کوئی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ یہ امر واقعہ ہے کہ توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے قانون کا بہت سے مواقع پر غلط استعمال ہوتا ہے جس سے خود قانون کی افادیت طنز و تشنیع کا نشانہ بن جاتی ہے اور دینی حلقوں کی بدنامی ہوتی ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل اس پر غور کرتی ہے یا نہیں، یہ ''رموز مملکت خویش خسرواں دانند'' کے دائرہ کی بات ہے۔ البتہ محترم پروفیسر ساجد میر سے ہم یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ خود پیشرفت کرتے ہوئے مختلف مکاتبِ فکر کے سنجیدہ علماء کرام کا اجلاس طلب کریں اور اس بات کا اہتمام کریں کہ ملک بھر میں اس قانون کے تحت مقدمات کا ڈیٹا جمع کر کے اس کے اعداد و شمار قوم کے سامنے لائیں، اور جید علماء اور سینئر وکلاء کی کمیٹی ان کا جائزہ لے کر یہ رائے دے کہ کیا واقعی اس قانون کا غلط استعمال ہو رہا ہے؟ اگر ہو رہا ہے تو اس کی روک تھام کے لیے مناسب تجاویز اور طریق کار بھی تجویز کرے۔

توہین رسالتؐ پر موت کی سزا کے متفقہ موقف کو چھیڑے بغیر باقی حوالوں سے اس میں کیا تبدیلیاں ضروری ہیں یا ہو سکتی ہیں؟ اگر اسلامی نظریاتی کونسل یا دینی جماعتوں کا کوئی غیر سرکاری فورم اس پر غور و فکر کے لیے تیار ہو تو ہم بھی اس سلسلہ میں کچھ تجاویز پیش کرنا چاہیں گے، بشرطیکہ یہ جائزہ سنجیدگی کے ساتھ علمی اور تحقیقی ماحول میں لیا جائے۔

اسلامی نظریاتی کونسل
اور جہاد سے متعلق عصری سوالات

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ اپریل ۲۰۱۶ء)

گزشتہ ماہ کی انتیس تاریخ کو اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ ایک کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا جس کا عنوان تھا ''اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جہاد کی تعریف، قوت نافذہ اور اس کے بنیادی عناصر''۔ کانفرنس کی دوسری نشست میں کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی کی زیر صدارت کچھ معروضات پیش کرنے کا موقع ملا جن کا خلاصہ نذر قارئین کرنے سے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کی سرگرمیوں کے حوالہ سے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک دستوری ادارہ ہے جس کا بنیادی مقصد حکومت اور پارلیمنٹ کو رائج الوقت اور مجوزہ قوانین کے حوالہ سے شرعی راہنمائی فراہم کرنا ہے۔ چونکہ پارلیمنٹ دستوری طور پر اس بات کی پابند ہے کہ وہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکتی اور اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تمام رائج الوقت قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق بنائے۔ جبکہ پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے قرآن و سنت کے ضروری علوم سے آگاہی کی کوئی شرط دستور میں موجود نہیں ہے اس لیے دستورِ پاکستان میں ایک مستقل ادارہ کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس مقصد کے لیے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' تشکیل دی گئی تاکہ پارلیمنٹ اور حکومت قوانین کے قرآن و سنت کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اس سے راہنمائی حاصل کر سکیں۔

اس کونسل میں مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء کرام کے ساتھ ساتھ ممتاز ماہرین قانون بھی شامل ہوتے ہیں اور اس ادارہ نے اس سلسلہ میں اب تک جو کام کیا ہے اس کے وقیع اور معتبر ہونے کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں نظام اسلام کے نفاذ کے خواہاں کم و بیش تمام حلقے اس امر پر متفق ہیں کہ ملکی قوانین کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے اب تک کی جانے والی سفارشات کو دستور کے مطابق وفاقی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر

کے ان کی روشنی میں قانون سازی کرلی جائے تو پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا تقریباً نوے فیصد کام مکمل ہوجاتا ہے۔ مگر عملی صورتحال یہ ہے کہ کونسل کی بیشتر سفارشات حکومت کے سردخانے میں پڑی ہیں اور انہیں متعلقہ اسمبلیوں میں زیر بحث لانے سے مسلسل گریز کیا جارہا ہے۔ بلکہ سیکولر حلقوں کی طرف سے سرے سے اسلامی نظریاتی کونسل کی افادیت وضرورت کو ہی مشکوک بنانے کی مہم جاری ہے اور اسے منفی تنقید کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔

ان حالات میں کونسل کے موجودہ چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی اس بات کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل متحرک رہے اور مختلف حوالوں سے حکومت کو نفاذ اسلام کے سلسلہ میں اس کی دستوری ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلاتی رہے۔ مولانا شیرانی کی بعض آرا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا یہ جذبہ اور محنت بہرحال قابلِ قدر اور لائقِ تحسین ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کو اس کے دستوری کردار کے دائرہ میں متحرک رکھے ہوئے ہیں۔

آج کل مولانا شیرانی اس امر کے لیے کوشاں ہیں جس پر انہوں نے مذکورہ بالا کانفرنس میں بھی تفصیل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا کہ جہاد اور دہشت گردی کو جس طرح عالمی ماحول میں گڈمڈ کردیا گیا ہے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کی آڑ میں اسلامی تعلیمات اور جہاد کو نشانہ بنایا جارہا ہے، اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور اسلامی تعلیمات کی رو سے جہاد کے اصل مفہوم اور دائرہ کار کے ساتھ ساتھ اس کی اتھارٹی اور قوت نافذہ کو دلائل کے ساتھ واضح کرنا علماء کرام کی ذمہ داری ہے۔ اس عمل میں اسلامی نظریاتی کونسل کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے آئین کے آرٹیکل ۲۳۰ کی ذیلی دفعہ (الف) کا یہ پیرا پیش کیا کہ:

> "مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) اور صوبائی اسمبلیوں سے ایسے ذرائع اور وسائل کی سفارش کرنا جس سے پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصورات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب اور امداد ملے جن کا قرآن پاک اور سنت میں تعین کیا گیا ہے۔"

دستورِ پاکستان میں اسلامی نظریاتی کونسل کے اس کردار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی یہ خواہش اور کوشش رہتی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل مسلسل متحرک رہے اور حکومت اور عوام دونوں کی علمی و عملی راہنمائی کرے۔ اس پس منظر میں جہاد کی تعریف اور دیگر متعلقہ امور کے حوالہ سے مذکورہ بالا

کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کی جس نشست میں مجھے اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی اس میں مولانا مفتی محمد زاہد، ڈاکٹر محسن نقوی، ڈاکٹر خورشید احمد، مولانا شیرانی اور دیگر حضرات نے بھی خطاب کیا۔

راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

- قرآن کریم نے قتال کا لفظ تو ہتھیار کی جنگ کے لیے ہی استعمال کیا ہے مگر جہاد کے لفظ میں عموم ہے۔ قرآن کریم نے جہاد بالنفس کے ساتھ جہاد بالمال کا ذکر کیا ہے جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد باللسان کو بھی اس کے ساتھ شامل کیا ہے۔ بلکہ غزوۂ احزاب کے بعد حضورؐ نے واضح اعلان فرمایا تھا کہ اب قریش ہمارے مقابلہ میں ہتھیار لے کر نہیں آئیں گے بلکہ زبان کی جنگ لڑیں گے اور شعر و خطابت کے میدان میں جوہر دکھائیں گے۔ چنانچہ آپؐ کے ارشاد پر حضرت حسان بن ثابتؓ، حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت ثابت بن قیسؓ جیسے نامور خطباء اور شعراء نے جہاد باللسان کا یہ معرکہ سر کیا۔
- جہاد کا ہدف کیا ہے؟ اس کے بارے میں بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا یہ ارشاد ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ جہاد کا مقصد کسی کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں بلکہ اسلام کی پرامن دعوت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا ہے۔ چنانچہ جہاد اسلام قبول کروانے کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے فروغ میں رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے ہے۔ جبکہ میرا طالب علمانہ خیال یہ ہے کہ مغرب نے اپنے سسٹم اور کلچر کو درپیش خطرہ سے نمٹنے کے لیے پیشگی حملہ کا جو طریق کار اختیار کیا ہے اور جسے "کونڈولیزا رائس کی تھیوری" کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ بھی شاید اسی نوعیت کا ہے۔
- جہاد کا طریق کار اور ہتھیار وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اس لیے جہاد کے بارے میں کتابوں میں موجود راہنمائی سے استفادہ کرتے ہوئے ہر زمانہ میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق جہاد کے ہتھیار اور حکمت عملی اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال "صلوٰۃ الخوف" ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے لیکن آج کے جنگی ماحول میں اس کو عملاً اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آج کے حالات میں جہاد کی سطح، دائرہ، حکمت عملی اور ہتھیاروں کا انتخاب آج کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہی کیا جائے۔

قرآن کریم کی تعلیم لازم کرنے کا مستحسن حکومتی فیصلہ

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۰ جون ۲۰۱۶ء)

پیشہ وارانہ تعلیم و تربیت کے وفاقی وزیر مملکت جناب بلیغ الرحمٰن نے گزشتہ روز اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کو بریفنگ دیتے ہوئے کہا ہے کہ حکومت نے قرآن کریم کی تعلیم لازمی کر دی ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق اس بریفنگ میں وفاقی وزیر نے بتایا کہ پہلی سے پانچویں جماعت تک تمام بچوں کو قرآن کریم ناظرہ پڑھایا جائے گا، جبکہ چھٹی سے بارہویں تک طلبہ کو قرآن کریم کی ترجمہ کے ساتھ تعلیم دی جائے گی جس میں ساتویں سے دسویں تک قرآن کریم میں بیان کیے گئے واقعات پڑھائے جائیں گے۔ اور دسویں سے بارہویں تک مسلمانوں کو دیے گئے احکامات پر مشتمل سورتیں ترجمے کے ساتھ پڑھائی جائیں گی۔

رمضان المبارک کے دوران جناب بلیغ الرحمٰن کی طرف سے دی جانے والی یہ خبر پوری قوم کے لیے بہت بڑی خوشخبری ہے جس پر ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حکومت کو اس فیصلہ پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

قرآن کریم ہماری زندگی، ایمان اور نجات کی بنیاد ہے جس کی تعلیم ایمان کا تقاضہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور و قانون کی ناگزیر ضرورت بھی ہے اور ہمارے بہت سے قومی اور معاشرتی مسائل کا حل اس سے وابستہ ہے۔ یہ کام قیامِ پاکستان کے بعد ہی ہو جانا چاہیے تھا اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے نفاذ کے بعد تو اس میں تاخیر کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ لیکن مختلف اندرونی و بیرونی عوامل کے باعث یہ مبارک کام مسلسل ٹال مٹول کا شکار ہوتا رہا اور اب اس طرف حکومت نے سنجیدہ توجہ کا عندیہ دیا ہے تو ہم سب کو اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تکمیل میں ہر سطح پر مخلصانہ تعاون کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔

ابھی حال ہی میں ظفروال ضلع نارووال کے ہمارے ایک عزیز شاگرد مولانا حافظ احسان اللہ تبلیغی جماعت کے ساتھ بیرون ملک ایک سال لگا کر واپس آئے ہیں، میں نے ان سے سفر کے احوال دریافت کیے تو انہوں نے بتایا کہ ان کا زیادہ وقت سوڈان میں گزرا ہے۔ وہاں کے حالات پوچھتے

ہوئے میں نے سوال کیا کہ وہاں دینی مدارس کا ماحول کیسا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ وہاں ہماری طرز کے دینی مدارس سرے سے موجود ہی نہیں ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ سوڈان کے قومی تعلیمی نظام میں دینی تعلیم سرکاری نصاب کا حصہ ہے اور میٹرک یا انٹرمیڈیٹ تک ریاستی تعلیمی اداروں میں طلبہ کو اتنی ضروری دینی تعلیم سے آراستہ کر دیا جاتا ہے کہ پھر ان کے لیے الگ دینی مدارس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

ہمارے ہاں دینی مدارس کے جداگانہ تعلیمی کردار اور امتیازی ماحول کی شکایت تو ہر حلقہ میں کی جاتی ہے مگر اس بات کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہے یا کوئی توجہ دینا نہیں چاہتا کہ دینی تعلیم قوم کی ایک لازمی ضرورت ہے، اسے اگر ریاستی نظام تعلیم پورا نہیں کرے گا تو قوم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور اختیار کرے گی۔ اور ہمارے ماحول میں دینی مدارس کی موجودگی اور ان کے ساتھ قوم کے ہر طبقہ کے بھرپور تعاون کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ دینی مدارس پاکستانی قوم کی ایک بہت بڑی ضرورت کی تکمیل کا سامان فراہم کیے ہوئے ہیں اور اس کے لیے ہر وقت سرگرم رہتے ہیں۔ جبکہ ریاستی اداروں اور مقتدر حلقوں کی طرف سے اس ضرورت کی تکمیل کا کوئی بندوبست آج تک سامنے نہیں آیا۔

اس کے ساتھ ہماری ایک بدقسمتی اور بھی ہے کہ عالمی لابیوں اور قومی سیکولر حلقوں نے ایک خود ساختہ اور مصنوعی تاثر قائم کر رکھا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو دینی تعلیم مجبوری کی وجہ سے دلاتے ہیں کہ دینی تعلیم کی طرف وہی لوگ آتے ہیں جو سرکاری اور پرائیویٹ عصری تعلیمی اداروں میں تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے ان کے خیال میں دینی تعلیم ضرورت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ حالانکہ یہ تاثر سراسر گمراہ کن اور خلاف واقعہ ہے۔ ملک بھر میں دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کے بارے میں سروے کیا جائے اور پرائیویٹ عصری تعلیمی اداروں میں قرآن کریم کی تعلیم کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو دیکھ لیا جائے تو اس مصنوعی تاثر کی قلعی کھل جائے گی اور واضح ہو جائے گا کہ کھاتے پیتے گھرانوں اور پوش خاندانوں میں بھی دینی تعلیم کے رجحان میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ اور بحمد اللہ تعالیٰ پوری قوم میں یہ احساس دن بدن اجاگر ہو رہا ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کا پڑھنا اور سننا ہمارے لیے ثواب و برکت اور شفاء و مغفرت کے حصول کا باعث ہے، جبکہ اس سے راہنمائی لینا ہماری قومی ضرورت ہے۔

حتیٰ کہ جس فرقہ واریت کی ہر طرف دہائی دی جارہی ہے اس کا سادہ ساحل بھی یہی ہے کہ قرآن کریم کو ترجمہ و مفہوم کے ساتھ قوم کی دست رس میں لایا جائے۔ پرانی بات ہے کہ ایک طویل سفر کے دوران میرے ایک ہم سفر نے مجھ سے بحث چھیڑ دی کہ مولوی صاحبان نے قوم کو خواہ مخواہ فرقہ وارانہ مسائل میں الجھا رکھا ہے، ہر مولوی قرآن کریم کی آیات پڑھتا ہے اور حدیثیں سناتا ہے جس سے ہم مشکل میں پڑ جاتے ہیں کہ کس مولوی کی بات مانیں اور کس کی نہ مانیں۔ ان کا لہجہ تو بہت تلخ تھا مگر میں نے آہستگی سے کہا کہ میرے بھائی یہ سوچیں اس میں قصور کس کا ہے؟ اگر آپ قرآن کریم کا ترجمہ جانتے ہوں اور عربی زبان سے اتنا واقف ہوں کہ حدیث رسولؐ کا مفہوم سمجھ سکیں تو کیا کوئی مولوی صاحب قرآن کریم کی آیات یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سنا کر آپ سے اپنے مطلب کی بات منوا سکے گا؟ ان صاحب نے کہا کہ نہیں پھر تو میں کوئی غلط بات نہیں مانوں گا۔ میں نے کہا کہ پھر زیادہ قصور تو آپ کا ہے کہ کچھ لوگ آپ کی بے خبری اور جہالت کا غلط فائدہ اٹھا لیتے ہیں جبکہ آپ اپنی کمزوری کی طرف توجہ دینے کی بجائے سارا قصور مولویوں کے کھاتے میں ڈال رہے ہیں۔

ہمارے معاشرہ میں فرقہ وارانہ عصبیت و منافرت اور ''امپورٹڈ دانش'' دونوں کو اپنے پاؤں جمانے کا موقع اس لیے مل رہا ہے کہ عام مسلمان کا قرآن و سنت کے ساتھ فہم و شعور کا تعلق نہیں ہے اس لیے دونوں طبقے من مانی تشریحات کا حوصلہ کر لیتے ہیں۔ اگر معاشرہ میں قرآن و سنت کے فہم و شعور کا اجتماعی ماحول پیدا کر دیا جائے اور اس میں ریاستی ادارے اور میڈیا اپنے منفی کردار کو مثبت کردار میں بدل دیں تو ان دونوں بیماریوں سے سوسائٹی کو نجات مل سکتی ہے۔

چنانچہ ہم وفاقی حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے امید رکھتے ہیں کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ عمل کا اہتمام بھی کیا جائے گا جس کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ سکولوں میں قرآن کریم کی مذکورہ تعلیم و تدریس کے لیے مستند اور اہل مدرسین کا انتخاب کیا جائے اور زبانی جمع خرچ سے گریز کرتے ہوئے قوم کے بچوں کو پورے خلوص کے ساتھ قرآن کریم کی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

کیا پاکستان میں نفاذِ اسلام کا کوئی ہوم ورک موجود ہے؟

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۸ نومبر ۲۰۱۶ء)

ملی یکجہتی کونسل پاکستان کے گزشتہ دنوں منصورہ میں منعقد ہونے والے سربراہی اجلاس میں شرکت کے حوالہ سے اپنے تاثرات ایک کالم میں ذکر کر چکا ہوں، اس کے بعد کونسل کے سیکرٹری جنرل جناب لیاقت بلوچ کی طرف سے مکتوب موصول ہوا کہ سربراہی اجلاس میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر قانون سازی کے امکانات اور طریق کار کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے جس کی مسؤلیت راقم الحروف کے سپرد کی گئی ہے۔ میری متنوع مصروفیات اور جسمانی عوارض کا حال یہ ہے کہ بہت سے کاموں سے جی چاہتے ہوئے بھی معذرت اور گریز کا راستہ اختیار کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہوں مگر نفاذ اسلام اور تحفظ ختم نبوت کے دو محاذ ایسے ہیں کہ کسی خدمت کا موقع ملنے پر اس سے گریز میرے بس میں ہی نہیں رہتا۔ چنانچہ اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے میں نے تھوڑے بہت کام کا آغاز کر دیا ہے۔ ۳ نومبر کو عزیزم حافظ شفقت اللہ کے ہمراہ اسلام آباد میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ہیڈ کوارٹر میں حاضری دے کر کونسل کے سیکرٹری ڈاکٹر حافظ اکرام الحق اور رکن جناب جسٹس (ر) محمد رضا سے تفصیلی مشاورت کی سعادت حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر حافظ اکرام الحق کے ساتھ تو اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے مگر جسٹس موصوف کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی جو خاصی خوشگوار اور حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔

جسٹس (ر) محمد رضا محترم پاکستان کے لاء سیکرٹری رہے ہیں، اب اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن ہیں اور اسلامائزیشن کے اس علمی، فکری اور تحقیقاتی کام میں معاونت کے لیے رضاکارانہ طور پر روزانہ دفتر تشریف لاتے ہیں۔ مضبوط دینی و قومی ذہن رکھتے ہیں اور اسلامائزیشن کی جدوجہد کی مرحلہ وار تاریخ اور اس کام کی نزاکتوں وضروریات سے باخبر ہیں۔ مختلف مسائل پر ان سے گفتگو ہوئی اور اندازہ ہوا کہ کام ترتیب اور سلیقے سے کیا جائے تو اس کارِ خیر کی راہ میں حائل رکاوٹوں اور مشکلات پر بہت حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

اس موقع پر کونسل کے سیکرٹری ڈاکٹر حافظ محمد اکرام الحق یاسین نے کونسل کی شائع کردہ ایک کتاب

مرحمت فرمائی جو ۱۹۶۲ء سے ۲۰۱۳ء تک کونسل کی سرگرمیوں، سفارشات اور قانونی مسودات کا ایک جامع اور معلوماتی اشاریہ ہے اور اسلامائزیشن سے دلچسپی رکھنے والے راہنماؤں، علماء کرام، کارکنوں، وکلاء اور محققین کے لیے گراں قدر تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی ایک زیرِ طبع کتاب کا مسودہ بھی دکھایا جو اسلامی نظریاتی کونسل کی اب تک کی سفارشات کا خلاصہ پیش کرتی ہے اور پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے مسلسل جاری جدوجہد کے مختلف مراحل کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ مسودہ میں پہلے دیکھ چکا تھا اور ڈاکٹر صاحب محترم کی فرمائش پر میں نے اس کا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ اس وقیع علمی، تحقیقی اور فکری جدوجہد پر کونسل کے چیئرمین مولانا محمد خان شیرانی، سیکرٹری ڈاکٹر حافظ اکرام الحق اور دیگر ارکان بالخصوص جسٹس (ر) محمد رضا شکریہ اور تبریک کے مستحق ہیں۔ زیرِ طبع کتاب کے بارے میں پیش لفظ کے طور پر جو گزارشات میں نے پیش کیں وہ درج ذیل ہیں۔

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ کراچی میں ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کے پروگرام کے لیے مجھے بلایا گیا، پروگرام کا موضوع یہ تھا کہ ’’کیا پاکستان میں نفاذِ شریعت کا مطالبہ اور جدوجہد کرنے والے حلقوں نے کوئی ہوم ورک بھی کر رکھا ہے یا یہ محض ایک جذباتی نعرہ ہی ہے؟‘‘ اس پروگرام کے اینکر نے انتہائی تیکھے لہجے میں یہ سوال کیا اور محفل میں شریک ایک بزرگ کی طرف رخ پھیر کر ان سے جواب کے متقاضی ہوئے۔ مجھے اس طریق واردات کا پہلے سے اندازہ تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ جن صاحب سے سوال کا جواب مانگا جا رہا ہے ان کی اس حوالہ سے تیاری نہیں ہے، اس لیے میں نے تھوڑی سی سختی کے ساتھ مداخلت کی اور کہا کہ اس سوال کا جواب میں دوں گا۔ چونکہ پروگرام لائیو تھا اس لیے وہ زیادہ مزاحمت نہ کر سکے اور میرا جواب انہیں سننا پڑا۔

میں نے عرض کیا کہ نفاذِ شریعت کے حوالہ سے پاکستان کے علماء کرام اور دینی حلقوں کا ہوم ورک اور فائل ورک اس قدر مکمل اور جامع ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں نفاذ اسلام کے لیے پیشرفت ہو تو ہمارا یہ ہوم ورک اس کے لیے بنیادی اور اصولی راہنمائی فراہم کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ طالبان کے دور حکومت میں مجھے قندھار جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے ان کے ذمہ دار حضرات کے سامنے تجویز رکھی کہ وہ اس سلسلہ میں پاکستان میں اب تک ہونے والے ہوم ورک سے استفادہ کریں اور اسے سامنے رکھ کر افغانستان کے ماحول اور ضروریات کے دائرے میں اسلامائزیشن کی طرف پیشرفت کریں۔ ٹی وی چینل کے مذکورہ پروگرام میں اس حوالہ سے میں نے تین کاموں کا ذکر کیا:

۱. پرائیویٹ سطح پر مختلف مکاتبِ فکر کے اکابر علماء کرام کی مشترکہ کاوشیں جو ۲۲ دستوری نکات اور اس طرز کی دیگر بہت سی دستاویزات کی صورت میں موجود ہیں اور جن پر تمام مکاتبِ فکر آج بھی متفق ہیں۔

۲. حکومتی سطح پر قیامِ پاکستان کے بعد علامہ محمد اسدؒ کی راہنمائی میں قائم ہونے والے ادارہ اور اس کے بعد تعلیمات اسلامیہ بورڈ، اسلامی مشاورتی کونسل، اور اسلامی نظریاتی کونسل کی مسلسل محنت اور ان کی وقیع رپورٹیں۔

۳. وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بینچ کے متعدّد اہم فیصلے جو نفاذِ شریعت کے لیے اصولی اور عملی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

میری طالب علمانہ رائے میں اگر ان تین دائروں کی علمی کاوشوں کو منظم اور مرتب انداز میں سامنے لایا جائے تو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نفاذ اسلام کے بارے میں اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ ہمارے ہاں جو کمی ہے وہ راہنمائی کی نہیں بلکہ عملی اقدامات کے لیے سنجیدگی کی ہے اور ہمیشہ یہ غیر سنجیدگی ہی شرعی قوانین کے نفاذ میں حائل رہی ہے۔

البتہ ان علمی کاوشوں اور اجتہادی مساعی کے وقیع اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ جہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں فنی زبان و اسلوب کے ساتھ عوامی انداز میں منتقل کر کے منظم اور مرتب صورت میں سامنے لایا جائے، وہاں اس بات کا خلاء بھی میرے جیسے نظریاتی کارکنوں کو محسوس ہوتا ہے کہ ان علمی و اجتہادی مساعی کے واقعاتی پس منظر اور مراحل کو بھی واضح کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ علمی و فکری دنیا میں کسی بھی ارتقاء و تبدیلی اور تشکیلِ نو کے سماجی تناظر اور واقعاتی پس منظر کو سمجھے بغیر اس کی افادیت و اہمیت کا پوری طرح ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ الجھن صرف مذکورہ بالا علمی اداروں کے کام میں نہیں بلکہ ہمارے مفتیان کرام کے ان شخصی فتاویٰ کے بارے میں بھی درپیش ہے کہ ماحول، عرف اور تعامل میں تبدیلی کے باعث کسی مسئلہ میں روایتی موقف سے ہٹ کر کوئی رائے اختیار کی جاتی ہے تو وجہ واضح نہ ہونے کی وجہ سے وہ رائے کنفیوژن کا باعث بن جاتی ہے۔

چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بینچ جیسے اداروں کے علمی اور اجتہادی فیصلوں کے ساتھ ساتھ ان کے واقعاتی پس منظر، سماجی ضرورت اور ضرورت و تعامل کے تقاضوں کو عام فہم انداز میں واضح کرنا بھی ضروری ہے۔ اور میرے خیال میں

تاریخی پس منظر اور واقعاتی ماحول کے مرحلہ وار تذکرہ سے یہ ضرورت کسی حد تک پوری ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ایک بات اور بھی توجہ طلب ہے کہ پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد کے بارے میں سیکولر حلقوں کی طرف سے تسلسل کے ساتھ یہ بات دہرائی جارہی ہے کہ یہ محض ایک سیاسی نعرہ تھا جو تحریکِ پاکستان میں عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے لگایا گیا تھا جبکہ پاکستان کے قائدین کے ذہن میں اس کے لیے کوئی باقاعدہ اور مربوط پروگرام نہیں تھا اور نہ ہی وہ پاکستان میں شرعی احکام و قوانین کے عملی نفاذ کے لیے سنجیدہ تھے۔ سیکولر حلقوں کے اس موقف سے تحریکِ پاکستان کی قیادت کے فکری اور اخلاقی معیار کے بارے میں کیا تاثر قائم ہوتا ہے، وہ اس سے بے پرواہ ہو کر اس بات کو ہر سطح پر اور ہر موقع پر دہراتے چلے جارہے ہیں۔ اس بے بنیاد اور غیر معقول موقف کی حقیقت واضح کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل اور اس کے بعد تحریکِ پاکستان کے قائدین کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کو منظم انداز میں سامنے لایا جائے تاکہ تحریکِ پاکستان کی قیادت پر لگائے جانے والے اس الزام کو صاف کیا جا سکے کہ انہوں نے محض مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے سیاسی طور پر پاکستان میں نفاذ اسلام کا نعرہ لگا دیا تھا۔

اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے سیکرٹری محترم ڈاکٹر حافظ اکرام الحق ہم سب کی طرف سے شکریہ و تبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور زیر نظر کتاب میں مرحلہ وار تاریخی حقائق کو مرتب کر کے اس گرد و غبار کو صاف کر دیا ہے جو نفاذ اسلام کے بارے میں تحریکِ پاکستان کے قائدین کے موقف اور کردار کے حوالہ سے مسلسل اڑایا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازیں اور ان کی اس تحقیقی کاوش کو زیادہ سے زیادہ نافع بنائیں، آمین یارب العالمین۔

اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کا مقصد

(اپریل ۲۰۱۷ء کے دوران الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں نفاذِ شریعت
کے موضوع پر ایک نشست سے گفتگو)

...... جدید قانون دان حضرات اور دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ یہ کہتا ہے کہ یہ اتھارٹی پارلیمنٹ کو دے دی جائے۔ قرآن و سنت اور شریعت کی تعبیر اور کسی چیز کے شرعی ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ پارلیمنٹ کرے۔ پارلیمنٹ کی اکثریت جو فیصلہ کر دے وہ ٹھیک ہے وہی شریعت ہے، اور جدھر اقلیت ہو وہ قانون ختم ہو جائے۔ یہ بہت لمبی اور بہت گہری بحث ہے جو کہ طویل عرصے سے چلی آ رہی ہے اور اس کشمکش اور بحث نے بہت سے خیر کے کاموں کا راستہ روکا ہوا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل، اس سے پہلے اسلامی مشاورتی کونسل، اور اس سے پہلے ادارہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ اس مقصد کے لیے بنا تھا کہ علماء اور جدید قانون دان ماہرین کا ایک مشترکہ فورم ہو گا جو پارلیمنٹ کی رہنمائی کرے گا کہ کون سا قانون شریعت کے مطابق ہے اور کون سا شریعت کے مطابق نہیں۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیعؒ جو ہمارے اکابر اور تحریکِ پاکستان کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے، انہوں نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ تعلیمات اسلامیہ بورڈ کی میٹنگ تھی جس میں جسٹس صاحبان بھی تھے اور ہم بھی تھے۔ یہ کشمکش زیر بحث تھی کہ شریعت کے طے کرنے کی اتھارٹی کون ہے۔ آپ کو تعبیرات کے فرق کا علم ہے کہ اسلامی احکام کی تعبیرات جدید دانشور کیا کر رہے ہیں؟ اور ہماری قدیم اجتماعی اور روایتی تشریح و تعبیر جو چلی آ رہی ہے جس پر ہم قائم ہیں وہ مختلف ہے۔ مفتی صاحبؒ نے لکھا ہے کہ بحث ذرا آگے بڑھی تو میں نے چیئرمین جسٹس صاحب سے کہا کہ دو تین میٹنگوں میں بات سمجھ میں آگئی ہے۔ پاکستان کو جس طرف آپ لے جانا چاہ رہے ہیں میں نہیں جانے دوں گا، اور جس طرف میں لے جانا چاہ رہا ہوں آپ نہیں جانے دیں گے۔ یہ گاڑی یہیں کھڑی رہے گی۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر اب تک وہیں کھڑی ہے، ستر سال ہو گئے ہیں۔

چنانچہ ہمارا ایک بڑا جھگڑا پارلیمنٹ کی خود مختاری کے حوالے سے ہے کہ پارلیمنٹ کو تعبیر اور تشریح کا حق دے دیا جائے۔ اس پر شریعت بل کی تحریک کے دوران ایک اعلیٰ سطحی مذاکرہ وفاقی وزیر قانون

اور وفاقی وزیر مذہبی امور کے ساتھ چل رہا تھا، میں بھی اس میں شریک تھا۔ ہمارا مطالبہ یہ تھا کہ قرآن و سنت کو سپریم لاء یعنی بالادست اور بالاتر قانون قرار دیا جائے، اور ملک میں جو قانون، رسم و رواج، یا ضابطہ قرآن و سنت کے متصادم ہے وہ ختم ہو جائے۔ مذاکرات میں بنیادی نکتہ یہ تھا کہ قرآن و سنت کی بالادستی تو ہم تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن قرآن و سنت کی تعبیر اور تشریح کی اتھارٹی کون ہوگی؟ پارلیمنٹ خود اتھارٹی ہوگی یا اسے کسی اور سے تشریح لینی ہوگی۔ یہ بڑا پرانا جھگڑا ہے جو پاکستان بننے کے بعد سے چلا آ رہا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن و سنت ملک کا سپریم لاء ہے تو یہ فیصلہ کرنا کہ یہ اسلام ہے اور یہ اسلام نہیں ہے، اس میں اتھارٹی کون ہوگی؟

اس جھگڑے کو طے کرنے کے لیے ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی تھی کہ پارلیمنٹ قرآن و سنت کے مطابق قانون سازی کی پابند ہوگی اور اس کی رہنمائی اسلامی نظریاتی کونسل کرے گی۔ یہ کونسل تمام مکاتبِ فکر کے ذمہ دار نمائندہ علماء کرام پر مشتمل ہوگی اور ان کے ساتھ ملک کے ممتاز قانون دان ماہرین ہوں گے۔ کونسل کو مسائل بھیجے جائیں گے اور وہ کسی قانون کے اسلامی ہونے یا نہ ہونے کی سفارش کرے گی، جس کی بنیاد پر پارلیمنٹ قانون سازی کرے گی۔ یہ ایک درمیان کا راستہ نکالا گیا تھا کہ پارلیمنٹ کی قوت تنفیذ بھی متاثر نہ ہو اور قرآن و سنت کے احکام کی تشریح و تعبیر بھی علماء کے ذریعے ہو۔

اس کے بعد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں وفاقی شرعی عدالت قائم کی گئی تو اس کا بنیادی کام بھی یہ ہے کہ وہ کسی قانون کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس میں بھی مختلف مکاتبِ فکر کے علماء اور جج صاحبان مشترک طور پر حصہ ہوتے ہیں، لیکن اس کو کچھ وسیع اختیارات مل گئے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا کام محض سفارش ہے لیکن وفاقی شرعی عدالت کو محدود طور پر فیصلوں کا اختیار بھی دے دیا گیا کہ وہ کسی قانون کو ختم بھی کر سکتی ہے۔

چنانچہ ہمارے ملک کے دستور میں یہ دو ادارے اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت اس کام کے لیے ہیں کہ وہ کسی قانون کے شرعی یا غیر شرعی ہونے کا فیصلہ دیں۔ وہ سفارش کے درجے میں ہو یا فیصلے کے درجے میں، پارلیمنٹ اس کو منظور کرے اور وہ نافذ ہو جائے۔ یہ دو ادارے ہیں بہت سے معاملات میں فیصلہ کر چکے ہیں، البتہ فیصلوں پر عملدرآمد کا مرحلہ بہت مشکل ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے مسلسل کام کر کے اور ملک کے تمام قوانین کا جائزہ لے کر ایک جامع

رپورٹ مرتب کر کے حکومت کو پیش کر رکھی ہے کہ فلاں قانون میں فلاں فلاں شق قرآن و سنت سے متصادم ہے اس کو ختم کر کے یہ شق آنی چاہیے۔ جہاں تک اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور تجاویز کا تعلق ہے اس میں کوئی خلا نہیں ہے۔ کم و بیش ملک میں موجود ہر قانون کے بارے میں ایک واضح رائے موجود ہے، اور متبادل قانون بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس کی بجائے یہ قانون ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ اس کی حیثیت سفارش کی ہے، باوجودیکہ دستور میں لکھا ہوا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل جو سفارشات پیش کرے گی، حکومت انہیں قانون سازی کے لیے متعلقہ اسمبلی میں پیش کرنے کی پابند ہے، وفاقی معاملات میں وفاقی حکومت اور صوبائی معاملات میں صوبائی حکومتیں پابند ہیں کہ وہ کونسل کو سفارشات اسمبلی میں پیش کر کے قانون کی شکل دیں، یہ قانون اور ضابطہ تو موجود ہے لیکن ایسے ہوتا نہیں ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کام تو کر رہی ہے لیکن وہ عمل میں نہیں آ رہا، اور وفاقی شرعی عدالت کو فیصلے کرنے کا اختیار تو ہے وہ فیصلہ کرتی بھی ہے لیکن اس کے فیصلوں پر عملدرآمد میں رکاوٹ یہ ہے کہ وہ سپریم کورٹ میں اپیل ہونے کے بعد ''فریزر'' میں لگ جاتے ہیں۔ کئی فیصلوں کے خلاف وفاقی شرعی عدالت کی رٹ درخواستیں سپریم کورٹ میں موجود ہیں، جب حکومت کی پالیسی طے ہوتی ہے تو وہ ان کو نکالتے ہیں، ورنہ وہی پڑی رہتی ہیں۔......

اسلامی قوانین کے تحفظ پر قومی سیمینار

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۵ مئی ۲۰۱۷ء)

۲۲ مئی کو اسلام آباد کے الفلاح ہال میں ملی یکجہتی کونسل پاکستان کے زیر اہتمام تحفظ قوانین اسلامی کے موضوع پر قومی کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت کونسل کے صدر صاحبزادہ ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر الوری نے کی اور اس سے جناب لیاقت بلوچ، حافظ عاکف سعید، علامہ ساجد نقوی، عبد الوحید شاہ، صاحبزادہ پیر عبد الرحیم نقشبندی، مولانا محمد امین شہیدی، جناب اسد اللہ بھٹو، علامہ عارف حسین واحدی اور دیگر سرکردہ زعماء نے خطاب کیا۔ کانفرنس میں درج ذیل اعلامیہ منظور کیا گیا۔

"وطن عزیز پاکستان کے آئین میں موجود اسلامی شقوں کے خلاف ایک منظم منصوبہ کے تحت کام کیا جا رہا ہے۔ نہایت افسوس کے ساتھ اس کام میں بعض ملکی اداروں اور تنظیموں سے بھی سوئے استفادہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مختلف اسلامی شقوں کو بے اثر کرنے کے لیے اب تک کئی ایک اقدامات کیے جا چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مشال خان کے بہیمانہ قتل کے بعد سے توہین رسالت کے قانون کو تبدیل کرنے اور قراردادِ مقاصد کو پاکستان کے آئین سے نکالنے کے حوالے سے ملکی اداروں اور تنظیموں کے ذریعے کام کیا جا رہا ہے۔ ربوٰکی حرمت پر پاکستان شریعت کورٹ کے واضح فیصلے کے باوجود سپریم کورٹ آف پاکستان نے سٹے آرڈر جاری کیا ہوا ہے۔ اسی طرح مرحوم جناب قاضی حسین احمد کی جانب سے عریانی اور فحاشی کے کلچر کے سدباب کے لیے سپریم کورٹ میں دائر کردہ پٹیشن پر تاحال کوئی ایکشن نہیں لیا جا سکا۔ تعلیمی نصاب سے اسلامی اسباق کو نہایت منظم انداز سے حذف کیا جا رہا ہے۔ اس صورتحال میں نہایت ضروری ہے کہ پاکستان کی اسلامی نظریاتی اساس پر یقین رکھنے والی قوتیں میدان عمل میں اتریں اور آئین پاکستان میں موجود اسلامی قوانین کی حفاظت کی ذمہ داری انجام دیں۔ آج کا اجلاس درج ذیل اعلامیہ کے تحت حکومت

پاکستان اور ذمہ دار اداروں کی توجہ اس جانب مبذول کروانا چاہتا ہے کہ وہ آئین پاکستان کے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کی کوششوں کا نوٹس لیں اور اسلامی قوانین پر آئین پاکستان کی روشنی میں عمل درآمد کروایا جائے۔

۱۔ ملی یکجہتی کونسل پاکستان، جو ملک کی بڑی دینی و مذہبی جماعتوں کا اتحاد ہے، مطالبہ کرتا ہے کہ آئینِ پاکستان میں موجود اسلامی شقوں پر عملدرآمد کو یقینی بنایا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق آئین میں پائے جانے والے سقم کو دور کیا جائے اور ان سفارشات کے نفاذ کے لیے فی الفور اقدام کیا جائے۔

۲۔ آئینِ پاکستان، جو کہ ایک متفقہ دستاویز ہے، میں موجود کسی بھی اسلامی شق کے خلاف کی جانے والی سازش خواہ پارلیمنٹ میں ہو یا میڈیا پر یا کسی اور ادارے میں ہو، ملک کی دینی و مذہبی جماعتیں کسی صورت برداشت نہیں کریں گی۔ حکومتِ پاکستان ان اقدامات کا نوٹس لے اور متفقہ آئینِ پاکستان کو اس کی حقیقی روح کے مطابق نافذ کرے۔

۳۔ حرمتِ دین و مذہب اور حرمتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے اور اس سلسلے میں کسی اندرونی یا بیرونی سازش کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ یہ اجلاس قانون توہین رسالت کے خلاف ایوان بالا یا ایوانِ زیریں میں پیش کی جانے والی کسی بھی قرارداد کی شدید الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔

۴۔ یہ اجلاس توہین رسالت کی آڑ میں کسی فرد یا گروہ کی جانب سے از خود اقدام کی بھی مذمت کرتا ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مقدمات، جن میں اس قانون کے تحت ملزم سزا کے مستحق پائے ہیں، پر فوری عملدرآمد کیا جائے تاکہ آئندہ کسی بھی شخص کو اس قبیح فعل کی جرأت نہ ہو سکے اور نہ ہی کوئی عام شخص قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے۔

۵. توہینِ رسالت کے اقدام پر جن مجرموں کو عدالتیں فیصلے سنا چکی ہیں ان پر فوری عمل کیا جائے اور گستاخ بلاگرز، جو بیرون ملک فرار ہو چکے ہیں، کو انٹرپول کے ذریعے گرفتار کر کے ملکی قانون کے مطابق ان پر مقدمہ چلایا جائے۔

۶. حکومتِ وقت ربوٰ کی حرمت کے حوالے سے فیڈرل شریعت کورٹ اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلٹ بینچ کے فیصلے پر عملدرآمد کو یقینی بنائے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ربوٰ اور سود اللہ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کے مترادف ہے۔ حکومت پاکستان اور اس کے مقتدر ادارے اسلامی و نظریاتی ریاست میں اس جنگ کے فریق نہ بنیں اور سود کی لعنت سے وطن عزیز کو پاک کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

۷. ملک میں پروان چڑھتی فحاشی اور عریانی، جو معاشروں کے لیے زہرِ قاتل ہوتی ہے، کے سدباب کے لیے فی الفور اقدام کیا جائے۔ پیمرا، جو ہر چھوٹی بڑی بات پر میڈیا چینلز کو نوٹس جاری کرتا ہے، اس اہم مسئلہ کا نوٹس لے اور فحاشی و عریانی کے رواج پاتے کلچر کو لگام ڈالے۔

۸. یہ اجلاس میڈیا یا چینلز سے بھی گزارش کرتا ہے کہ وہ معاشرے کی روایات، اسلامی تعلیمات کا پاس رکھتے ہوئے اپنی نشریات میں ایسی چیزوں سے اجتناب برتیں جو ہماری نسل کی بے راہ روی کا باعث بن سکتی ہیں۔

۹. حکومت کے ذمہ دار ادارے سوشل میڈیا کے ذریعے رواج پانے والی معاشرتی بے راہ روی اور توہین کے واقعات کا بھی نوٹس لیں۔ ایسی سائٹس، بلاگز اور سوشل میڈیا چینلز کو لگام ڈالی جائے جو ہماری نوجوان نسل کی تباہی میں ملوث ہیں اور اس کے پیچھے موجود عناصر کی سرکوبی کی جائے۔

۱۰. یہ اجلاس ملک کے میڈیا چینلز سے گزارش کرتا ہے کہ وہ رمضان المبارک

کی نشریات میں ماہِ مقدس کی حرمت اور دینِ مبین کی تعلیمات کا پاس رکھتے ہوئے ایسے پروگراموں سے اجتناب برتیں جن میں رمضان المبارک کی روح کے خلاف مواد نشر کیا جاتا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ میڈیا چینلز کے ذمہ داران رمضان المبارک کی حقیقی فیوض و برکات سے فیض یاب کرنے کے لیے اس ماہ کی حقیقی روح کے مطابق پروگرام نشر فرمائیں گے۔"

اس موقع پر راقم الحروف نے اپنی گزارشات میں درج ذیل نکات پر زور دیا۔

اسلامی قوانین کے تحفظ کے مختلف دائرے اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔

- عالمی ماحول میں اسلامی قوانین و احکام آج کے بین الاقوامی نظام کے حوالہ سے اعتراضات کی زد میں ہیں اور ہمہ جہت فکری و تہذیبی یلغار جاری ہے۔
- پاکستان کی اسلامی شناخت اور دستورِ پاکستان کی اسلامی دفعات کو ختم کرنے کے لیے نہ صرف پروپیگنڈہ بلکہ بھرپور لابنگ کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر مہم جاری ہے۔
- ہم پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے حوالہ سے پیش قدمی کی بجائے دفاع کی پوزیشن پر کھڑے ہیں اور وہ بھی صحیح طور پر نہیں ہو پا رہا۔
- جو قوانین اس وقت نافذ ہیں ان پر عملدرآمد کی صورتحال انتہائی مخدوش ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے انہیں غیر مؤثر بنایا جا رہا ہے۔
- اسلامی احکام و قوانین اور اقدار و روایات کے بارے میں میڈیا اور تعلیم کے تمام ذرائع کو استعمال کر کے نئی نسل کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں۔
- ریاستی ادارے دستور کے اسلامی تقاضوں کا تحفظ کرنے کی بجائے سیکولر عناصر اور بین الاقوامی منفی مہم کو مسلسل سپورٹ کر رہے ہیں۔
- دینی حلقوں، بالخصوص علماء، خطباء اور تعلیمی اداروں میں اسلامی قوانین کے نفاذ کی معروضی صورتحال سے بے خبری بلکہ لاتعلقی کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔

ان حالات میں جہاں عوامی سطح پر بیداری کی تحریک ضروری ہے وہاں تہذیبی، علمی اور فکری کشمکش کا صحیح طور پر ادراک کر کے قوم کی مؤثر راہنمائی کرنا ضروری ہے اور اس کے لیے تمام دینی و سیاسی

جماعتوں کو کردار ادا کرنا چاہیے۔

مسئلہ رؤیت ہلال پر دو تجاویز

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۵ جون ۲۰۱۷ء)

رمضان المبارک نصف سے زیادہ گزر گیا ہے اور عید الفطر کی آمد آمد ہے۔ عید کے موقع پر رؤیت ہلال کا مسئلہ پھر حسب سابق زیر بحث آئے گا اور میڈیا حسب عادت اس سلسلہ میں اختلاف کی من مانی تشہیر کرے گا۔ اس حوالہ سے ہم اپنا موقف مختلف مواقع پر اس کالم میں تحریر کر چکے ہیں کہ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی ایک باقاعدہ ریاستی ادارہ ہے، اسے مجاز اتھارٹی کے طور پر پاکستان میں سب جگہ تسلیم کیا جانا چاہیے اور اگر اس کے کسی فیصلے سے اختلاف ہو تو اسے اختلاف کے درجہ میں رکھتے ہوئے صحیح طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے مگر کوئی متوازی فیصلہ کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ لیکن یہ ایک رائے ہے جسے قبول کرنا یا نہ کرنا متعلقہ دوستوں کی صوابدید پر موقوف ہے۔ البتہ آج کے کالم میں ہم دو محترم دوستوں کی رائے شامل کرنا چاہتے ہیں، ہو سکتا ہے اس اختلاف و تنازعہ کو بہتر طور پر حل کرنے میں ان سے کوئی راہنمائی مل جائے۔

مولانا مفتی منیر احمد اخون ہمارے فاضل دوست ہیں، استاذ العلماء حضرت مولانا نیاز محمد ختنیؒ آف بہاولنگر کے فرزند اور شہید اسلام حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کے داماد و خلیفہ ہیں۔ کافی عرصہ سے نیویارک میں مقیم ہیں اور ایک علمی مرکز قائم کر کے فتویٰ اور اصلاح و ارشاد کے میدان میں مسلمانوں کی راہنمائی کر رہے ہیں۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی رؤیت پر اعتماد کر کے پوری دنیا کے مسلمانوں کو اس کے مطابق ایک ہی دن روزہ کا آغاز کرنا چاہیے اور ایک ہی دن عید منانی چاہیے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں کتاب بھی لکھی ہے جس کی گزشتہ دنوں اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں تقریب رونمائی منعقد ہو چکی ہے۔ انہوں نے برصغیر پاک و ہند کے دو بڑے مذہبی مکاتب فکر دیو بندی اور بریلوی کے اکابر علماء کرام کے فتاویٰ کو اس تجویز کی بنیاد بنایا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا یہ ارشاد انہوں نے ''الکوکب الدری'' سے نقل کیا ہے کہ

> ''اگر کلکتہ (ہندوستان) میں چاند جمعہ کی رات میں نظر آیا اور مکہ میں خمیس (جمعرات) کی رات کو، اور کلکتہ والوں کو پتہ نہ چل سکا کہ مکہ میں رمضان خمیس

(جمعرات) سے شروع ہو چکا ہے تو جب ان کو اس بات کا پتہ چلے گا تو ان کے لیے ضروری ہوگا کہ عید مکہ والوں کے ساتھ منائیں اور پہلا روزہ قضا کریں"۔

حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کا فتویٰ "فتاویٰ رضویہ" سے انہوں نے اس طرح نقل کیا ہے کہ

"عمرو کا قول کہ ہندوستان سے دور دراز ملک مکہ معظمہ میں ۲۹ کا چاند ہو گیا ہے تو پھر بہرائچ والوں کو ان کے ساتھ روزہ نہ رکھنے کی بنا پر ایک روزے کی قضا کرنا لازم ہے صحیح ہے، ہمارے ائمہ کرام کا مذہب صحیح معتمد یہی ہے"۔

جبکہ "فتاویٰ رحیمیہ" کے حوالہ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فتویٰ ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے کہ

"اگر مکہ یا مدینہ میں شرعی ثبوت کے ساتھ خبر آجائے کہ وہاں یہاں سے پہلے چاند ہوا ہے تو ہندوستان والوں پر اس خبر کی وجہ سے ایک روزہ رکھنا فرض ہوگا"۔

مولانا مفتی منیر احمد اخون آج کل اس کی باقاعدہ مہم چلا رہے ہیں کہ ان فتاویٰ کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے اور ان کی بنیاد پر سب جگہ ایک ہی دن روزے اور عید کے اہتمام کی کوشش کی جائے۔

جبکہ دوسری تجویز اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق سیکرٹری جناب محمد سمیع اللہ کی طرف سے ایک اخباری مکتوب کی صورت میں سامنے آئی ہے جس میں انہوں نے پاکستان میں رؤیت ہلال کے نظام کو بہتر بنانے اور مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے طریق کار کو مزید مؤثر کرنے کے لیے تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کی تجاویز انہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ ویسے ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں وفاقی شرعی عدالت کو باضابطہ طور پر کردار ادا کرنا چاہیے یا کم از کم اسلامی نظریاتی کونسل کو موجودہ صورتحال اور مذکورہ تجاویز کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لے کر کوئی مؤثر حل سامنے لانا چاہیے۔ جناب محمد سمیع اللہ اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

"راقم نے ۱۹۹۰ء میں، جب وہ اسلامی نظریاتی کونسل کا سیکرٹری تھا، کونسل کے باقاعدہ ایجنڈے میں یہ بات شامل کروائی کہ عیدین کے مبارک موقع پر بدمزگی اور انتشار سے بچنے کے لیے مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کا اجلاس باقاعدگی سے صرف پشاور میں ہوا کرے تاکہ عید کے چاند کے بارے میں قرب و جوار سے موصول شدہ شہادتوں کا شرعی جائزہ لے کر حتمی

اعلان کیا جا سکے۔ مزید برآں اس ضمن میں عجلت کا مظاہرہ نہ کیا جائے اور حتمی اعلان سے پہلے بلوچستان کے دور دراز علاقوں مثلاً پسنی، جیوانی، تربت، پنج گور اور مارہ وغیرہ سے بھی اطلاعات کی موصولی کا فوری انتظام کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے پاکستان کے جملہ اضلاع کے ڈپٹی کمشنر صاحبان کو پابند کیا جائے کہ جونہی اپنے علاقوں سے انہیں چاند کے بارے میں کوئی معتبر شہادت موصول ہو تو وہ وہاں کی مرکزی جامع مسجد کے امام/خطیب صاحب سے تصدیق کروا کر فوری طور پر مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی پشاور کو مطلع کریں تاکہ وہ مزید چھان بین کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے تمام ڈی سی صاحبان کے نام اور فون نمبر مشتہر کیے جائیں تاکہ عوام کو ان سے رابطہ کرنے میں آسانی ہو۔

راقم کی اس تجویز پر کونسل کے اراکین بالخصوص علمائے کرام نے اتفاق نہیں کیا اور عذر پیش کیا کہ انہوں نے عید کی نماز کی امامت کروانی ہوتی ہے اور علاقہ کی سرکردہ سرکاری شخصیات نے ان کے پیچھے نماز ادا کرتی ہیں۔ پشاور جیسے علاقہ سے راتوں رات انہیں اپنے شہروں میں پہنچنا محال ہے۔ اس لیے یہ تجویز ناقابلِ عمل ہے۔ میرے خیال میں اگر حکومت اور علمائے کرام تھوڑی سی قربانی دیں اور اخلاص سے کام لیں تو اس پر عمل درآمد بہت آسان ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ پاک فضائیہ ایک ہوائی جہاز (C-۱۳۰) پشاور کے ہوائی اڈہ پر تیار رہے اور جونہی چاند کے بارے میں سرکاری طور پر حتمی اعلان ہو تو وہ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے اراکین کو لے کر ایک ہی فلائٹ کے ذریعے ان کی اپنی منزل مقصود کراچی، کوئٹہ، لاہور یا اسلام آباد پہنچا دے۔

جامع مسجد قاسم علی خان پشاور کے خطیب مفتی شہاب الدین پوپلزئی صاحب کو خصوصی طور پر اس بارے میں اعتماد میں لیا جائے تو منزل بفضل تعالیٰ اور بھی آسان ہو جائے گی کہ مسئلے میں اختلاف ہی وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے قومی یکجہتی اور عقلمندی کا تقاضا ہے کہ حکمت عملی کے ساتھ جائے اختلاف کو جائے اتفاق بنایا جائے۔ مزید برآں چیئرمین رؤیت ہلال کمیٹی کی تقرری کی مدت متعیّن کی جائے جو پانچ سال سے زائد نہ ہو۔ مناسب ہوگا کہ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے لیے چیئرمین کا بھی انتخاب کیا جائے اور اس کے لیے ملک کے نامور علمائے کرام میں سے کسی کو منتخب کیا جائے۔ مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی میں علمائے کرام

کے ساتھ فن سے متعلقہ ماہرین کو بھی شامل کیا جائے تاکہ وہ ان شہادتوں کا تکنیکی طور پر بھی جائزہ لے سکیں۔

میں آپ کے موقر اخبار / جریدے کے ذریعے ارباب اقتدار اور دردِ دل رکھنے والے علمائے کرام سے ایک بار پھر اپیل کروں گا کہ امت کی فلاح اور یکجہتی کے لیے میری بیان کردہ تجویز کے مندرجہ ذیل تین اہم نکات پر ضرور غور فرمائیں۔

۱. مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کا اجلاس مستقل طور پر صرف پشاور ہی میں ہوا کرے جس کے لیے وزارت مذہبی امور ضروری اقدامات کرے تاکہ ملک میں انتشار پیدا نہ ہو۔

۲. چاند نہ نظر آنے کا اعلان سرکاری میڈیا سے گیارہ بجے شب سے پہلے نہ کیا جائے۔

۳. عوام کو اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ ترغیب دی جائے کہ وہ بھی چاند کی جستجو میں رہیں اور جس کسی کو چاند نظر آئے وہ فوری طور پر اس کی اطلاع اپنے ضلع کے متعلقہ حکام یعنی ڈی سی کو دیں۔

یہاں یہ بھی امر باعث رہنمائی ہو گا کہ عرب ٹی وی کے مطابق رمضان کا چاند دیکھنے کے لیے سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں عدالتی کونسل کا اجلاس ہوا جس میں کونسل کے ممبران کو چاند نظر آنے کی کوئی شہادت موصول نہیں ہوئی جس کے بعد عرب ممالک میں پہلا روزہ بروز ہفتہ مورخہ ۲۷ مئی ۲۰۱۷ء کو ہونے کا اعلان ہوا۔ چونکہ پاکستان میں ابھی شرعی عدالتی نظام قائم نہیں ہے اس لیے اطلاعات یعنی شہادتوں کی ترسیل کا کام وقتی طور پر تمام اضلاع کے ڈپٹی کمشنر صاحبان سے لیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ان کے ٹول فری نمبروں کو مشتہر کیا جائے تاکہ آئندہ رمضان اور عیدین ایک ہی دن کامیابی و کامرانی سے منائے جا سکیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔"

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ڈاکٹر قبلہ ایاز کے نام مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

محترمی ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب، چیئرمین و جملہ اراکین اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی؟

اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ نو اور اس میں اپنی نئی ذمہ داریوں پر آپ سب دوست ہدیۂ تبریک قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو اس حوالہ سے دین و ملت اور ملک و قوم کی مؤثر خدمت کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

اس کے ساتھ ہی آپ دوستوں کی اطلاع کے لیے گزارش ہے کہ ملی یکجہتی کونسل پاکستان نے ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء کو اسلام آباد میں صاحبزادہ ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر صاحب کی زیر صدارت منعقدہ اجلاس میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عملدرآمد کا جائزہ لینے اور اس سلسلہ میں متعلقہ حلقوں کو توجہ دلانے کے لیے اپنے پہلے سے قائم کردہ کمیشن میں توسیع کی ہے۔ کمیشن کی مسئولیت راقم الحروف کے سپرد ہے جبکہ اس میں محترم حافظ محمد عاکف سعید صاحب، علامہ ابتسام الٰہی ظہیر صاحب، حافظ ساجد انور صاحب اور علامہ عارف حسین واحدی صاحب کو شریک کار بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ حضرات سے کونسل کے مصروفِ کار ہوجانے کے بعد رابطہ قائم کرنے کا ارادہ ہے تاکہ باہمی مشاورت کے ساتھ کمیشن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے طریق کار طے کیا جا سکے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اطلاعاً عرض ہے۔

شکریہ، والسلام

ابوعمار زاہد الراشدی

سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل

۱۳ نومبر ۲۰۱۷ء

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات اور سرکاری طرز عمل

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد ۔ ۲۵ فروری ۲۰۱۸ء)

ملی یکجہتی کونسل پاکستان ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی کو قابو میں لانے اور قومی مسائل پر تمام مکاتبِ فکر کے متفقہ موقف اور کردار کے اہتمام کے لیے قائم ہوئی تھی اور اس میں مولانا شاہ احمد نورانیؒ اور قاضی حسین احمدؒ کے ساتھ ساتھ مختلف اوقات میں مولانا سمیع الحق، مولانا فضل الرحمٰن، پروفیسر ساجد میر، مولانا ضیاء القاسمیؒ، علامہ ساجد نقوی اور دیگر زعما کا متحرک کردار کونسل کی تاریخ کا حصہ ہے۔ اب یہ فورم اپنے دورِ ثانی میں صاحبزادہ ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر اور جناب لیاقت بلوچ کی قیادت میں سرگرمِ عمل ہے اور ان کے ساتھ مختلف دینی حلقوں کے سرکردہ حضرات شریک کار ہیں۔

گزشتہ سال ملی یکجہتی کونسل نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عملدرآمد کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جس کی مسئولیت راقم الحروف کو سونپی گئی اور جناب حافظ عاکف سعید، علامہ ابتسام الٰہی ظہیر اور علامہ عارف حسین واحدی اس کا حصہ ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل دستورِ پاکستان کے تحت قائم ایک ریاستی ادارہ ہے جو شریعت اسلامیہ اور عصری قانون کے ممتاز ماہرین پر مشتمل ہوتا ہے اور اس میں تمام مکاتبِ فکر کی نمائندگی کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس ادارے کی دستوری ذمہ داری یہ ہے کہ ملک میں مروجہ قوانین کا جائزہ لے کر اسلامی نقطۂ نظر سے ان میں ترامیم اور اصلاح تجویز کرے۔ اور اگر اس سے کوئی ریاستی ادارہ کسی مسئلہ یا قانون کے بارے میں شرعی رائے طلب کرے تو وہ باہمی مشاورت کے ساتھ یہ راہنمائی فراہم کرے۔

دستور کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قوانین میں ترامیم و اصلاح کے لیے قانون سازی کا اہتمام حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔ جبکہ عملی صورتحال یہ ہے کہ مروجہ قوانین کے بارے میں مکمل رپورٹ کے ساتھ ساتھ نئے پیش آمدہ مسائل کے حوالہ سے بیسیوں سفارشات اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے گزشتہ چار

عشروں کے دوران مختلف وفاقی حکومتوں کو بھجوائی جا چکی ہیں مگر انہیں متعلقہ ایوانوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کا کوئی معاملہ اس دوران سامنے نہیں آیا۔ حالانکہ دستوری طور پر حکومت اس بات کی پابند ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے کوئی سفارش موصول ہونے پر چھ ماہ کے اندر اسے متعلقہ اسمبلی میں پیش کرے اور پھر ایوان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دو سال کے اندر قانون سازی کا مرحلہ مکمل کرے۔ اس کے ساتھ یہ مسئلہ بھی در پیش رہا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات ایک عرصہ تک صیغۂ راز میں رہی ہیں اور ان کی اشاعت پر پابندی کی وجہ سے عوام تو کجا علمی و دینی حلقوں کو بھی ان تک رسائی میسر نہیں تھی۔ البتہ اب چند سالوں سے یہ پابندی ڈھیلی پڑی ہے تو ان سفارشات کا کچھ نہ کچھ علم لوگوں کو ہونے لگا ہے۔

دوسری طرف قومی سیاست میں نفاذِ شریعت کا پروگرام رکھنے والے کم و بیش سبھی طبقے ایک عرصہ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو دستور کے مطابق متعلقہ اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کی جائے اور اس طرح ان سفارشات پر تمام مذہبی مکاتبِ فکر کی قیادتوں کا اتفاق بھی موجود ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم چند دوستوں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عملدرآمد کی صورتحال کا جائزہ لیا جائے اور اس کے لیے کوئی عملی طریق کار تجویز کیا جائے تو ہم نے اس کے لیے سب سے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کے سیکرٹریٹ سے رابطہ ضروری سمجھا تاکہ ان سفارشات اور رپورٹوں تک رسائی ہو اور ہم یہ جائزہ لے سکیں کہ اس کام کو کیسے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس دوران اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیلِ نو ہوئی، جو دستوری طور پر ہر تین سال کے بعد ہوتی ہے، اور ملک کے معروف دانشور پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز کی سربراہی میں اگلے تین سال کے لیے نئے ارکان نے کونسل کی ذمہ داری سنبھالی تو ہم نے ان سے رابطہ کیا اور طے پایا کہ وہ ملی یکجہتی کونسل کے ایک سیمینار میں تشریف لائیں گے اور شرکا کو اس سلسلہ میں ضروری بریفنگ دیں گے۔ یہ سیمینار ۲۱ فروری کو اسلام آباد میں جماعتِ اسلامی کے راہنما جناب میاں محمد اسلم کی میزبانی میں منعقد ہوا جس میں مختلف مکاتبِ فکر اور طبقات کے سرکردہ حضرات نے شرکت کی جبکہ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز کے ہمراہ کونسل کے فاضل سیکرٹری ڈاکٹر حافظ اکرم الحق یاسین بھی تشریف لائے اور انہوں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی اب تک کی سرگرمیوں اور سفارشات کے بارے میں شرکائے

سیمینار کو تفصیلی بریفنگ دی۔

ڈاکٹر حافظ اکرام الحق نے اس موقع پر بتایا کہ اسلامی نظریاتی کونسل بلکہ اس سے قبل اس سلسلہ میں سرکاری طور پر قائم کیے جانے والے اداروں، تعلیمات اسلامیہ بورڈ، اسلامی مشاورتی کونسل اور ادارہ تحقیقاتِ اسلامی کے حوالہ سے ایک تفصیلی رپورٹ دو جلدوں میں اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے شائع کی گئی ہے جس میں ان سفارشات کا تعارف کرا دیا گیا ہے جو کونسل نے اب تک حکومتوں کو پیش کی ہیں مگر قانون سازی کے مراحل سے نہیں گزر سکیں۔

سیمینار کی صدارت راقم الحروف نے کی اور اس سے پروفیسر محمد ابراہیم، حافظ عاکف سعید، قاضی محمد ظفر الحق، علامہ عارف حسین واحدی، جناب ثاقب اکبر اور دیگر زعما نے خطاب کیا۔ اس موقع پر ملی یکجہتی کونسل کی طرف سے سیمینار کی رپورٹ میں جن خصوصی نکات کا اظہار کیا گیا وہ درج ذیل ہیں:

- ملک میں نفاذ اسلام کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی کارکردگی قابلِ تحسین ہے اور اسے مجموعی طور پر ملک کے تمام دینی حلقوں کا اعتماد حاصل ہے۔
- کونسل کی سفارشات کو دستور کے مطابق متعلقہ اسمبلیوں میں پیش نہ کرنا افسوسناک ہے اور حکومت کو اس سلسلہ میں اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کرتے ہوئے سفارشات کو قانون سازی کے لیے ایوانوں میں بلا تاخیر پیش کرنا چاہیے۔
- عدالت عظمیٰ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دستور کے احکام اور تقاضوں پر عملدرآمد کی نگرانی کرے مگر اسلامائزیشن کے حوالہ سے عدالت عظمیٰ کا اب تک کا طرز عمل تسلی بخش نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا عدالتِ عظمیٰ سے مطالبہ ہے کہ وہ اس حوالہ سے اپنی دستوری ذمہ داری ادا کرنے کے لیے عملی پیشرفت کرے۔
- ملک کے تمام دینی و علمی حلقوں بالخصوص اسمبلیوں میں دینی جدوجہد کی نمائندگی کرنے والی جماعتوں سے گزارش ہے کہ وہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کے لیے مؤثر کردار ادا کریں۔
- ملی یکجہتی کونسل اس بات کا جائزہ لے رہی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کے مطابق قانون سازی کے معاملہ میں متعلقہ ریاستی اداروں کی بے توجہی اور غفلت کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے عوامی تحریک کا اہتمام کیا جائے اور ان سفارشات کو

قانون سازی کے لیے متعلقہ ایوانوں میں پیش کرنے کے لیے متبادل صورت اختیار کی جائے۔

دینی مدارس اور قربانی کی کھالیں: مولانا محمد فیاض خان سواتی کی تجاویز

(روزنامہ اسلام، لاہور ۔ ۲۷ اگست ۲۰۱۸ء)

عیدالاضحیٰ کے موقع پر دینی مدارس کے لیے قربانی کی کھالوں کا مسئلہ اس سال بھی خاصی گہماگہمی کا میدان بنا رہا اور مختلف مقامات پر گرفتاریوں، مقدمات اور چھاپوں کا سلسلہ رہا۔ جبکہ کھالیں جمع کرنے کی اجازت کے بارے میں انتظامیہ کا رویہ بھی حوصلہ افزا اور آبرومندانہ نہیں تھا۔

عید سے چند روز قبل گوجرانوالہ کے مختلف دینی مدارس کے نمائندوں کا ایک مشاورتی اجلاس اس سلسلہ میں اکبری مسجد میں منعقد ہوا اور اس وقت کی صورتحال کو دیکھتے ہوئے میں نے احباب سے گزارش کی کہ آپ حضرات تو وہی کچھ کریں جس کی ہدایت وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی طرف سے آپ کو دی گئی ہے کیونکہ اسی میں خیر و برکت اور اجتماعی مفاد ہے مگر میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو حالات پیدا کر دیے گئے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ سرکاری دفاتر کے چکر کاٹنے کی بجائے استغنا اور بے نیازی کا اظہار کیا جائے کیونکہ ہماری اصل قوت توکل علی اللہ اور دیندار مسلمانوں کا اعتماد ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ سرکاری افسروں کے دروازوں پر بار بار جانے کا سلسلہ ترک کر کے عوام کی ذہن سازی کی جائے کہ ان حالات میں مناسب یہ ہے کہ وہ کھالیں مدارس تک پہنچانے کی بجائے از خود ان کی فروخت کی صورت نکالیں اور اس کے بعد اگر کسی مدرسہ کو وہ رقم دینا چاہیں تو اسے پہنچا دیں۔

اجلاس میں عمومی فیصلہ یہی ہوا کہ وفاق کی پالیسی کے مطابق درخواستیں دی جائیں اور اگر اجازت مل جائے تو کھالیں جمع کی جائیں۔ چنانچہ درخواستیں دے دی گئیں جنہیں عید سے ایک روز قبل تک دفتر کا وقت ختم ہونے تک التوا میں رکھا گیا اور آخر وقت میں اکثر مدارس کو اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا۔ جامعہ نصرۃ العلوم اور الشریعہ اکادمی سمیت بہت سے مدارس نے تو درخواست ہی نہیں دی لیکن جنہوں نے درخواستیں دیں ان میں سے اکثر کو دفتروں کے چکر لگوانے کے باوجود اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ راقم الحروف نے عیدالاضحیٰ کے اجتماع میں اعلان کیا کہ ہم کھالیں جمع نہیں کریں گے بلکہ

درخواست بھی ہم نے نہیں دی، البتہ جو دوست قربانی کی کھال مدارس کو دینا چاہتے ہیں وہ تھوڑی سی قربانی اور کریں کہ کھال خود فروخت کر کے رقم انہیں پہنچادیں۔ میں نے اس موقع پر یہ بھی عرض کیا کہ کھالیں جمع کرنے کا کوئی خاطر خواہ فائدہ بھی نظر نہیں آرہا اس لیے کہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت کھال کی قیمت کو اس حد تک گرادیا گیا ہے کہ اب کھالیں جمع کرنے کا عمل تکلف ہی دکھائی دیتا ہے۔

یہ سب کچھ کیوں ہے اس کی تفصیل گزشتہ سال اپنے ایک کالم میں بیان کر چکا ہوں جو روزنامہ اسلام میں ۱۹ اگست ۲۰۱۷ء کو شائع ہوا تھا اور اس کا ایک اقتباس اس سال سوشل میڈیا پر دوبارہ جاری کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے۔

''عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کی کھالیں دینی مدارس کا ایک بڑا ذریعہ آمدن ہوتی ہیں مگر گزشتہ چند سالوں سے مختلف علاقوں میں دینی مدارس پر یہ ناجائز قدغن عائد کر دی گئی ہے کہ وہ انتظامیہ کی طرف سے باقاعدہ اجازت نامہ کے بغیر یہ کھالیں وصول نہیں کر سکتے۔ حالانکہ قربانی کی کھال اگر کھال ہی کی شکل میں دی جائے تو وہ قربانی کے باقی گوشت کی طرح ہدیہ ہوتی ہے، قربانی کرنے والے کی ذاتی مرضی ہے کہ وہ جس کو چاہے دے۔ گویا یہ پابندی قربانی کرنے والوں پر عائد کی جارہی ہے کہ وہ قربانی کے جانور کا کوئی حصہ سرکاری افسر کی مرضی کے بغیر کسی کو نہیں دے سکتے۔ یا قربانی کے گوشت یا پائے وغیرہ وصول کرنے والوں کو پابند کیا جارہا ہے کہ وہ کسی گھر سے قربانی کے جانور کا گوشت یا پائے وغیرہ حاصل کرنے سے پہلے ڈپٹی کمشنر صاحب سے اجازت نامہ لیں۔

اسی طرح اب حکومت پنجاب چیریٹی ایکٹ کے نام سے ایک قانون لا رہی ہے کہ کوئی شخص زکوٰۃ بھی سرکاری اجازت کے بغیر کسی کو نہیں دے سکے گا۔ جبکہ زکوٰۃ و صدقات کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وہ ظاہر کر کے بھی دیے جاسکتے ہیں مگر "وان تخفوها وتوتوها الفقراء فهو خير لكم" کہ چھپا کر مستحقین کو دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زکوٰۃ وصدقات کے بارے میں فرمان ہے کہ "لا تعلم شماله ما تنفق يمينه" کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔ امیر المومنین حضرت عثمان بن عفانؓ نے اپنے دور خلافت میں ''اموال ظاہرہ'' اور ''اموال باطنہ'' کا فرق قائم کر کے ''اموال باطنہ'' کی زکوٰۃ ہر شخص کو اپنی مرضی کے

مطابق کہیں بھی خرچ کرنے کا حق دے دیا تھا جو آج تک امت میں اجماعی طور پر چلا آرہا ہے۔ اموال باطنہ سے مراد کسی بھی شخص کی وہ دولت ہے جو سرکل میں نہیں ہے اور وہ اسے اپنے محفوظ اثاثے کے طور پر بچا کر رکھے ہوئے ہے۔ اس حکم کا بنیادی مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی شخص کے ذاتی اور محفوظ اثاثوں میں زکوٰۃ کی وصولی کے نام پر سرکاری افسران کو مداخلت کے حق دینے سے اس کی ''سیکریسی'' مجروح ہوتی ہے جس کا تحفظ اس کے حقوق میں شمار ہوتا ہے۔

پھر نماز کی طرح زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور قرآن کریم نے دونوں کو جابجا اکٹھے ذکر کیا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کو سرکاری اجازت نامے پر موقوف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کل نمازیوں کی فہرست مرتب کرنے کے لیے بھی کوئی محکمہ قائم کر دیا جائے گا اور اس کی ادائیگی کے لیے این او سی کا حصول ضروری قرار دے دیا جائے گا۔ مگر ہمارے افسران کرام کو اس مجوزہ ''چیریٹی ایکٹ'' کی شرعی نزاکتوں اور معاشرتی اثرات سے کوئی غرض نہیں، ان کا مقصد تو دینی مدارس کے ذرائع آمدنی کو کنٹرول کرنا ہے اور دینی مدارس کے خلاف بین الاقوامی اداروں کے حکم کی تعمیل کرنی ہے جس کے لیے وہ ہر وقت تیار ہیں۔''

جبکہ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے مہتمم مولانا محمد فیاض خان سواتی نے اس سلسلہ میں صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے ایک مضمون میں دو تجاویز پیش کی ہیں جن کے ساتھ مکمل اتفاق رکھتے ہوئے اسے اپنے کالم کا حصہ بنا رہا ہوں۔

''گزشتہ سال جامعہ نصرۃ العلوم کی طرف سے قربانی کی کھالوں کے حصول کے لیے دی گئی درخواست بلا وجہ ریجیکٹ کر دی گئی تھی، اس سال ہم نے احباب اور جماعت کے مشورہ سے درخواست ہی نہیں دی اور نہ ہی کھالیں جمع کی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ قربانی ایک عبادت ہے اور اس کی کھال بھی اسی کا حصہ ہوتی ہے، شرعاً اس کھال کو انسان تین طرح سے استعمال کر سکتا ہے۔ (۱) خود استعمال کر لے (۲) کسی کو ہدیہ کر دے (۳) کسی کو صدقہ کر دے۔ جب یہ عبادت ہوئی تو اس میں ڈپٹی کمشنر صاحب

سے اجازت کا کیا تُک بنتا ہے کہ کوئی اپنی ذاتی عبادت کے لیے کسی دوسرے کی اجازت کا محتاج ہو اور اس کی اجازت کے بغیر نہ تو ہدیہ دے سکے اور نہ ہی لے سکے اور نہ ہی صدقہ دے سکے اور نہ ہی لے سکے۔ لہٰذا اس کے سدِباب کے لیے فقیر کے ذہن میں دو تجاویز ہیں، ایک شرعی اور دوسری قانونی۔ اور میں وہ دو تجاویز اپنے بڑوں اور بزرگوں کی خدمتِ اقدس میں نہایت مؤدبانہ طریقہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) اس ناجائز پابندی کی بابت ایک تفصیلی استفتاء مرتب کیا جائے اور اس کا جواب ملکِ عزیز کا کوئی معتمد، نامور اور مستند مفتی لکھے، پھر ملک کے تمام دار الفتاویٰ سے "الجواب صحیح" کی صورت میں اس پر سب مفتیانِ کرام کے دستخط لیے جائیں اور پھر متفقہ طور پر اسے "اسلامی نظریاتی کونسل" میں پیش کر کے اس کی سفارش کے ساتھ قومی اسمبلی اور سینٹ میں قانون پاس کرانے کی کوشش کی جائے۔ اور اس میں یہ بات بطورِ خاص اٹھائی جائے کہ ہمارے ملک کے آئین کے ماتھے کا جھومر قرآن و سنت کی بالا دستی ہے اور عبادات میں ایسی رکاوٹیں کھڑی کرنا قرآن و سنت کی صریح خلاف ورزی ہے جسے ملک سے ختم ہونا چاہیے۔ ہاں کوئی مدرسہ اگر ملک کے آئین و قانون کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے تو اس کے خلاف ضرور قانونی کارروائی ہونی چاہیے، نہ کہ اس ایک کی سزا سب کو یکساں دی جائے، یہ تو نہایت ظلم والی بات ہے۔

(۲) اور قانونی طور پر سپریم کورٹ آف پاکستان کی طرف رجوع کیا جائے کہ جن مدارس پر کوئی کیس نہیں ہے، ان کو سالہا سال سے بلاوجہ بعض اداروں کی طرف سے پابند کرنا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کیا یہ آئینِ پاکستان کے خلاف نہیں کہ پُرامن لوگوں کو بلاوجہ تنگ کیا جا رہا ہے، لہٰذا اس کے سدِباب کے لیے تمام تنظیمات وفاق کو از خود یا ملک کی کسی بڑی مذہبی و سیاسی جماعت پر اعتماد کرتے ہوئے اسمبلی، سینٹ اور عوام الناس ہر تین مقامات میں ملکی آئین اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے پُرامن طریقہ سے مؤثر احتجاج کیا جائے کہ ملکی قانون سب کے لیے یکساں ہونا چاہیے، چاہے وہ کوئی شہری ہو یا ادارہ۔

کیونکہ یہ مسئلہ اب چند مدارس کا نہیں رہا بلکہ ہر سال اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جارہا ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں شرعی اور قانونی ہر دو راستے اختیار کرنا وقت کا ایک اہم ترین تقاضا ہے اور یہ ملک کے ہر شہری کا جمہوری حق بھی ہے، وگرنہ ایک ایک کرکے سب ہی اس طوفان کی لپیٹ میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ اللہ کریم ہی ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔"

ان حالات میں دینی مدارس کے وفاقوں سے گزارش ہے کہ وہ ان تجاویز کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیں اور مدارس کو اس مخمصہ سے نکالنے کے لیے پیش قدمی کا اہتمام کریں، اور اسلامی نظریاتی کونسل سے بطور خاص درخواست ہے کہ وہ اس معاملہ کا نوٹس لے اور اس سلسلہ میں قوم کی صحیح راہنمائی کرے۔

نفاذ اسلام میں دستوری اداروں کے کردار کا جائزہ

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۳مارچ ۲۰۱۹ء)

گزشتہ ماہ کے آخری عشرہ کے دوران بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے شعبہ شریعہ اکادمی کے تحت ایک اہم کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا جس میں پاکستان میں نفاذ اسلام کی جدوجہد اور اقدامات کا مرحلہ وار جائزہ لیا گیا اور کانفرنس کی طرف سے اس سلسلہ میں سفارشات پیش کی گئیں۔ شریعہ اکادمی کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد اور ان کے رفقاء اس وقیع علمی و تحقیقی کاوش پر شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ملک میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ کے حوالہ سے علمی و فکری سطح پر ایک سنجیدہ کام دیکھنے میں آیا، خدا کرے کہ متعلقہ ادارے اس کانفرنس کی سفارشات پر عملدرآمد میں بھی اسی سنجیدگی کا مظاہرہ کریں، آمین یارب العالمین۔ کانفرنس کی طرف سے جاری کردہ رپورٹ اور سفارشات درج ذیل ہیں:

> ”اسلام کی تعلیمات جہاد: عصری مسائل و اشکالات“ کے موضوع پر دو روزہ ورکشاپ کا یہ اختتامی سیشن ہے۔ اس ورکشاپ میں ملک کے نامور اسکالرز، علماء، جامعات کے اساتذہ نے بھرپور تیاری کے ساتھ حصہ لیا۔
>
> شرکاء میں دینی مدارس کے اساتذہ، علماء، یونیورسٹی کے اساتذہ و طلباء، اسلامی یونیورسٹی اور فاطمہ جناح یونیورسٹی کی طالبات اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی نمائندگی تھی۔
>
> افتتاحی اور اختتامی نشست کے علاوہ مجموعی لحاظ سے چار نشستیں تھیں۔
>
> پہلی نشست کا عنوان: تصور جہاد قرآن و سنت کی روشنی میں۔
>
> دوسری نشست کا عنوان: جہاد سے متعلق معاصر فکری رجحانات کا جائزہ۔
>
> تیسری نشست کا عنوان: جہاد سے متعلق دیگر نظریات کا جائزہ۔
>
> چوتھی نشست کا عنوان: اسلام میں سمع وطاعت اور خروج کا تصور۔

مقالہ نگار حضرات نے اپنے موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اور سفارشات بھی پیش کیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱. اس بات پر زور دیا گیا کہ امتِ مسلمہ کی وحدت ہر چیز پر مقدم ہے۔ امت کو فکری انتشار سے بچانے میں ارباب منبر و محراب اور اہل دانش کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔
۲. یہ امتِ مسلمہ "امت وسط" ہے۔ "اعتدال" اس کا بنیادی وصف ہے۔ اس لیے غلو، افراط و تفریط اور شدت پسندی پر مبنی خیالات اور نظریات رکھنے والے عناصر کے مقابلہ میں اسلام کا صحیح موقف واضح کرنا اس وقت کی اشد ضرورت ہے۔
۳. جہاد اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے ثابت شدہ مقدس فریضہ ہے۔
۴. جہاد کے اصل مقاصد کو واضح کرنے کی ضرورت ہے۔
۵. میڈیا میں اسلامی اصطلاحات کو اس کے صحیح تناظر میں استعمال کیا جائے۔ جہاد، شہادت، شہید، غازی وغیرہ۔
۶. جہاد کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو علمی انداز میں واضح کیا جائے۔
۷. جہاد افغانستان اور دیگر جہادی تحریکوں کے نتائج پر غور کیا جائے۔
۸. جہاد کے بارے میں صحیح العقیدہ اور انصاف پسند مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا جائے۔
۹. مغرب میں موجود شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا جائے۔
۱۰. آدابِ جہاد اور فقہ جہاد کے بارے میں تعلیمات عام کی جائیں۔
۱۱. اسلام میں سمع و طاعت کا تصور واضح کیا جائے۔
۱۲. اسلام میں خروج کا صحیح تصور اجاگر کیا جائے۔

شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر اہتمام ہائر ایجوکیشن کمیشن آف پاکستان کے تعاون سے سہ روزہ قومی کانفرنس کا انعقاد ۲۶ تا ۲۸ فروری

۲۰۱۹ء علامہ اقبال آڈیٹوریم فیصل مسجد کیمپس میں ہوا۔ کانفرنس میں اعلیٰ عدلیہ اور دستوری اداروں سے وابستہ افراد کی شرکت ایک نمایاں وصف رہا۔ عزت مآب جسٹس جواد ایس خواجہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان نے افتتاحی تقریب کی صدارت فرمائی، جبکہ عزت مآب جسٹس قاضی فائز عیسیٰ جج سپریم کورٹ آف پاکستان، عزت مآب جسٹس ڈاکٹر فدا محمد خان جج فیڈرل شریعت کورٹ، جناب ڈاکٹر قبلہ ایاز چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، اور جناب علامہ زاہد الراشدی نے مختلف مجالس کی صدارت کر کے فاضلانہ صدارتی خطبے ارشاد فرمائے۔ مقالہ جات، علمی گفتگو اور سوالات و جوابات کی روشنی میں کانفرنس درج ذیل سفارشات پیش کرتی ہے۔

۱. قیامِ پاکستان کے بعد آئینی اور ادارہ جاتی سطح پر قوانین کو اسلامیانے کی قابلِ قدر کاوشیں ہوئی ہیں جنہیں یہ کانفرنس خراج تحسین پیش کرتی ہے اور اس تاثر کی نفی کرتی ہے کہ اس ضمن میں ہمارا دامن خالی ہے۔
۲. کانفرنس میں پارلیمنٹ، اسلامی نظریاتی کونسل، عدلیہ بالخصوص وفاقی شرعی عدالت، بین الاقوامی یونیورسٹی، ادارہ تحقیقات اسلامی اور شریعہ اکیڈمی کی اسلامائزیشن کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی، جس سے ہمیں یہ جائزہ لینے کا موقع ملا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے قانون سازی کے اس عمل میں ہم کیا حاصل کر سکے ہیں اور کیا کچھ کرنا باقی ہے۔
۳. ان اداروں کی کاوشوں کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل ۲۸۸۰ قوانین اور وفاقی شرعی عدالت تقریباً ۱۸۰۰ قوانین کا جائزہ لے چکی ہے، جبکہ شریعہ اکیڈمی طویل دورانیے کے ساٹھ کورسز عدلیہ کے ارکان کے لیے اور اتنے ہی تربیتی کورسز وکلاء کے لیے منعقد کر چکی ہے۔
۴. بلاشبہ پاکستان میں قوانین کو اسلامیانے میں تمام آئینی اداروں کا کردار ہے، بالخصوص عدلیہ اور اسلامی نظریاتی کونسل کا کردار ناقابلِ فراموش ہے،

لیکن ان اداروں میں باہم ہم آہنگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ کانفرنس ان کاوشوں کو باہم مربوط کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور اس مقصد کے لیے ایک رابطہ کمیٹی کے قیام کی سفارش کرتی ہے۔

۵. مقالہ نگار حضرات نے دستوری اداروں، بالخصوص وفاقی شرعی عدالت میں قوانین کے اسلامیانے کے عمل کے طریق کار، منہج اور اسلوب (اپروچز) پر تفصیلی روشنی ڈالی اور اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا اور اس بات پر زور دیا کہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے طریق کار کو مزید بہتر اور موثر بنانے کی ضرورت ہے۔

۶. کانفرنس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ریاست کا آئینی اور دستوری لحاظ سے یہ فرض ہے کہ وہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالے جیسا کہ قراردادِ مقاصد اور دیگر دفعات میں مذکور ہے۔

۷. کانفرنس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اسلامی قوانین محض سزاؤں کا نام نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر سماجی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی تبدیلی کا عنوان ہے۔ اس لیے ان دیگر شعبوں کو بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے تاکہ اسلامی قوانین کا موثر نفاذ ہو سکے۔

۸. ریاست کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ فوری اور سستا انصاف فراہم کرے، جبکہ موجودہ قوانین اور نظام عدل فوری انصاف کی فراہمی میں سست روی کا شکار ہے جس کا اعتراف عدلیہ سے وابستہ افراد بھی کرتے ہیں۔ اس لیے متبادل راستہ اسلامی قوانین کا ہی ہے جن کی مدد سے فوری انصاف کی فراہمی ممکن ہے۔

۹. قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے عمل میں عدلیہ کی توجہ زیادہ تر اس پہلو پر رہی ہے کہ ان قوانین میں کونسے امور اسلامی احکام سے متصادم ہیں، جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ عدالتیں قوانین کی تعبیر و تشریح کا عمل

بھی اسلامی اصولوں کی روشنی میں کریں۔

۱۰۔ کانفرنس نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی کہ قوانین کو اسلامیانے کے عمل میں چند اہم رکاوٹیں رہی ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی معاہدات، قرآن و سنت کی تعلیمات سے عدم آگہی، نظام تعلیم بالخصوص قانون کی تعلیم میں اسلامی تعلیمات کی کمی، انتظامیہ کی عدم استعداد وغیرہ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انتظامیہ اور دیگر اداروں سے وابستہ افراد کی اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر تربیت کی جائے۔

نفاذ اسلام کے دستوری اداروں کو درپیش خطرہ!

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۹ء)

روزنامہ دنیا گوجرانوالہ میں ۲۶ ستمبر ۲۰۱۹ء کو شائع ہونے والی خبر ملاحظہ فرمائیے:

”اسلامی نظریاتی کونسل نے حکومت کی طرف سے اداروں کی تشکیل نو کے حوالہ سے ڈاکٹر عشرت حسین کی سربراہی میں قائم کمیٹی کی طرف سے اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کی حیثیت اور ہیئت تبدیل کرنے کی سفارش پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کو چیف ایگزیکٹو اور بورڈ آف گورنر کے سپرد کرنا ۱۹۷۳ء کے آئین کی خلاف ورزی ہے، اصلاحات کمیٹی کی سفارش کو واپس لیا جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے وزارت سائنس کی طرف سے بھیجے گئے قمری کیلنڈر کا معاملہ وزارت مذہبی امور کے سپرد کرتے ہوئے کہا ہے کہ وزارت مذہبی امور کے ساتھ مل کر وزارت سائنس و ٹیکنالوجی اور رویت ہلال کمیٹی کے اشتراک سے وحدت رمضان و عیدین کو یقینی بنانے میں اپنا کردار ادا کرے۔ کونسل نے کہا کہ پاکستان کے بہتر امیج کو اجاگر کرنے کے لیے مذہبی آزادی کے لیے خصوصی سفیر تعینات کیا جائے۔ حکومت کو تجویز پیش کی گئی ہے کہ ملک بھر کی سیاسی و قومی قیادت کو اعتماد میں لے کر کشمیر پر قومی موقف اور بیانیہ تشکیل دیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز نے دو روزہ اجلاس کے بعد پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا کہ کونسل نے ڈاکٹر عشرت حسین کمیٹی کی رپورٹ کا جائزہ لیا ہے اور اس پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے، کمیٹی نے عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسلامی نظریاتی کونسل کے بارے میں ۱۹۷۳ء کے آئین کی دفعات ۲۲۷ تا ۲۳۱ کو نظر انداز کیا ہے، کونسل کی ہیئت و حیثیت میں کوئی بھی تبدیلی آئین سے انحراف ہو گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت جیسے اداروں کے ذریعے

اسلامی قوانین کے نفاذ کے مقصد کے حصول کے لیے غیر دستوری جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے پرامن اور آئینی طریقوں کی موثر میکنزم پیش کیا گیا ہے، اسی میکنزم سے محرومی پاکستان کے آئندہ معاملات کے لیے تشویشناک صورتحال کا باعث بنے گی۔"

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کی پریس کانفرنس کے مندرجات پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں کہ ایک طرف تو بعض سرکاری ڈھنڈورچی مسلسل یہ راگ الاپ رہے ہیں کہ ملک میں تحفظ ختم نبوت اور اسلامائزیشن کے قوانین کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور بعض لوگ بلاوجہ انتشار پیدا کرنے کے لیے دستور کی اسلامی دفعات اور تحفظ ختم نبوت کے قوانین کو خطرہ کا شور مچا رہے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کا کونسل کے دو روزہ باقاعدہ اجلاس کے بعد یہ کہنا ہے کہ دستورِ پاکستان کے تحت قائم اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت کی ہیئت و حیثیت کو تبدیل کرنے کی سفارشات ایک سرکاری کمیٹی نے طے کر لی ہیں اور ان سفارشات کے حوالہ سے دستورِ پاکستان کی واضح دفعات کو بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

ادھر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ایجنڈا میں یہ بات باقاعدہ طور پر شامل بتائی جا رہی ہے کہ پاکستان کی حکومت سے قادیانیوں کے بارے میں ملک میں رائج قوانین کو تبدیل کرنے کے لیے کہا جائے اور بین الاقوامی رپورٹوں کے مطابق جنرل اسمبلی کی ایک کمیٹی اس تجویز کا جائزہ لے رہی ہے۔ جبکہ ہم نے پاکستان شریعت کونسل کی طرف سے وفاقی وزیر مذہبی امور صاحبزادہ ڈاکٹر نور الحق قادری سے باقاعدہ درخواست کر رکھی ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ایجنڈے میں مبینہ طور پر شامل قادیانی مسئلہ پر حکومت پاکستان کے موقف کی وضاحت اور وکالت کے لیے سرکردہ علماء کرام اور ممتاز قانون دانوں کا باقاعدہ وفد وہاں بھیجا جائے جیسا کہ جنوبی افریقہ کی سپریم کورٹ میں اسی نوعیت کے ایک کیس میں حکومت پاکستان کی طرف سے سرکاری وفد بھیجا گیا تھا، مگر وفاقی وزارت مذہبی امور نے اس درخواست کا نہ کوئی جواب دیا ہے اور نہ ہی اس سلسلہ میں وزارت کے ماحول میں کوئی سرگرمی دکھائی دے رہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عالمی استعماری ممالک اسلام کے نام پر اور اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ کے لیے قائم ہونے والے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان کے نظریاتی تشخص اور تہذیبی امتیاز کو ہی قبول

کرنے سے انکاری ہیں اور پاکستان کی اسلامی حیثیت کے ساتھ ساتھ دستورِ پاکستان کی اسلامی دفعات اور نفاذِ اسلام کے لیے قائم دستوری اداروں کو غیر موثر بنانے کے لیے بین الاقوامی اور قومی سطح پر سازشوں کا ایک وسیع نیٹ ورک مسلسل مصروف کار ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور وفاقی شرعی عدالت چونکہ ملک میں رائج قوانین کی شرعی حیثیت کے تعین اور ان کی اصلاح کا ایک ایسا قابلِ قبول اور قابلِ عمل نظم اور طریقِ کار مہیا کرتی ہیں جو دستوری اور جمہوری تقاضوں کے ساتھ ساتھ اسلامیان پاکستان کے جذبات و احساسات کی بھی ترجمانی کرتا ہے، اس لیے یہ دونوں ادارے عالمی اور ملکی سیکولر حلقوں کی آنکھ میں کھٹک رہے ہیں، مگر چونکہ یہ ادارے جمہوری طریقہ سے سیاسی اور دستوری عمل کے ذریعے وجود میں آئے ہیں اس لیے سیکولر لابیاں اس حوالہ سے رائے عامہ کا براہ راست سامنا کرنے کا حوصلہ اور اخلاقی جرأت نہ پاتے ہوئے درپردہ سازشوں کے ذریعے انہیں غیر موثر بنانے کے لیے عجیب و غریب حرکات کرتی جا رہی ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز نے یہ اچھا کیا ہے کہ کونسل کے اجلاس کے بعد اس کے فیصلوں اور سفارشات کے بارے میں عوام کو اعتماد میں لیتے ہوئے پریس کانفرنس کے ذریعے مذکورہ بالا حقائق کا اظہار کر دیا ہے۔ ہم کونسل کی ان قراردادوں کی حمایت کرتے ہوئے ایک طرف حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ پاکستان کی اسلامی شناخت اور دستورِ پاکستان کے تقاضوں کے خلاف کسی اقدام سے قطعی گریز کرے، اور اس کے ساتھ ملک بھر کی دینی و سیاسی قوتوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ اس صورت حال پر خاموش تماشائی بنے رہنے کی بجائے اس کا نوٹس لیں اور باہمی مشاورت و ہم آہنگی کے ساتھ دستورِ پاکستان کی اسلامی دفعات کے تحفظ بلکہ عملی نفاذ کے لیے موثر کردار ادا کریں۔

پاکستان میں نیب کے قوانین پر اسلامی نظریاتی کونسل کا تبصرہ

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۱ جنوری ۲۰۲۰ء)

......پاکستان میں نیب کے قوانین پر اسلامی نظریاتی کونسل کا تبصرہ بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے نیب کے قوانین میں سے بعض کو اسلامی شریعت کے منافی قرار دیا ہے جو اس کی ذمہ داری اور حق ہے کہ اس کا قیام ہی اس غرض سے کیا گیا ہے کہ وہ ملک میں رائج قوانین کا جائزہ لے کر ان کی شرعی حیثیت کو واضح کرے، اور اگر کوئی بات شریعت کے خلاف سامنے آئے تو اس کی نشاندہی کرے۔ اس پر بحث و مباحثہ کی گنجائش موجود ہے کہ کونسل نے جو سفارشات پیش کی ہیں ان پر علمی اور فقہی طور پر پھر سے غور کر لیا جائے، مگر وفاقی وزیر فواد چودھری کا یہ فوری تبصرہ خلاف توقع نہ ہونے کے باوجود عجیب سا لگا کہ سرے سے اسلامی نظریاتی کونسل کو ہی تشکیل نو کی سان پر چڑھا دیا جائے۔

دراصل ہمارے ہاں اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت، اور سپریم کورٹ کے شریعت ایپلیٹ بینچ جیسے دستوری اداروں کا مصرف ہی یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ وہ حکومتی پالیسیوں اور اقدامات کو اسی طرح سند جواز فراہم کرتے رہیں جس طرح یورپ میں بادشاہت، جاگیرداری اور پاپائیت کی مشترکہ حکمرانی کے دور میں جاگیرداری اور بادشاہت کے اقدامات کو مذہبی پاپائیت کی طرف سے سند جواز فراہم کی جاتی تھی، ورنہ ان اداروں کا وجود ہمارے ان مہربانوں کے نزدیک بیکار ہے۔ مجھے اس پر قرآن کریم کی وہ آیت یاد آگئی ہے کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ لوگوں نے مطالبہ کر دیا تھا کہ "ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ" اس کے بغیر کوئی قرآن لے آئیں یا اس کو ہماری خواہش کے مطابق بدل دیں۔ یہی طرز عمل ہمارے ہاں بھی ہے کہ اول تو شرعی احکام کو بدل دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہیں ہے تو شرعی احکام پیش کرنے والوں کو ہی بدل دیا جائے۔...

آنجہانی رانا بھگوان داس کی یاد میں تقریب

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۴فروری ۲۰۲۰ء)

آئی پی ایس (انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد) کی طرف سے سابق چیف جسٹس آف پاکستان آنجہانی رانا بھگوان داس کی یاد میں منعقد ہونے والی تقریب میں شرکت کی دعوت ملی تو موجودہ حالات کے تناظر میں یہ بات مجھے اچھی لگی کہ ہم ان شخصیات کو یاد رکھیں جنہوں نے اصول، قانون اور انسانی روایات کو زندہ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ یہ تقریب ۱۱فروری کو منعقد ہوئی جس کے مہمان خصوصی سابق چیف جسٹس پاکستان جسٹس (ر) افتخار محمد چودھری تھے۔ جبکہ دیگر مہمانان خصوصی میں محترم راجہ محمد ظفرالحق، جناب محمد اکرم شیخ ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر رامیش کمار (ایم این اے) کے ساتھ راقم الحروف کا نام بھی شامل تھا۔

موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش میں مجھے ایسی مجالس کی تلاش رہتی ہے جن میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے سنجیدہ ارباب فکر مل بیٹھ کر انسانی اقدار و روایات کے فروغ اور مذہب کے معاشرتی کردار کے حوالہ سے گفتگو کریں۔ کیونکہ میری طالب علمانہ رائے میں اس وقت نسل انسانی کا سب سے بڑا مسئلہ اور بحران انسانی اخلاقیات اور اقدار کا ہے جن سے انسانی سوسائٹی مسلسل محروم ہوتی جا رہی ہے۔ جبکہ انسانی اخلاق و روایات کے سب سے بڑے علمبردار مذاہب ہیں جو تمام تر باہمی اختلافات اور تنازعات کے باوجود انسان کو اس کی بنیادی اقدار سے وابستہ رکھنے میں سب سے مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ انسانی اخلاقیات و روایات اور سوسائٹی کے معاملات میں مذہب کے کردار کو کمزور کرتے چلے جانا اس وقت تمام مذاہب کے سنجیدہ راہنماؤں کے لیے مشترکہ چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں اس سلسلہ میں امریکہ، برطانیہ اور پاکستان سمیت دیگر ممالک میں مختلف مذاہب کے متعدّد راہنماؤں سے بات چیت کر چکا ہوں اور اس مکالمہ کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی خواہش رکھتا ہوں بلکہ کوشش بھی کرتا رہتا ہوں۔

اس سیمینار کے بارے میں آئی پی سی کی طرف سے جاری کردہ رپورٹ کو اس کالم کا حصہ بناتے ہوئے میں اپنی گفتگو کے بعض حصے بھی ریکارڈ میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ اپنے محسنین کو یاد

رکھنا ان کا حق ہونے کے ساتھ ساتھ جناب سرور کائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مبارکہ بھی ہے کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ کو اپنے ایک پرانے محسن مطعم بن عدی یاد آ گئے جو مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر طائف میں پتھراؤ کرنے والے اوباش لڑکوں سے آپؐ کو پناہ دی تھی۔ اللہ تعالیٰ کے آخری رسول ان لڑکوں کے پتھراؤ اور تعاقب کے باعث زخمی اور لہولہان حالت میں اپنے خادم حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ کی طرف واپس آ رہے تھے کہ راستہ میں مطعم بن عدی نے اپنے ڈیرے کا دروازہ کھول دیا اور آپؐ وہاں کچھ دیر ٹھہرے، خون وغیرہ دھویا اور آرام کیا۔ نبی اکرمؐ نے غزوہ بدر کے موقع پر اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان قیدیوں کی سفارش کرتے تو میں انہیں فدیہ لیے بغیر ہی آزاد کر دیتا۔ اس میں جناب رسول اکرمؐ کی طرف سے یہ تعلیم ہے کہ محسن خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اس کی احسان مندی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ میں جب اس سیمینار میں شرکت کے لیے حاضر ہوا تو مہمانوں میں جناب سبھاش چندر کو دیکھا جو آنجہانی رانا بھگوان داس کے برادر نسبتی ہیں اور مجھ سے پہلے انہوں نے شرکاء سے گفتگو کی، انہیں دیکھ کر مجھے تحریک آزادی کے نامور راہنما سبھاش چندر بوس یاد آ گئے اور میں اسٹیج پر بیٹھا کچھ دیر تک ماضی کے مناظر میں کھویا رہا۔

ان گزارشات کے ساتھ اس سیمینار کے بارے میں آئی پی سی کی رپورٹ پیش خدمت ہے:

> ”اسلام آباد، 12 فروری: پاکستان کی تعمیر و ترقی اور اس کے قومی اداروں کو استحکام دینے اور مضبوط بنانے میں جسٹس رانا بھگوان داس جیسے ملک کے کئی غیر مسلم فرزندوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نہ صرف ان غیر مسلم ماہرین کی خدمات کو سراہا جائے بلکہ ملک کے نوجوانوں کی نظریاتی سوچ کی تعمیر کے لیے ان میں یہ آگہی بھی پیدا کی جائے کہ کس طرح ان ماہرین نے اقلیت میں سے ہونے کے باوجود ملک کی قانونی، عدالتی، آئینی اور سماجی تعمیر و ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یہ اسلام آباد میں جسٹس رانا بھگوان داس کے یاد میں ہونے والی ایک تقریب کا خلاصہ تھا جس کا اہتمام اسلامی نظریاتی کونسل اور انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے مشترکہ تعاون سے کیا گیا تھا۔ اس تقریب سے خطاب کرنے والوں میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس افتخار محمد

چوہدری، ایڈووکیٹ اکرم شیخ، اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز، انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ایگزیکٹیو پریزیڈنٹ خالد رحمٰن، قومی اسمبلی کے رکن ڈاکٹر رمیش کمار وانکوانی، مولانا ابوعمار زاہدالراشدی، اسلام آباد ہندو پنچائیت کے صدر مہیش کمار، اور جسٹس رانا بھگوان داس کے برادرِ نسبتی سبھاش چندر شامل تھے، جبکہ سینیٹر راجہ ظفرالحق کا خصوصی پیغام بھی انسٹیٹیوٹ کے سینئیر تحقیق کار سید ندیم فرحت نے اس موقع پر پڑھ کر سنایا۔ مقررین کا کہنا تھا کہ جسٹس بھگوان داس ایک محبِ وطن شہری تھے جو قانون کی بالادستی پر یقین رکھتے تھے اور اپنے تمام فیصلے بھی قوانین کی روشنی میں ہی کرتے تھے۔ انہوں نے اسلامیات میں ماسٹرز کی ڈگری بھی حاصل کر رکھی تھی اور اسی بنا پر انہیں اسلامی فکر اور قانون پر عبور حاصل تھا۔ وہ ایک انتہائی اصول پسند انسان تھے اور انہوں نے اپنے کردار، رویئے، غیر جانبداری، متوازن سوچ کی بنا پر اتنی عزّت اور اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم جسٹس بھگوان داس اور ان کی طرح اقلیت سے تعلق رکھنے والے ملک کے دیگر فرزندوں مثلاً جسٹس اے آر کانیلیس اور جسٹس دراب پٹیل وغیرہ کی خدمات کو یاد رکھیں اور ان سے رہنمائی حاصل کریں کہ کیسے انہوں نے اپنی محنت اومستقل مزاجی سے یہ مرتبہ حاصل کیا۔ مقررین کا یہ بھی کہنا تھا کہ دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں اقلیتوں کو مختلف قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اچھی بات یہ ہے کہ یہاں ملکی سطح پر غیر امتیازی پالیسیاں مرتب کی جاتی ہیں۔ اگرچہ کسی بھی ملک کی طرح یہاں بھی کچھ انتہا پسند طبقات موجود ہیں، لیکن حال میں ہی ہونے والے مختلف واقعات اور قانونی فیصلوں کی روشنی میں عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے نظام اور معاشرے میں بھی اقلیتوں کو ان کا حق دینے کی گنجائش نظر آتی ہے۔ مقررین نے اس موقع پر انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور اسلامی نظریاتی کونسل کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ قومی ہیرو اور فرزندوں، اور انکی قومی خدمات کو یاد کرنے والی ایسی کوششوں کو جاری رہنا چاہیے۔“

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل ڈاکٹر قبلہ ایاز کے نام مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مزاج گرامی!

مجھے یہ معلوم کر کے اطمینان ہوا ہے کہ اسلام آباد میں ہندو مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں اسلامی نظریاتی کونسل سے سرکاری طور پر مشورہ طلب کر لیا گیا ہے۔ میری شروع سے رائے ہے کہ اس نازک اور حساس مسئلہ پر وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل جیسے دستوری اداروں کو ہی باقاعدہ رائے دینی چاہیے۔ امید ہے کہ کونسل اسی سلسلہ میں تمام ضروری پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے ملک کے ممتاز اصحاب علم و دانش کو اعتماد میں لے کر کوئی ایسی متوازن رائے قائم کرے گی جو موجودہ مسئلہ کے مناسب حل کے ساتھ ساتھ مستقبل میں بھی اس قسم کے امور میں راہنمائی کا ذریعہ بن سکے۔

اس موقع پر ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ چونکہ اس معاملہ میں بین الاقوامی معاہدات بھی زیر بحث آئیں گے، اس لیے اسلامی نظریاتی کونسل کو مروجہ بین الاقوامی معاہدات کے حوالہ سے کوئی اصولی موقف پیش کر دینا چاہیے کیونکہ بین الاقوامیت کے مسلسل فروغ کے ساتھ ساتھ ہمارے قومی، دینی، تعلیمی اور تہذیبی معاملات میں بین الاقوامی معاہدات کی اثراندازی بتدریج بڑھتی جا رہی ہے، چنانچہ ہمیں اب اس معاملے میں قومی سطح پر کوئی اصولی موقف اور حکمت عملی طے کرنا ہی ہوگی۔ امید ہے کہ اس گزارش پر غور و خوض کے ساتھ اس اہم اور حساس قومی مسئلہ پر حکومت اور قوم کی راہنمائی کی کوئی مناسب صورت اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے سامنے آجائے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

والسلام، ابو عمار زاہد الراشدی

سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل، خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ

۱۱ جولائی ۲۰۲۰ء

اسلامی نظریاتی کونسل اور جمعہ کے خطبات

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جون ۲۰۲۱ء)

مشہور محاورہ ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے، چنانچہ مسجد و مدرسہ کے حوالہ سے سرکاری یا نیم سرکاری حلقوں کی طرف سے کوئی بات بھی سامنے آتی ہے تو دینی راہنماؤں اور کارکنوں کے کان اسی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں جیسے شکاری کو دیکھ کر ہرن کان کھڑے کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتا ہے۔ مسجد و مدرسہ کو ہر حال میں کنٹرول کرنے کے عالمی استعماری ایجنڈے کے سائے میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا کوئی بھی ادارہ کسی بھی حوالہ سے کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اسے اسی نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے شکار اپنے شکاری کو دیکھتا ہے اور یہ کوئی غیر فطری بات نہیں، اس لیے کہ اس بے اعتمادی بلکہ بداعتمادی کی یہ فضا خود ریاستی اداروں کے مسلسل اقدامات کے نتیجے میں قائم ہوئی ہے جو اس قدر شدید اور گہری ہے کہ اسے اعتماد کے ماحول میں واپس لانے کیلئے خاصا وقت اور محنت درکار ہوگی۔

اصل میں یہ ایجنڈا عالمی سیکولر قوتوں کا ہے کہ مغربی تہذیب و ثقافت کے عالمی غلبے کی راہ میں مسجد و مدرسہ ناقابلِ عبور رکاوٹ کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہیں، کیونکہ انسانی سوسائٹی کو مذہب، مذہبی اقدار اور خدا و آخرت کے جس تصور سے بے گانہ کر دینا مغربی تہذیب و ثقافت کی بنیاد ہے، مسجد و مدرسہ میں ان مذہبی اقدار و روایات کی نہ صرف تعلیم دی جاتی ہے بلکہ اس کا ماحول تشکیل دیا جاتا ہے اور اس ماحول کو ہر سطح پر قائم و موجود رکھنے کی محنت بھی کی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ خدا، رسول، قرآن، سنت، آخرت، جنت، دوزخ اور دیگر آسمانی تعلیمات کی جن باتوں کی مدرسہ تعلیم دیتا ہے اور مسجد میں چوبیس گھنٹے ان کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے وہ مغربی تہذیب و ثقافت کے دائرہ میں کسی صورت میں بھی قابلِ قبول نہیں ہیں، اور ان باتوں اور اس ماحول کا انسانی سوسائٹی میں مسلسل موجود رہنا مغربی فلسفہ و نظام کے لیے مستقل چیلنج بلکہ دردِ سر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ مسلم دنیا بالخصوص پاکستان میں ان باتوں پر عوام کا ایمان، عقیدہ و یقین سے بڑھ کر عقیدت اور بے لچک کمٹمنٹ کا درجہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ جس میں مختلف حربوں اور سازشوں کے باوجود کسی طرح کی کمی نہیں آ رہی۔

چنانچہ بڑا سبب مسجد، مدرسہ اور مولوی ہے اور اسباب کی دنیا میں ان کا یہ تجزیہ غلط بھی نہیں ہے۔ اس لیے ان تینوں کو تحقیر، استہزا اور کردارکشی کا نشانہ بنائے رکھنے کے ساتھ ساتھ دباؤ، کنٹرول اور جبر کا ہر حربہ ان کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے، اور طے کر لیا گیا ہے کہ انہیں کسی طرح بھی موجودہ پوزیشن میں مسلم سوسائٹی میں کوئی کام آزادانہ طور پر کرتے رہنے کی پوزیشن میں نہ رہنے دیا جائے۔ دینی حلقوں اور سیکولر لابیوں کے درمیان موجودہ کشمکش کا بنیادی دائرہ یہی ہے جس میں مسلم ممالک کے مقتدر حلقے اپنے عوام کا ساتھ دینے کی بجائے ان کے خلاف استعماری حربوں میں سیکولر لابیوں کے سہولت کار بنے ہوئے ہیں جو مسلم دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اس پس منظر میں اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نئے اوقاف کے نفاذ کا مسئلہ ابھی چل رہا ہے کہ مساجد میں اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے خطباء کو جمعہ کے خطبات فراہم کرنے کا اعلان سامنے آگیا، جسے ظاہر ہے کہ اسی تناظر میں دیکھا جانا تھا۔ چنانچہ اس پر سخت ردعمل کا سامنا فطری بات ہے جس پر متعلقہ حلقوں کو چیں بہ جبیں ہونے کی بجائے اس کے اسباب کا جائزہ لینا چاہئے۔

اسلامی نظریاتی کونسل ہمارا قابلِ قدر دستوری ادارہ ہے جس کی علمی خدمات ملکی قوانین کو اسلامی احکام میں ڈھالنے کے حوالہ سے بہت وقیع اور لائق تحسین ہیں جن کا ہم بھی وقتاً فوقتاً ذکر کرتے رہتے ہیں اور ملکی قوانین کو دستوری تقاضے کے مطابق قرآن و سنت کے مطابق بنانے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کو متعلقہ اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کے مطابق قانون سازی کا مطالبہ ہمارے مستقل مطالبات میں شامل ہے۔

اسی طرح کونسل کے موجودہ چیئرمین محترم جناب ڈاکٹر قبلہ ایاز ہمارے محترم فاضل دوست ہیں اور ان کی یہ وضاحت ہمارے لیے اطمینان بخش ہے کہ مساجد کے خطباء کو کونسل کی طرف سے جمعہ کے خطبات کی فراہمی راہنمائی اور سفارش کے درجہ میں ہے، یہ کوئی سرکاری آرڈر نہیں ہے جس کی تعمیل بہرحال ضروری ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہم اسلامی نظریاتی کونسل سے یہ عرض کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تجویز اور اس پر دینی حلقوں کے ردعمل کو مسجد و مدرسہ اور مولوی کے بارے میں عمومی پالیسیوں اور ماحول سے الگ کر کے نہ دیکھیں اور اس امر کا اہتمام بطور حکمت عملی ضروری سمجھیں کہ ان کی کوئی تجویز یا سفارش مسجد، مدرسہ اور مولوی کے خلاف عالمی سازش اور ایجنڈے کے لیے سہولت کاری نہ سمجھی جائے، ورنہ ریاستی اداروں کے ہاں تو یہ معزز و محترم فورم صرف نمائشی ادارہ شمار

ہوتا ہی ہے، عوامی اور دینی حلقوں میں بھی وہ اپنے اس اعتماد کو شاید قائم نہ رکھ سکے جو اس وقت حاصل ہے، خدا کرے کہ ایسا نہ ہو، آمین یارب العالمین۔

سری لنکا کے ہائی کمشنر سے علماء کرام کی ملاقات

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۱۱ دسمبر ۲۰۲۱ء)

سات دسمبر منگل کا دن اسلام آباد میں خاصا مصروف گزرا، اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف سے سیالکوٹ کے سانحہ کے حوالہ سے سرکردہ علماء کرام کی باہمی مشاورت اور سری لنکا کے ہائی کمیشن میں تعزیت اور اظہار یکجہتی کے لیے حاضری کے پروگرام میں شرکت کا پیغام ملا تو اطمینان ہوا کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس قسم کے اہم مسائل پر کردار ادا کرنے کا عزم کیا ہے۔ دونوں پروگراموں میں حاضری ہوئی اور اس موقع پر دیگر بعض سرکردہ حضرات کی طرح میں نے بھی اس اقدام کا خیر مقدم کرتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ کونسل اس قسم کے اہم قومی و ملی معاملات میں اس نوعیت کے کردار کا تسلسل قائم رکھے گی۔ اس سلسلہ میں کونسل کی طرف سے جاری کردہ رپورٹ درج ذیل ہے:

''سیالکوٹ کے دلخراش وافسوسناک واقعہ پر پاکستان بھر کے جید علماء کرام واسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر قبلہ ایاز، شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی کی سربراہی میں سری لنکن سفیر سے ملاقات واظہار افسوس اور تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام، مفتیان، عظام ومشائخ کی پریس کانفرنس:

شرکاء پریس کانفرنس: (۱) ڈاکٹر قبلہ ایاز، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل (۲) مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان (۳) مولانا انوار الحق حقانی، نائب صدر وفاق المدارس العربیہ (۴) مولانا زاہد الراشدی، سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل (۵) قاری محمد حنیف جالندھری، ناظمِ اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ (۶) مولانا عبد الخبیر آزاد، چیئرمین رویت ہلال کمیٹی (۷) مولانا عبد الخیر زبیر (۸) مولانا پیر نقیب الرحمٰن (۹) پیر علی رضا بخاری (۱۰) علامہ حامد سعید کاظمی (۱۱) صاحبزادہ حسان حسیب الرحمٰن (۱۲) حافظ طاہر محمود اشرفی (۱۳) مولانا مفتی عبد الرحیم، جامعۃ الرشید کراچی (۱۴) ڈاکٹر حبیب الرحمٰن (۱۵) مولانا محمد طیب طاہری (۱۶) علامہ امین شہیدی (

۱۷)علامہ عارف واحدی (۱۸) سینٹر پروفیسر ساجد میر (۱۹) مولانا یوسف کشمیری (۲۰) پیر حبیب الحق (۲۱) پیر حبیب عرفانی (۲۲) پیر خالد سلطان اور دیگر سرکردہ حضرات۔

مشترکہ اعلامیہ:

ہم آج سری لنکن سفارت خانے میں ۳دسمبر کے اندوہناک واقعہ پر اظہارِ تعزیت اور اظہارِ یکجہتی کرنے آئے ہیں۔ سیالکوٹ کا حالیہ سانحہ ایک المیہ ہے جس کی وجہ سے پاکستان سمیت دنیا بھر میں غم و غصہ پھیل گیا ہے۔ ہجوم کی صورت میں بے رحمانہ انداز میں ایک انسان کو مارا پیٹا گیا اور بالآخر موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش جلائی گئی۔ ماورائے عدالت قتل کا یہ ایک بھیانک واقعہ ہے، بغیر ثبوت کے توہین مذہب کا الزام لگانا غیر شرعی حرکت ہے۔ یہ پوری صورتحال قرآن و سنت، آئینِ اسلامی جمہوریہ پاکستان اور ملک میں رائج جرم و سزا کے قوانین کے سراسر خلاف ہے، اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین سمیت پاکستان بھر کے مستند علماء نے بھرپور طریقے سے اس کی مذمت کی ہے۔

عاقبت نااندیش عناصر کا یہ اقدام ملک و قوم، اسلام اور مسلمانوں کی سبکی کا باعث بنا ہے۔ علاوہ ازیں "پیغامِ پاکستان" کی قومی دستاویز جس میں ایسے ہر قسم کے مسلح اقدام کی نفی کی گئی، یہ اقدام اس سے سراسر انحراف ہے۔ "پیغامِ پاکستان" کو پاکستان کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء کرام اور مدارس بورڈز کی تائید حاصل ہے۔ ان شرپسند افراد کے خلاف رائج ملکی قوانین کے مطابق سخت سے سخت قانونی اقدامات کئے جائیں۔ اس تکلیف دہ واقعہ میں امید کی ایک کرن یہ تھی کہ ایک نوجوان ملک عدنان نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس قتل ہونے والے بے گناہ شخص کو بچانے کی بھرپور کوشش کی، اس نوجوان کا یہ اقدام قابلِ تحسین بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔ وزیرِاعظم پاکستان نے اس نوجوان کی حوصلہ افزائی کے لیے "تمغۂ شجاعت" دینے کا اعلان کر کے ایک بہت مستحسن اقدام کیا ہے۔

آج کا نمائندہ اجتماع قرار دیتا ہے کہ اسلام میں تشدد اور انتہا پسندی کی کوئی جگہ نہیں

ہے، لہٰذا علماء کرام اعتدال پسندی کو فروغ دیں، انتہا پسندی کو روکنے کے لیے معاشرے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں تاکہ ملک پاکستان امن اور آشتی کا گہوارہ بن جائے۔"

اس دوران معلوم ہوا کہ امارت اسلامی افغانستان کے بعض سرکردہ وزراء اسلام آباد آئے ہوئے ہیں اور مختلف امور پر پاکستانی حکام کے ساتھ بات چیت کر رہے ہیں۔ کابل پر طالبان کے کنٹرول کے بعد میری بھی خواہش تھی کہ امارت اسلامی افغانستان کے کچھ ذمہ دار حضرات سے ملاقات ہو تو ان سے افغانستان کی صورتحال کے بارے میں براہ راست معلومات حاصل کی جائیں۔ رابطہ کیا تو مولانا عبدالباقی حقانی وزیر برائے خصوصی تعلیم، ڈاکٹر قلندر عباد وزیر صحت اور مولوی لطف اللہ خیر خواہ نائب وزیر خصوصی تعلیم کے ساتھ ملاقات کی ترتیب طے پا گئی اور ان ملاقاتوں میں پاکستان شریعت کونسل کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا عبد الرؤف محمدی، راولپنڈی کے سیکرٹری جنرل مفتی محمد سعد سعدی مولانا ارسلان سیال اور دیگر احباب بھی میرے ساتھ شریک تھے۔

افغانستان کا دورہ کر کے وہاں عمومی صحت کی صورتحال اور میڈیکل ضروریات کا جائزہ لینے والے ڈاکٹر صاحبان کے گروپ میں سے ڈاکٹر مشتاق احمد آف پشاور اور دیگر ڈاکٹر صاحبان کے ساتھ بھی تفصیلی گفتگو کا موقع ملا اور افغان قوم اس وقت جس سنگین بحران سے دوچار ہے اس کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کی رپورٹ بارہ دسمبر اتوار کو لاہور میں مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے مشترکہ اجلاس میں پیش کروں گا جو جمعیۃ علماء اسلام پاکستان (س) کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی کی دعوت پر ہو رہا ہے۔ اور اس مشاورت کے بعد افغانستان کی مجموعی صورتحال، افغان عوام کی موجودہ معاشی جکڑبندی، آنے والے دور کے خدشات و خطرات اور اس میں بحیثیت مسلمان اور پاکستانی ہمیں کیا کرنا چاہیے اور ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ گذارشات قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا ارادہ ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سر دست صرف یہ عرض ہے کہ افغان عوام اس وقت شعب ابی طالب کے ماحول میں ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں مغربی ایجنڈے کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں خاموش اور لاتعلق رہنے کی بجائے ہم سب کو اپنے اپنے کردار کا تعین کرنا ہوگا ورنہ یہ ہمارے لیے ملی اور قومی دونوں حوالوں سے سنگین جرم ہوگا۔

”مدرز ملک بینک“ اور رشتوں کا شرعی دائرہ

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ—جولائی ۲۰۲۴ء)

سوال: کراچی میں ماؤں کے دودھ کا بینک قائم ہوا ہے جس کے افتتاح کی خبر اور فوٹو شائع ہوئی ہے۔ اسلامی حوالے سے یہ کیسا اقدام ہے؟ (۱۵ جون ۲۰۲۴ء)

جواب: قرآن کریم نے "وامہاتکم اللتی ارضعنکم واخواتکم من الرضاعۃ" (النساء ۲۳) کے تحت دودھ پلانے والی ماں اور ماں کے دودھ میں شریک بہن کے ساتھ نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر میاں بیوی کو ایک خاتون کا دودھ پینے کی وجہ سے بھائی بہن قرار دے کر نکاح ختم کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ کہ دودھ بینک میں عورتیں اپنا دودھ جمع کرائیں گی اور وہ نومولود بچوں کو پلایا جائے گا، رشتوں کے شرعی نظام کو سبوتاژ کرنے کی کاروائی ہے، اس طرح یہ پتہ نہیں چلے گا کہ دودھ پینے کے باعث کون کس کا بیٹا ہے اور کون کس کی بہن ہے۔ دینی حلقوں اور علمی مراکز کو اس کا فوری نوٹس لینا چاہیے اور بالخصوص وفاقی شرعی عدالت اور اسلامی نظریاتی کونسل کو اس کے سدباب کے لیے مؤثر قدم اٹھانا چاہیے۔

مادۂ تولید کی خرید وفروخت کا مسئلہ

(۲۰ جولائی ۲۰۲۴ء کو مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں ہفتہ وار درس)

...... جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری صورتیں حرام قرار دے دیں سوائے زندگی بھر کے نکاح کے۔ قرآن پاک نے مختلف صورتیں بیان کر کے فرمایا "الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین"۔ باقاعدہ زندگی بھر کی بیوی، یا اس زمانے میں لونڈی ہوتی تھی، اب لونڈیاں دنیا میں کہیں بھی نہیں ہیں، ان کے سوا تمام صورتیں حرام ہیں۔ قرآن پاک نے واضح طور پہ بیان کیا "فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک هم العادون" کہ اس کے سوا ہر صورت حرام ہے۔

یہ اس لیے عرض کیا ہے کہ ابھی چند دن ہوئے دوستوں نے توجہ دلائی ہے کہ پاکستان میں بھی سپرم بینک (sperm bank) قائم ہو گیا ہے یعنی مرد کے مادۂ تولید کا بینک۔ جہاں جس کو گفٹ کرنا ہو کرے، جس کو ضرورت ہو لے جائے۔ جس نے بیچنا ہو بیچ دے، جس نے خریدنا ہو خرید لے۔ باقاعدہ این جی اوز ہیں جو ان کو چلا رہی ہیں۔ جس نے اپنا نطفہ بیچنا ہے بیچ دے اور پیسے کمائے، اور جس کو نطفہ کی ضرورت ہو وہ آ کر لے جائے، کوئی پتہ نہیں کس کا نطفہ کس کے ساتھ ہو۔

ایک وجہ اس کی یہ بیان کرتے ہیں کہ بہت سے لوگوں کی اولاد پیدا نہیں ہوتی، ان کو ضرورت ہوتی ہے تو یہ بینک ان کو نطفہ فراہم کر دیتے ہیں جن کی اولاد نہیں ہوتی ان کو اولاد مل جائے گی۔

یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ بے اولاد لوگ جو بیمار ہوتے ہیں اس سسٹم کے ذریعے نطفہ بھی خریدا جا سکتا ہے اور ماں کا رحم بھی کرائے پر لیا جا سکتا ہے۔ کسی عورت کا رحم خراب ہے تو خاوند کا نقطہ کسی دوسری عورت کے رحم میں امانتاً رکھوا کے نو مہینے کے لیے کرائے پہ لے لینا، یہ بھی اس سسٹم کا حصہ ہے۔ یعنی نطفہ بیچا اور خریدا جاتا ہے، اور اسی

طرح عورت کا رحم کرائے پر دیا اور لیا جاتا ہے۔

ایک ضرورت یہ بیان کی جاتی ہے کہ مرد کی مرد سے شادی بھی دنیا میں قانوناً جائز سمجھی جاتی ہے، اور عورت کی عورت سے بھی جائز تصور ہوتی ہے۔ اب دو مردوں نے شادی کر لی ہے بچہ تو چاہیے۔ یہ پتہ نہیں کہ میاں کون ہے اور بیوی کون ہے، لیکن بچہ تو چاہیے، آپس میں تو پیدا نہیں کر سکتے، اس کے لیے کسی عورت کا رحم کرائے پر لے کر پیدا کریں گے۔ اور جب دو عورتوں نے شادی کر لی ہے کہ یہ اب میاں بیوی ہیں اور اس کو دنیا میں جائز سمجھا جاتا ہے، اب ان کو بچے کی ضرورت ہے تو وہ کسی کا نطفہ خریدیں گے، یہ ہے سپرم بینک کا سسٹم۔

قرآن پاک نے حلال حرام، جائز ناجائز کے جتنے فرق بتائے ہیں سب ختم ہو گئے ہیں۔ ایک مختصر جملے میں عرض کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں حلال حرام کا تصور بھی ختم ہوتا جا رہا ہے اور حلالی حرامی کا تصور بھی ختم ہوتا جا رہا ہے۔ حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ ہم بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ حلالی کون ہے اور حرامی کون ہے؟ ہم اس سے بھی بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ ماحول پیدا کیا جا رہا ہے۔ رضامندی کا زنا تو ویسے بھی ان کے ہاں جرم نہیں ہے۔ زنا کے بارے میں مغرب کا تصور یہ ہے مرد اور عورت راضی ہوں تو کسی کیا اعتراض ہے؟ میاں بیوی ہیں یا ماں بیٹا ہیں یا بہن بھائی ہیں، کسی کو کیا اعتراض ہے۔ تصور یہ ہے کہ جب مرد اور عورت بدکاری پہ راضی ہے تو تیسرے بندے کو اعتراض کیا ہے، وہ بھلے سے میاں بیوی ہیں یا نہیں ہیں، وہ بہن بھائی بھی ہو سکتے ہیں، باپ بیٹی بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ماحول اب یہاں ہمارے ہاں بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہمیں اس سے آگاہ رہنا چاہیے۔

میں نے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین جناب ڈاکٹر راغب حسین نعیمی صاحب سے اس سلسلہ میں رابطہ کیا کہ قوم کی رہنمائی کریں اور بتائیں، حلال حرام کا تو بتاتے ہیں، حلالی حرامی کا بھی بتائیں تاکہ لوگوں کو پتہ ہو۔ دین کی ہر بات کو مٹا دینا، دین کی ہر بات کو پامال کرتے چلے جانا، یہ ہمارے عقیدے کے خلاف ہے، ایمان کے خلاف

ہے، آپ کو اس سے اس لیے آگاہ کر رہا ہوں کہ کم از کم آواز تو اٹھائیں، بات تو کریں، اپنے دین کی بنیادیں قائم رکھنے کے لیے جو بھی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو توفیق عطا فرمائے، آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد اللہ رب العالمین۔